# اسلام اپنی نگاہ میں

تصنیف: ولیم چیٹک

ترجمہ

سہیل عمر

حصہ دوئم

# فہرست

## حصہ دوم

# ایمان

### اسلام اور ایمان

حدیثِ جبرئیل میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ ایمان یہ ہے کہ ''تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یومِ آخر پر اور یقین رکھو تقدیر پر اور اس کے خیر و شر پر۔''

بادیَ النظر میں یوں لگتا ہے کہ یہاں ''ایمان'' کی تعریف متعین کی جا رہی ہے۔ لیکن غور کیجیے کہ آپؐ کے قول میں ''ایمان'' کا لفظ دوہرایا گیا ہے۔ کسی چیز کی اگر تعریف متعین کرنا مقصود ہو تو اس لفظ کی تعریف خود اسی لفظ سے نہیں کی جاتی۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ ایمان کی تعریف نہیں کر رہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کے مخاطب جانتے ہیں کہ ایمان کیا ہے۔ انہیں یہ بتانا ہے کہ کس چیز پر ایمان لانا درکار ہے۔ صرف ایمان لانا اور یہیں تک رک جانا کافی نہیں نہ ہی صرف ''اللہ پر ایمان'' لا کر رہ جانا کافی ہے۔ ایمان کے دیگر ارکان بھی ہونا ضروری ہیں اور جب تک مذکورہ بالا تمام ارکان پر انسان کا ایمان نہ ہو اس کا ایمان، ایمانِ اسلامی شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ ایمان ہوگا مگر کسی اور قسم کا ایمان۔

ایمانِ اسلامی کے ارکانِ ایمان پر بات کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ خود لفظ ''ایمان'' کی تعریف مقرر کر لیں بلکہ یوں کہیے کہ عربی کے اصطلاحی لفظ ''ایمان''

کی تعریف متعین کرلی جائے۔ یہ اس لیے بھی ضرورت ہے کہ ’’ایمان‘‘ Faith کے بارے میں انگریزی میں جو تصورات عام طور پر پائے جاتے ہیں وہ ایمانِ اسلامی کے ضمن میں سراسر بے معنی ہو جاتے ہیں۔

انگریزی میں عموماً Faith اور Belief کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ ولفریڈ کینٹول سمتھ نے البتہ اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس لفظ کے عربی معانی سے اگر صرفِ نظر بھی کرلیں تب بھی اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ Faith (ایمان) کے انگریزی لفظ کو Belief (اعتقاد) سے الگ کرکے دیکھا جائے اور ان کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کیا جائے۔[1] انگریزی میں جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے۔ (believes in) تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس شخص کو اعتماد ہے کہ وہ بات درست ہے، سچ ہے لیکن کہنے کا مطلب اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا یہ اعتماد غلط ہے اور وہ تمام قرائن کو نظر انداز کرکے ایک غلط خیال پر قائم ہے۔ اسلامی زبانوں میں جب ’’ایمان‘‘ کا لفظ بولا جائے گا تو اس میں ایسی کوئی منفی بات کبھی نہیں ہوگی۔ یہاں ایمان ایک اعتماد ہے جس میں ایک ایسی صداقت پر اعتماد کیا گیا ہے جو حقیقی ہے، کوئی مفروضہ نہیں ہے۔ یہاں اس بات کا شائبہ تک نہیں کہ اہلِ ایمان کسی باطل چیز پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان جن چیزوں پر ہے، ان کے ارکانِ ایمان، اشیاء کی معروضی حقیقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مزید براں ایمان کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان یہ اعتماد کر لیتا ہے تو پھر اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ اپنے جانے ہوئے حق و صداقت کی بنیاد پر عمل پیرا بھی ہو اور وہی کرے جو اس کا ایمان تقاضا کرتا ہے۔

’’ایمان‘‘ کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ ’’ایمان کیا ہے! معرفتِ

قلب، زبان سے اقرار اور اعضا و جوارح سے عمل۔'' یعنی ایمان میں جاننا، زبان سے کہنا اور عمل میں لانا سب شامل ہے۔

اب جو شخص ایمان رکھتا ہے وہ سب سے پہلے تو دل سے یہ مانتا ہے، جانتا ہے کہ یہ چیز حق ہے۔ دل یا قلب کا لفظ ایسے ہی محلِ استعمال اور سیاق و سباق میں قرآن میں اکثر برتا گیا ہے۔ قرآن کے استعمال کے مطابق یہ لفظ بنیادی طور پر جذبات کی آماجگاہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ ایک ملکہ یا قوت ہے یا ایک ایسا عضو روحانی ہے جو نوعِ انسانی کو دیگر غیر انسانی مخلوقات سے جدا کرتا ہے۔ عام طور پر ہم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''عقل'' Intelligence کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ فلسفے کی زبان میں کہیے تو دل کی مماثلت نطق و گویائی اور ملکۂ فکر سے معلوم ہوتی ہے یعنی Rational مثلاً جب انسان کی تعریف ''حیوانِ ناطق'' کے طور پر کی جاتی ہے۔

قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے حیوانِ ناطق وہ حیوان ہے جو دل رکھتا ہو۔ ایسا انسان جس کا دل اپنا کام نہ کر سکے، اپنے منصب سے گر جائے، وہ انسان نہیں حیوان ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن مجید کا فرمان ہے۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۲۵:۴۴)

یہ تو بس چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

''یہ لوگ تو بس ڈھور ڈنگر کی طرح ہیں بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ حق سے دور ہیں۔'' دل صحت مند ہو تو وہ ماہیتِ اشیاء کو جان لیتا ہے لیکن کتنے ہی دل ہیں جو قرآن کی زبان میں ''بیمار'' ہیں۔ ''زنگ آلود'' ہیں یا ان پر ''تالے پڑے ہوئے

ہیں‘‘۔دل صحت مند ہو تبھی ایمان لاتا ہے اور ہر شے کو اس طرح دیکھتا ہے جیسی کے وہ ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (۷:۱۷۹)

ان کے دل ہیں جن سے یہ سمجھتے نہیں۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ(۲۲:۴۶)

سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۴۷:۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے لگ رہے ہیں۔

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ (۲:۹-۱۰)

یہ لوگ اللہ سے اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس بات کو جانتے نہیں۔ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳:۱۴)

ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے عمل کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (۵۸:۲۲)

یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ (٤٨:٤)

وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دل میں چین اُتارا تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کی افزونی ہو۔

پھر ایمان ''زبان سے اعلان واقرار'' بھی ہے۔انسان کو جو عقل کا ملکہ عطا ہوا ہے وہ نطق و گویائی میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ ملکہ ہے جو صرف انسانوں کو ملا ہے، کم از کم ہماری اس دنیا میں تو اسی طرح ہے۔دل نے حق کی جو شناخت کی ہے اسے ظاہر کرنا لازم ہے اور اس کا پہلا اظہار خالص انسانی انداز میں ہونا چاہیے اور انسان کا خاصہ ہے گویائی۔پس اظہارِ ایمان زبان سے ہوگا، انسان کے ملکۂ گویائی کے وسیلے سے ہوگا۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے، اسلام کی کائنات میں ملکۂ کلام اور قوت گویائی کو جیسی اہمیت حاصل ہے اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہیے کم ہے۔خود اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اپنے قول سے، اپنے کلام سے پیدا کی۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

(١٦:٤٠)

جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارا کہنا یہی ہے کہ اس کو کہیں ''ہو'' تو وہ ہو جاتی ہے۔

انسان کے لیے ہدایت فراہم اس طرح کی کہ انبیاء کے وسیلے سے اس سے کلام فرمایا۔پس سارے آسمانی صحیفے کلامِ خداوندی ہیں۔قرآن مجید مسلمانوں سے اللہ

تعالیٰ کا خطاب ہے اور اس پر اسلام کی ہر شے کی بنیاد ہے۔ دوسری طرف انسان اللہ کی طرف لوٹنے کے لیے اس سے ہم کلام ہونے کو وسیلہ بناتا ہے یعنی دعا و عبادت کا سہارا لیتا ہے۔ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ کلمۂ شہادت اسلام کا پہلا ستون اور مسلمانوں کا بنیادی عمل ہے اور یہ گویائی کا عمل ہے، زبان سے بول کر ادا کیا جاتا ہے۔ صرف اتنا سوچ لینا کافی نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ انسان کو یہ زبان سے ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اس عملِ گویائی کی حتمی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف اس کلمے کو زبان سے ادا کرنا انسان کو مسلمان بنانے کے لیے کافی ہے۔ اسلام کا مرکزی ستون (عماد الدین) یعنی نماز، جسم کی کچھ حرکات کا مجموعہ ہے جن کے ساتھ چند کلمات بھی ادا کیے جاتے ہیں اور اگر کسی مجبوری سے انسان ان جسمانی حرکات کو ادا کرنے سے قاصر ہو تو یہ کلمات زبان سے یا دل ہی دل میں کہ لینے سے نماز ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ''اقرار باللسان'' (زبان سے اعلان و اقرار) وہ اہم ترین عمل ہے جو انسان انجام دیتا ہے۔ یہی اس کے انسان ہونے کی پہچان ہے اور اسی سے انسان اور خدا کے درمیان ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ زبان سے چند کلمات ادا کرنا یا گویائی کا استعمال ہی ایمان کا تقاضا نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایسے لوگوں کو جانتا ہوگا جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں اور اسی لیے ہماری نگاہ میں ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ قرآن اس ضمن میں صاف صاف بتا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی انسان کی یہ خصلت ناپسند ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ (٦١:٣)

اللہ کے ہاں یہ بات بڑی بیزاری کی ہے کہ تم کہو وہ چیز جو نہ کرو۔

رسولِ خداؐ نے ایمان کی جو تعریف فرمائی ہے اس کا تیسرا جزو ہے ''عمل بالجوارح'' یعنی ہاتھ پیر سے عمل کرنا۔ جب انسان یہ جان لے کہ ایک چیز حق ہے اور اس کی صداقت کا زبان سے اقرار کرلے تو پھر اسے اس حقیقت سے وفاداری بھی کرنا لازم ہے اور یہ تعلق اس کے عمل سے ظاہر ہونا چاہیے۔ انسان جس حقیقت کی شناخت کر چکا، اس کی زندگی اس کے مطابق ہونا چاہیے۔

ایمان کے مکمل ہونے کے لیے ''جوارح کے عمل'' کے ضروری ہونے سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ بعض مسلم علماء نے ''اسلام'' کو ''ایمان'' کے جزو کے طور پر کیوں شمار کیا ہے۔ اسلام کیا ہے، یہی عمل بالجوارح، کوئی سا عمل نہیں بلکہ وہ عمل جس کا امر اللہ تعالیٰ نے کیا ہو، جو قرآن کی صداقت پر استوار ہو۔

''ایمان'' کا تقاضا ''اسلام'' ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ ایمان میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل شامل ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو تعمیلِ حکم کر رہا ہو وہ لازماً صاحبِ ایمان بھی ہو۔ بظاہر ایک مسلمان کی طرح عمل کرتے ہوئے بھی ایک شخص اس ایمان سے محروم ہو سکتا ہے جو رسولِ خداؐ نے حدیثِ جبرئیل میں بیان کیا۔ ضروری نہیں کہ ایسے شخص کا عمل رائیگاں جائے تاہم اس کی قدر و قیمت ضرور مشکوک ہو جاتی ہے۔

ایمان اور اسلام کے باہمی تعلق کو ایک سادہ مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ آج امریکہ میں لاکھوں مسلمان ہیں۔ ان میں سے اکثر یا تو ترکِ وطن کر کے وہاں آباد ہوئے ہیں یا تارکینِ وطن کی اولاد ہیں۔ وہ دوسرے امریکی شہریوں کی طرح عام سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا

ہے۔ اگر خاندان شریعت کا پابند ہے تو تو شادی اسلامی قانون کے مطابق انجام پائے گی۔ اگر لڑکا مسلمان ہے اور دلہن عیسائی یا یہودی ہے تو فقہا کی عمومی رائے کے مطابق شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں بشرطیکہ بچوں کو مسلمان کے طور پر پروان چڑھایا جائے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی کرنا چاہے تو شریعت کا کہنا ہے کہ شادی جائز نہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے گا؟ مسئلے کا سب سے عام حل تو یہ ہے کہ دولہا اسلام قبول کر لے۔ اس کے لیے دو مسلمان گواہوں کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھنا کافی ہے۔ اب شادی پر کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔ عموماً دولہا کے بارے میں یہ پرسش کوئی نہیں کرتا کہ اسے اپنے کہے ہوئے پر ایمان بھی ہے یا نہیں کیونکہ شریعت کو عمل سے سروکار ہے ایمان سے نہیں۔ آنحضرتؐ کی ایک مشہور حدیث ہے جس میں آپؐ نے ایک صحابی کو فہمائش کی۔ ان صحابی نے کسی شخص کے ایمان کو باطل قرار دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''تم نے اس کے دل کو کھول کے دیکھا تھا''؟۔ ایمان خدا اور بندے کے درمیان ایک معاملہ ہے۔ ہمیں اس پر حکم صادر کرنے کا حق نہیں۔ کسی کے عمل کا جائزہ تو لیا جا سکتا ہے اور اس پر رائے دی جا سکتی ہے تاہم دلوں کے اندر کیا ہے اسے جاننا ممکن نہیں۔

''ایمان'' اور ''اسلام'' کے درمیان جو امتیاز ہے وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں بیان ہوا ہے۔ ہم ان کی جانب پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۹:۱۴)

یہ اعرابی گنوار کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ کہیے، تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے۔ رہا ایمان تو اس کا ابھی تمہارے دلوں میں گزر بھی نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔

ان آیات میں کئی نکات قابل غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ''اسلام'' اور ''ایمان'' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر لوگ باگ احکاماتِ خداوندی کی تعمیل کرنے لگے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں ایمان بھی حاصل ہو گیا ہے۔ تعمیلِ حکم خوف کے مارے بھی ہو سکتی ہے، دوستی اور حمایت حاصل کرنے کے لیے بھی اور کسی لڑکی سے شادی کی نیت سے بھی۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ایمان دل میں ہوتا ہے۔ اس کا مسکن قلب ہے۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے۔

یُرْضُوْنَکُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ وَتَاْبٰی قُلُوْبُھُمْ (۹:۸)

یہ اپنی باتوں سے تمہیں راضی کر دیتے ہیں لیکن ان کے دل اس سے ابا کرتے ہیں۔

قرآن مجید رسولِ خداؐ سے خطاب کر رہا ہے کہ بدوؤں کو بتا دیں کہ وہ ایمان والے نہیں ہیں کیونکہ ان کے دل میں ایمان نہیں پایا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان میں نہ تو حق و صداقت کی مطلوبہ شناخت ہے اور نہ اس سے وفا اور تعلق۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ آپؐ ان بدوؤں سے یہ بات اپنی رائے یا فیصلے کی بنیاد پر نہیں فرما رہے بلکہ اللہ کے حکم کے تحت ان سے یہ کہہ رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ ہی جھانک سکتے ہیں اور وہی ان کی نیتوں اور خیالات کو جانتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَافِيْ قُلُوْبِكُمْ (۳۳: ۵۱)

اوراللہ جانتا ہے جوتمہارے دلوں میں ہے۔

لیکن دوسرے شخص کے دل میں کیا ہے یہ جاننا ہمارے بس میں نہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ''اسلام'' (سرافگندگی اور تسلیمِ حکم) اطاعت اور عمل کا میدان ہے۔انسان اللہ کی اطاعت اس طرح کرتا ہے کہ اس کا حکم بجالاتا ہے۔اگر عمل اس کے حکم کے مطابق ہے تو اس کے لیے اجروثواب ہے خواہ اس کے عمل کے جلو میں اعترافِ حق اور اس سے سچا تعلق اور وفاداری مفقود ہو۔ ہماری مراد یہ نہیں کہ انسان چاہے تو کچھ بھی کیا کرے۔ اگر وہ حکمِ خداوندی کے مطابق نکل آیا تو اسے اجر ملے گا۔یہاں ان اعمال کا ذکر ہے جو بنیادی شرطِ اطاعت کے طور پر قرآن مجید نے متعین کیے ہیں یعنی ارکانِ اسلام۔بدو آئے اور فرمانبرداری کا عہد کرلیا۔اس تسلیم نے انہیں مسلمان بنا دیا۔سو ان کی نیت یہ تھی کہ دین کی پیروی کریں اور رسول خدا کی اطاعت کریں۔ان کو ان کی نیت کا اجر ملے گا۔

ایمان کی اہمیت کے کچھ پہلو تب سمجھ میں آئیں گے جب ہم اس کی ضد، اس کے الٹ لفظ ''کفر'' پر غور کریں گے۔اس لفظ کا انگریزی میں عموماً Infidelity یا Unbelief کے الفاظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ روزمرہ کی زبان میں ''کافر'' وہ ہے جو ''اسلام'' کو تسلیم نہ کرے۔لہٰذا اگر مسلمان Believer ہیں تو کافر Unbelievers یا Infidels ہوں گے۔ہم اس سلسلے میں پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ ایمان کے ترجمے کے لیے Belief کا لفظ کوئی موزوں ترجمہ نہیں ہے پس کفر کے لیے Unbelief بھی ایک ان گھڑسا ترجمہ ہوگا۔قرآن مجید میں

کفر کا لفظ اور اس سے متعلق الفاظ جس طرح آئے ہیں ان پر نظر کیجیے تو پتا چلے گا کہ اس کے معانی کی کچھ تہیں ایسی ہیں جہاں تک انگریزی ترجمے کی رسائی نہیں ہوتی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ قرآن مجید نے ''کفر'' کا لفظ صرف ''ایمان'' کے الٹ کے طور پر ہی استعمال نہیں کیا۔ یہی لفظ ''شکر'' کی ضد کے طور پر بھی آیا ہے۔ اسلام ہر چیز کو جس طرح دیکھتا ہے اس کے مطابق اگر انسان اللہ کی مخلوق ہے اور اسے اپنی ہستی سے لے کر اپنی ہر قوت، ہر صلاحیت اور ہر نعمت اللہ کے عملِ تخلیق سے حاصل ہوئی ہے تو اسے اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اللہ کی عطا اور اس کا کرم نہ ہوتا تو انسان کا وجود تک نہ ہوتا۔ پس شکر پہلی صفت ہے جو انسان میں ہونا چاہیے۔ یہ اللہ کا حق ہے۔

بسم اللہ کے بعد قرآن مجید کے پہلے الفاظ ہیں ''الحمد للہ''۔ عربی کے یہ کلماتِ تشکر صرف عربی ہی میں نہیں سب اسلامی زبانوں میں روزمرہ کے طور پر داخل ہیں ایسے ہی جیسے Thank you انگریزی کا روزمرہ ہے۔ یوں کہیے کہ اللہ کا ہم پر جو احسان ہے اسکا شکر ادا کرنا ادب کا ایک اہم تقاضا ہے۔ اس ایک فقرے میں سارے قرآن کا رخ سمٹ آیا ہے اور قرآن کا پیغام اس کے کوزے میں سما گیا ہے۔

یاد رہے کہ یہ فقرہ ''الحمد للہ'' Praise belongs to God کوئی exclamation یا فجائیہ فقرہ نہیں ہے خواہ لوگ باگ اس کو اس معنی میں بھی بول لیتے ہوں۔ اسے انگریزی کے فقرے Praise be to God کا مترادف و ہم معنی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انگریزی میں یہ فقرہ خاص خاص مواقع پر بولا جاتا ہے۔ عربی کا فقرہ ایک بیانِ واقعہ ہے۔ کسی اور کے لیے تعریف نہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کوئی خیر اور نفع رسانی کا منبع نہیں۔ ہر مثبت اور قابلِ تعریف چیز اللہ کی طرف

سے ہے خواہ انسان کے ہنر و مہارت یا سازگار موسم یا خوش بختی کو ہم اس کا فوری سبب قرار دیں۔ رسولِ خدا کی اس مختصر حمدیہ دعا میں یہی آیا ہے کہ ہر اچھی شے اللہ کی طرف سے ہے "الخیر کلہ بیدک والشر لیس الیک"۲؎ (خیر سب کا سب تیرے ہاتھ میں ہے اور شر تیری طرف نہیں لوٹتا)۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ناشکری کو سب سے گری ہوئی انسانی حرکت کہا جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ناک تلے کی چیز سے آنکھ بند کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہر خیر کا سرچشمہ ہے لہٰذا انسان کو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللہ کے حضور سپاس گزار آدمی مسلمانوں کی نگاہ میں ایسا ہی ہے جیسا وہ شخص جسے ایک شاندار ضیافت میں بلایا گیا ہو۔ گو وہ اس قابل بھی نہ رہا ہو کہ اس جگہ قدم بھی دھر سکے۔ پھر بھی وہ آئے، دستر خوان پر پسر جائے، سیر ہو کر دعوت اڑائے اور ڈکار لیتا ہوا اٹھ کر چل دے۔ میزبان کا شکریہ ادا کرنے کا اسے خیال تک نہ گزرے۔

قرآن کے نقطۂ نظر سے اور مسلمانوں کے عمومی فہم کے مطابق ایمان اور شکر کے متضاد کے طور پر "کفر" کے دونوں معانی کو عملاً ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان شکر کی ایک صورت کے سوا اور کچھ نہیں اور شکر ایمان ہی کی ایک شکل ہے۔ انسان کو اگر پیراہنِ ہستی عطا ہوا ہے تو یہ سراسر احسان ہے ورنہ انسان اس کے لیے کیا جواز رکھتا تھا۔ "ایمان" اس معجزۂ تخلیق کے جواب میں انسان کا فطری اور نارمل ردعمل ہے۔ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس سے بالاتر اور اس سے وراء ایک اور حقیقت ہے جس نے اسے وہ بنا دیا ہے جو وہ ہے تو پھر اسے اس حقیقت کا اعتراف اور اس کی شناخت کرنا چاہیے۔ اسے شکر گزار ہونا چاہیے کہ میزبان نے اس کو دعوت پر بلا لیا۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ اگر وہ شکریہ ادا کیے بغیر اُٹھ کر چل

دیا تو اس کی خوش بختی زائل ہو جائے گی۔ یاد رہے کہ شہر بھر میں یہی ایک جگہ ہے جہاں مفت کی ضیافت میسر ہے بلکہ یوں کہیے کہ شہر بھر کا کیا مذکور ہے، ضیافت ہے ہی صرف یہی لہٰذا ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اظہارِ تشکر کرنا نہ بھولیں اور اپنے میزبان اور ولی نعمت کی خدمت میں حاضر رہیں کہ شاید وہ کوئی کام ان کے ذمہ کرنا چاہے۔

یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ایمان حق کو دل سے شناخت کرنے، معرفت قلب سے، شروع ہوتا ہے۔ سو کفر کا مطلب ہوا دل سے انکارِ حق۔ مسلمانوں کے لیے جس طرح ایمان بعض بدیہی حقائق کے تسلیم و قبول اور ان سے تعلق کا نام ہے اسی طرح ان کی نظر میں ''کفر'' انہی حقائق کی تردید اور ان کے مطابق زندگی گزارنے سے انکار کرنے سے عبارت ہے۔ ولفریڈ کینٹول سمتھ نے مسلمانوں کے نظریۂ ایمان کو بڑی خوبی سے ان الفاظ میں سمیٹ دیا ہے۔ ''ارکانِ ایمان چونکہ ان کی نظر میں بدیہی اور ناقابل تردید ہیں لہٰذا مسئلہ اب یہ رہ جاتا ہے کہ اب کرنا کیا چاہیے؟ ہمارا علم ہم سے کس عمل کا تقاضا کرتا ہے؟''[۳] پس بات یہ نکلی کہ کفر چونکہ ایسی چیزوں کے انکار کا نمائندہ ہے جو واضح، صریح اور ناقابلِ تردید ہیں یعنی اپنا ثبوت آپ ہیں اور ان کو کسی طور جھٹلایا نہیں جا سکتا، اسی لیے کفر کو اتنی حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔

''کفر'' کی اصطلاح کے اصلی معنی ہیں کسی شے کو چھپانا، ڈھانپنا۔ وہ لوگ جو ناشکرے ہیں وہ اس نیکی کو چھپاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان سے کی ہے، وہ اس خیر کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ شخص جو ایمان نہیں لاتا وہ ہستی کے بدیہی حقائق کو چھپا رہا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ''کفر'' کا مطلب ہے ان حقائق کو چھپانا اور ان پر پردہ ڈالنا جو ہم

جانتے ہیں۔ پس یہ ضروری ٹھہرا کہ اگر اس لفظ کو انگریزی میں منتقل کرنا ہو تو Unbelief اور Infidelity کے لفظ سے ترجمہ کرنے کی بجائے Ungrateful truth concealing (ناشکرے پن سے ہونے والا اخفائے حق) کے الفاظ استعمال کرنا ہوں گے۔

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ Unbelief ایک بہتر ترجمہ ہے کیونکہ اس میں آپ دوسرے کے بارے میں فیصلہ صادر نہیں کرتے۔ کچھ لوگ یہ سوال بھی اٹھا سکتے ہیں کہ یہاں مسئلہ مسلمانوں کے ماننے، ان کے اعتقاد کا ہے معروضی حقائق کا نہیں ہے۔لیکن اگر مسلمان یہ تسلیم بھی کر لیں کہ یہ معاملہ فقط اعتقاد کا ہے تب بھی بات پھر لوٹ کر غیر مسلم کے سامنے آ جائیگی کیونکہ یہ کہ کر غیر مسلم معترض نے مان لیا کہ بحث اصل میں ان اعتقادات کی ہے جو درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔لیکن یہاں پر قباحت یہ ہے کہ اس طرزِ استدلال سے ''ایمان'' کے لفظ کے معنی غلط ہو جاتے یں کیونکہ اس کا مذکورہ معنی میں ''اعتقاد'' Belief سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک اور اعتراض بھی یہ کہ کر کیا جا سکتا ہے کہ ''میں تو ان 'حقائق' کو نہیں جانتا، نہ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ حقائق ہیں تو پھر مجھے کیونکہ ''حق کو چھپانے والا'' کہا جا سکتا ہے؟'' روایتی مسلمان اس کا عام طور پر یہ جواب دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ قرآن کیا کہ رہا ہے۔اگر وہ اس کے پیغام کو ذرا غور سے سنتے تو یہ جان لیتے کہ انہیں بخوبی معلوم ہے کہ ''لا الہ الا اللہ'' کیونکہ یہ سرشت وفطرتِ انسانی ہے۔ انسان کو یہ حقیقت ہمیشہ معلوم ہوتی ہے۔وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ اسے یہ حقیقت معلوم نہیں ہے تو وہ گویا اپنے انسان ہونے سے انکار کر رہا ہے۔

غیر مسلموں کے نقطۂ نظر سے یہ جواب شاید اطمینان بخش نہ ہو لیکن ہمیں

چاہیے کہ اس کی تہ میں کارفرما منطق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ اگر ایک مرتبہ یہ جان لیں کہ اسلام کا تصورِ خدا اور تصورِ انسان کیا ہے اور اس نے انسان اور خدا کو جس طرح سمجھا ہے اس کے مضمرات اگر آپ کی گرفت میں آ جائیں تو آپ خود بخود سمجھ لیں گے کہ مذکورہ بالا جواب ایک معقول جواب ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس کتاب کے حصہ دوم کے آخر تک پہنچتے پہنچتے قارئین پر کم از کم اتنا ضرور واضح ہو جائے گا کہ اسلام کا یہ تناظر ایک بامعنی اور مربوط تصورِ کائنات سے جڑا ہوا ہے اور اسی پر اپنی عمارت استوار کرتا ہے۔

''ایمان'' کے بارے میں اس بحث کے خلاصے کے طور پر ہم یہ عرض کر سکتے ہیں کہ ''ایمان'' قلب و ذہن کی ایسی کیفیت کا نام ہے جس کا تعلق شناختِ حق، معرفتِ حق سے ہے، اپنی جانی ہوئی اس حق وصداقت سے عہدِ وفا اور اپنے اس تعلق اور comittment کے مطابق شیوۂ عمل۔

ایمان کی بحث لازمی طور پر حق وصداقت کے بارے میں بحث کی طرف لے جاتی ہے۔ حق کیا ہے اور ہم اس کی معرفت، اس کی شناخت کیونکر کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا شاید سب سے مشکل ہے اور سرِ دست ہمارے لیے تفصیلات میں جانا ممکن بھی نہیں۔ اور تفصیل میں جائے بغیر ہم یہ واضح نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں نے اس سوال کا جواب کیونکر دیا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف اتنا واضح کرنا ہے کہ مسلمان اپنے ایمان کے وسیلے سے جس حقیقت، جس حق وصداقت کی اعتراف وشناخت تک پہنچتے ہیں اسے انہوں نے کیونکر سمجھا ہے، وہی حقیقت جسے رسولِ خداؐ نے حدیثِ جبرئیل میں مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

## اُصولِ ثلاثہ

وہ صداقت جسے مسلمان مانتے ہیں اور اس سے اپنا تعلق استوار کرتے ہیں اسے حدیثِ جبرئیل میں ارکانِ ایمان کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی خدا، فرشتے، الہامی کتب، انبیاء، یوم آخر اور تقدیر۔ بعد ازاں جب علمائے کلام اور فلاسفہ نے دینی علم کی اقسام مرتب کرنا شروع کیں اور اسے ایک منظم درجہ بندی کی صورت دی تو ان چھ ارکانِ ایمان کو تین الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی توحید، نبوت اور معاد (یا آخرت)۔ ان کو اصولِ ثلاثہ یا دین کی تین بنیادیں کہا گیا۔

شیعہ علماء عام طور پر ان میں دو شعبوں کا اضافہ کیا کرتے ہیں یعنی 'عدل' اور ''امامت''۔ یہاں ہم صرف ان تین شعبوں پر گفتگو کریں گے جو تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ شیعہ دینیات سے خاص باقی دو مباحث الگ بحث کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہاں اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ شعیہ علماء نے توحید اور نبوت کے مضمرات کو جس طور سمجھا اور جانا ہے، عدل اور امامت اسی اسلوبِ فہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالفاظ دگر ان کی نظر میں ''عدل'' سے توحید کی ماہیت متعین ہوتی ہے اور ''امامت'' سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ نبوت کی بعض جہات ائمہ کرام کے وسیلے سے کیونکر تاریخ میں ظاہر ہوتی ہیں۔

توحید کی تعریف ہم نے یوں کی تھی کہ انسان پہلے تو یہ تسلیم کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (لا الہ الا اللہ) اور پھر اسی کی عبادت کرے۔ اُصولِ ایمان کے طور پر دیکھیے تو توحید یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے اور فرشتوں سمیت مختلف مخلوقات کا

اس سے کیا تعلق ہے۔ نبوت یہ واضح کرتی ہے کہ نبی کیا ہوتے ہیں اور ان کی الہامی کتابوں کا کیا کام ہے۔ معاد سے یومِ آخر کی، قیامت کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اسی لیے اس لفظ کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اکثر eschatology کا لفظ برتا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ''آخری چیزوں کا علم''۔ توحید اسی لفظ سے نکلا ہے جس مادے سے 'واحد' کا لفظ بنا ہے۔ واحد کا مطلب ہے ''ایک''۔ خدا ایک ہے اور توحید کا مطلب ہے ''اس بات کا اعتراف اور شناخت کہ خدا ایک ہے''۔ اسی معنی میں بسا اوقات ''وحدت'' یا ''وحدتِ خداوندی'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ ''وحدتِ خداوندی کا اعلان'' یا ''اللہ کے ایک ہونے کا اعلان'' کے الفاظ اس کا درست تر بیان کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن 'توحید' صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس لیے انگریزی کا کوئی ایک لفظ یا ترکیب توحید کے پورے معانی اور اس کی تہ داری کا احاطہ نہیں کر پاتی۔ ارکانِ ایمان میں سے تین رکن خدا، فرشتے اور تقدیر بنیادی طور پر توحید سے متعلق ہیں لیکن یہ صرف آغاز ہے۔ توحید ان تینوں ارکان کے حوالے سے کیا معنی رکھتی ہے، اس کا دامن بہت وسیع ہے۔

اسلام کی ہر شے کی بنیاد و ابتداء اللہ تعالیٰ ہے۔ فرشتے وہ مخلوق ہیں جو کائنات کے مراتب میں اللہ تعالیٰ کے قریب ترین ہیں اور انسان اور خدا کے تعلق میں ان کا ایک مرکزی کردار ہے۔ ''تقدیر، اس کا خیر اور اس کا شر'' اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے کیونکر معاملہ کرتے ہیں۔ ہر شے کے لیے اللہ نے ایک محدود مقدار میں خیر معین کیا اور عین اسی عمل کے منفی نتیجے کے طور پر ایک خاص اندازۂ شر مقرر ہے۔ خیرِ محض، لامحدود خیر صرف اللہ کے لیے ہے اور خیر جب محدود

ہوگا اس میں شر کا شائبہ پایا جائے گا۔

کس شخص کو کیا ملے گا اور جو انسان کے لیے مقرر ہے اس کے مقرر کرنے میں انسان کا بھی کچھ دخل ہے یا نہیں؟ یہ سوالات اٹھاتے ہی ہم مسئلہ جبر و قدر کے خارزار میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مزید براں، خیر و شر کی بات نکلی ہے تو جھٹ یہ سوال سامنے آ جاتا ہے کہ اس دنیا کا خالق اگر ایسا اچھا ہے تو اس نے یہ کیسی دنیا بنائی ہے جس میں اتنا شر بھرا ہوا ہے۔ یہ وہ انحل سوال ہیں جن سے انسان صدیوں سے الجھتا چلا آ رہا ہے اور ہم یہاں ان کا حل کرنے میں کامیاب بھی شاید نہ ہو سکیں لیکن بے فائدہ نہ ہوگا اگر کسی حد تک یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ مسلمان ان مسائل کو کس نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور ان کے حل کے لیے کیا سوچتے رہے ہیں۔

نبوت کا تعلق انبیاء اور الہامی صحیفوں سے ہے۔ اللہ تعالی نے رسول کیوں بھیجے؟ انسانی معاشرے میں ان کا منصب کیا ہے؟ اسی بات کو اسلام سے خاص کر کے پوچھیے تو سوال یہ ہوگا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا کردار کیا ہے؟

"معاد" توحید کے حوالے سے انسان کے انجام پر نظر کرتی ہے۔ انسان چونکہ الاحد سے آیا لہٰذا اسے الاحد ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ لوٹنے کے اس عمل کا گہرا تعلق اس امر سے ہے کہ انسان نبوت کے لائے ہوئے پیامِ ہدایت کو کس طرح قبول کرتا ہے۔ اسے جب انبیاء کے پیغام کے ذریعے اللہ کے بارے میں پتا چل جاتا ہے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے؟ انسان اپنے اعمال کا، موت کے بعد، اگلے جہان میں کیا پھل پائے گا؟ موت کے ساتھ ہی جب انسان کی آنکھیں کھل جائیں گی، اس کے نگاہ سے کور چشمی کے پردے اٹھ جائیں گے اور وہ خود کو حقیقتِ خداوندی کے روبرو پائے گا تو پھر کیا ہوگا؟

اُصولِ دین میں سے نبوت اور معاد ہر دو، اُصولِ اوّل یعنی توحید میں مضمر ہیں۔توحید ایک ہمہ گیر تصور ہے کیونکہ یہ جس حقیقتِ ربانی کا اظہار و بیان ہے وہ خود ہمہ گیر ہے۔نبوت اور معاد کی کوئی بھی گفتگو ہو، لازماً توحید کی جانب لوٹتی ہے۔ یاد رہے کہ قرآن و حدیث میں ان تین اُصولوں یا بنیادوں کو ترتیب دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔اس سے ہمارے ذہن میں یہ نکتہ واضح ہو جانا چاہیے کہ اُصولِ ثلاثہ کی یہ بحث ارکانِ ایمان کا تصور قائم کرنے کا ایک طریقہ ہے اور بس۔اس اندازِ نظر کو کوئی حتمی حیثیت حاصل نہیں۔اسلام کی تین اطراف یا تین جہات کے تصور پر ہم ''تعارف'' (Introduction) میں گفتگو کر چکے ہیں۔اُصولِ ثلاثہ کا تصور بھی اسی طرح کا ہے۔اس سے ہمیں ایک زاویہ نگاہ میسر آ جاتا ہے اور ہم سب چیزوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔

اسلام کے یہ اُصولِ ثلاثہ ہزار ہا کتب کا بنیادی موضوع رہے ہیں اور یہ موضوع اپنی جگہ علم کی ایک دنیا ہے۔بابِ ششم میں ہم یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ اسلام کے تین بڑے مکاتبِ فکر انہی ارکانِ ایمان کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کے مختلف طریقوں کی وجہ سے پروان چڑھے ہیں۔سر دست ہم ان تین اُصولوں کو سمجھنے کی ایک بنیاد فراہم کرنا چاہتے ہیں تاکہ قارئین حقیقت کے بارے میں اسلام کے اندازِ نظر سے آگاہ ہو سکیں۔

# تیسرا باب

## توحید

اسلام میں کلمۂ شہادت کی اوّلیت اور اہمیت پر ہم بات کر چکے ہیں ۔اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔اسی طرح ''ایمان'' کے لیے بھی کلمۂ شہادت کی بنیادی اہمیت ہے کیونکہ اس میں ایمان کے پہلے اور دوسرے اُصول مختصر طور پر بیان ہو گئے ہیں ۔

## پہلا کلمۂ شہادت

شہادت کے دو کلمات ہیں جن کو ہم پہلا اور دوسرے کلمۂ شہادت کہ سکتے ہیں ۔پہلے کلمۂ شہادت سے انسان یہ گواہی دیتا ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' اور دوسرا کلمۂ شہادت اس بات کی گواہی ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول ہیں ۔'' پہلا کلمۂ شہادت توحید کا اعلان ہے تو دوسرا کلمہ نبوت کا بیان ۔دوسرے کلمے پر گفتگو کتاب کے اس حصے میں ہوگی جہاں ہم تصورِ نبوت پر بحث کریں گے ۔

مسلمانوں کی نظر میں پہلے کلمۂ شہادت کا دینِ محمدی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ''اسلام'' کا اس کے وسیع ترین معنی میں بیان ہے۔یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ زمین و آسمان کی ہر شے اللہ تعالٰی کی مطیع اور اس کے سامنے سرافگندہ کیوں ہے۔یہی کلمہ اپنے محدود تر معنی میں اس دین کا عنوان بھی ہے جو سب انبیاء لے کر آئے تھے۔قرآن مجید میں اس بات کا سب سے واضح اشارہ درج ذیل آیت میں آیا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ (۲۱:۲۵)

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے ان کو یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

تمام انبیاء پیغام توحید ہی لے کر آتے رہے۔

پہلے کلمۂ شہادت کی یہ عالمگیر حیثیت غیر مسلموں کے لیے شروع میں قدرے اُلجھن پیدا کرتی ہے۔'الٰہ' اور ''اللہ'' کے الفاظ سن کر لوگ کیا سمجھتے ہیں۔خاص طور پر آج کے زمانے میں جب لوگوں کے طرزِ فکر وفہم پر دین کے بحیثیت مجموعی نسبتاً کم اثرات رہ گئے ہیں۔ ہر شخص کے ذہن میں ''الٰہ'' کا اپنا اپنا تصور ہے۔ایک بات البتہ یقینی ہے اور وہ یہ کہ اس لفظ''الٰہ''یا''خدا'' سے عام طور پر جو سمجھا جاتا ہے وہ ان معانی کو گرفت میں لانے کے لیے چنداں مفید نہیں جو اسلام نے اس لفظ کو دیئے ہیں۔

جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''میں خدا کو نہیں مانتا'' تو اپنی مذہبی تعلیمات کا فہم رکھنے والے مسلمان بہ آسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ''میں بھی اس خدا کو نہیں مانتا جسے تم نہیں مانتے۔''لوگ کچھ ایسا غلط نہیں کرتے اگر اس خدا کو نہیں مانتے جو ان کی سمجھ میں آیا ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا اس حقیقت سے کوسوں دور ہے جس کی طرف پہلا کلمۂ شہادت اشارہ کر رہا ہے۔اسی لیے یہ لازمی ٹھہرتا ہے کہ ہم اسلام کے تصورِ الٰہ کی شرح و وضاحت کے لیے اچھے خاصے صفحات صرف کر دیں۔

پہلے کلمۂ شہادت کی عالمگیر حیثیت کو سمجھنے میں دوسری دشواری جو غیر مسلموں کو

پیش آتی ہے یہ ہے کہ ''اللہ'' کا لفظ مشترک طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب لوگ یہ لفظ سنتے ہیں تو فطری طور پر ان کا دھیان اس جانب جاتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان اپنے کسی ایک ''خدا'' کو مانتے ہیں جیسے پرانے یونانی زیوس کو یا بہت سے ہندو وشنو کو مانتے ہیں یا جیسے ہر قبیلے کا اپنا ایک خدا ہوتا ہے۔ اللہ کے بارے میں اس انداز سے سوچنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ یہ فرض کر رہے ہیں کہ یہودی اور عیسائی تو حقیقی خدا کو مانتے ہیں جبکہ مسلمانوں کا اپنا ایک مقامی خدا ہے، یا خدا کے بارے میں ان کا ایک جھوٹا تصور ہے۔

عربی میں ''اللہ'' کا مطلب ہے ''خدا'' God۔ قرآن و حدیث اور ساری اسلامی روایت یہ کہتی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور اسلام کا خدا ایک خدائے واحد ہے۔ عربی بولنے والے مسلمانوں کے لیے یہ ناقابل تصور ہے کہ وہ اس خدا کے لیے ''اللہ'' کے سوا کوئی اور لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں جس کی پرستش یہودی اور عیسائی کرتے ہیں۔ وہ عیسائی اور یہودی جن کی زبان عربی ہے وہ بھی خدا کی عبادت کرتے ہوئے اللہ ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

پہلے کلمۂ شہادت کی گفتگو ہو تو انگریزی میں ''اللہ'' Allah کے لفظ کا استعمال خاص طور پر گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا ترجمہ یوں کیا جائے کہ "There is no god but Allah" تو اس کی مراد بالکل بدل جائے گی اس ترجمے سے جو مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہو "There is no god but God" مثال کے طور پر اگر یوں کہا جائے کہ سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ کی تعلیم یہ تھی کہ "There is no god but God" تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی لیکن اسی بات کو انگریزی میں اگر یوں کہا جائے کہ موسیٰ و عیسیٰ کی تعلیم یہ تھی کہ "There

"is no god but Allah" تو بات مضحکہ خیز ہو کر رہ جائے گی۔ انگریزی بولنے والے لوگ جو اسلام سے آشنا نہ ہوں "اللہ" کے لفظ سے قدرتی طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کسی باطل، اجنبی خدا کا نام ہے، ویسا ہی کوئی دیوتا جس کی پوجا بت پرست یا خدا کو نہ ماننے لوگوں قبیلوں میں کی جاتی ہے۔

بہت سے مسلمان انگریزی بولتے ہوئے بھی Allah کا لفظ استعمال کرنے پر مصر رہتے ہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اصلی نام کے طور پر قرآن میں آیا ہے لہٰذا اس لفظ کی اپنی ایک خاص برکت ہے۔ دوسری بات یہ کہ اکثر انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی مادری زبان انگریزی نہیں ہوتی لیکن ان کے لیے یہ کالملاً واضح ہوتا ہے کہ اسلام ایک سچا دین ہے۔ لہٰذا ان کا خیال اس طرف کبھی جاتا ہی نہیں کہ انگریزی بولنے والے غیر مسلموں کے ذہن میں صرف یہ لفظ Allah سنتے ہی کیسی کیسی غلط فہمیاں سر اُبھارنے لگتی ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں میں اپنے دینی علوم اور الٰہیاتی مسائل پر گرفت بہت کم ہوتی ہے۔ سو ان کے سوچنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ "اللہ" تو سچے خدا کا نام ہے لیکن انگریزی میں God کا جو لفظ ہے اس سے اشارہ کسی جھوٹے خدا کی طرف ہے جس کی یہودی اور عیسائی عبادت کرتے ہیں۔ یہ مسلمان ایک طرح سے ان انگریزی بولنے والے لوگوں کا عکس کہے جائیں گے جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ God تو سچا خدا ہے لیکن Allah کسی جھوٹے خدا کا نام ہے جس کی پرستش بُت پرستوں Pagans کے ہاں کی جاتی ہے۔

# خدا

اسلام میں ایمان کا پہلا رکن خدا ہے۔لیکن خدا کیا ہے،کون ہے؟۔سارے مسلمان علماء عملاً یہی مانتے ہیں کہ لفظ ''الہ'' یا خدا کا صحیح فہم اس وقت تک ناممکن ہے جب تک وحیِ خداوندی سے معلوم نہ ہو۔بالفاظِ دگر خدا کیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ خود ہی انسان کو بتائے تو معلوم ہوگا۔آخر دوسرے انسانوں کو سمجھنا بھی تو ایک اچھا خاصا مشکل کام ہوتا ہے بلکہ اگر وہ گفتگو کے وسیلے سے اپنا اظہار نہ کریں تو سمجھنا تقریباً ناممکن ہوکر رہ جائے۔دوسرے لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں، چھو سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہماری دید کی پہنچ سے دور ہے۔اگر ہمیں یہ جاننا ہے کہ خدا کیا ہے تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہمیں بتائے کہ اللہ کیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے بارے میں انبیاء کے ذریعے سے بتاتا ہے، ان کے وسیلے سے انسان سے کلام کرتا ہے۔اس کا کلام انبیاء کی کتابوں یعنی الہامی صحیفوں میں درج ہے۔ دوسرے ادیان کے ماننے والوں اور مسلمانوں میں فرق یہ ہے کہ مسلمان سیدنا محمدؐ کو اللہ کا رسول اور قرآن مجید کو پیامِ خداوندی تسلیم کرتے ہیں اس کے برعکس دوسرے ادیان کے پیروکار لوگ دوسرے انبیاء کو مانتے ہیں (کم از کم روایتی اسلامی نقطۂ نظر یہی ہے)

تمام انبیاء کا بنیادی پیغام ایک ہے یعنی ''لا الہ الا اللہ''۔خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کی نظر میں ''خدا'' God کا مطلب ہے وہ حقیقت جو قرآن میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔اور god کا لفظ ان کی فہم کے مطابق ہر اس شے کا عنوان ہے جس سے انسان نے وہ صفات غلط طور پر منسوب کر رکھی ہوں جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے بیان ہوئی ہیں۔

اللہ تعالٰی کو جاننا ہو تو سب سے پہلے قرآن کو سمجھنا ہوگا۔لیکن قرآن کا سمجھنا آسان نہیں۔یہ کوئی سہل سی کتاب نہیں ہے۔بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان گزشتہ ۱۴سو سال سے قرآن کی شرح و تعبیر کرتے آرہے ہیں اور ابھی اس کے معانی کا بیان ختم ہونے کا آغاز تک نہیں ہو سکا۔دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ تعالٰی کے بارے میں جو بھی اور جتنا بھی کہہ لیجیے پھر بھی کہنے کو بہت کچھ رہ جائے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالٰی کے بارے میں کیا کہا گیا ہے اس کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے آیئے ذرا ''الٰہ'' اور ''اللہ'' کے عربی الفاظ پر ایک نظر ڈال لیں۔یہ ہمارے بحث کے لیے مفید ہوگا۔عربی لغات یہ بتاتی ہیں کہ ''الٰہ'' ہر وہ چیز ہے جسے پرستش، عقیدت اور اطاعت کا مرکز بنایا جائے۔قرآن میں یہ لفظ منفی اور مثبت دونوں معنوں میں آیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لفظ جھوٹے خدا اور سچے خدا دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔قرآن نے اسے مثبت معنی میں بار بار استعمال کیا ہے۔جیسا کہ درج ذیل آیات میں نظر آتا ہے۔

وَمَامِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۵:۷۳)

حالانکہ نہیں ہے کوئی خدا مگر ایک ہی خدا۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' (۴:۱۷۱)

خدا تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (۲۲:۳۴)

سو خدا تمہارا ایک اللہ ہے سو اسی کے حکم میں رہو۔

قرآن مجید نے ''الٰہ'' کا لفظ منفی معنی میں بھی استعمال کیا ہے اور اس سے مراد ہوتا ہے جھوٹا خدا، بت، اصنامِ خیالی۔مثال کے طور پر قرآن میں جہاں بنی اسرائیل

اور سنہری بچھڑے کا ذکر آیا ہے۔ وہاں لوگ سیدنا موسیٰؑ سے کہہ رہے ہیں۔

يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (۷: ۱۳۸)

اے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک بت بنا دو، جیسے ان لوگوں کے بت ہیں۔

سیدنا موسیٰؑ جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا (۷: ۱۴۰)

کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود تم کو لا کر دوں۔

''الہ'' کی اگر یہ تعبیر اور یہ معنی ذہن میں رہیں تو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ''لا الہ الا اللہ'' کا مطلب ہے وہ تمام ''الہ'' جن کی لوگ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں جھوٹے خدا ہیں۔

قرآن مجید نے ''الہ'' کا لفظ اور بھی کئی منفی معانی میں استعمال کیا ہے اس لیے کہ ''الہ'' کوئی شے بھی ہو سکتی ہے، ہر وہ چیز جس کی انسان عبادت کرے، جس کی بندگی کرے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ''الہ'' صرف ایک ہی ہے جس کی بندگی کی جا رہی ہے۔ انسان کے جھوٹے خدا بہت سے ہو سکتے ہیں اور قرآن مجید نے اکثر انسانوں کے اس عمل پر نکیر کی ہے۔ لازمی نہیں کہ آپ کا بت، آپ کا جھوٹا خدا خارج میں کوئی چیز ہو۔ ہمیں عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ ''الہ'' وہ ہے جو ''وہاں'' ہو، خارجی وجود رکھتا ہو، آسمانوں کے اوپر ہو، ہم سے بالاتر مرتبے کی ہستی ہو۔ لیکن عربی کے لفظ ''الہ'' میں ایسا کوئی تقاضا نہیں کیا گیا۔ آپ اس خدا کی پرستش بھی کر سکتے ہیں جو آپ کے اندر ہو اور اس کی بندگی بھی جو آپ سے فروتر ہو۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کو بُری طرح لتاڑا ہے جو اپنے خیالات اور اپنے

مزاج کی لہروں کی عبادت خدا کی طرح کرتے ہیں۔ یہاں قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ہے ''ھویٰ''۔ انگریزی میں اسے Caprice کے لفظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ''ھویٰ'' کا لفظ جس لفظ سے نکلا ہے اسے دیکھیے تو ''ھویٰ'' اور ''ھوا'' Wind تقریباً ہم معنی ہو جاتے ہیں۔

''ھویٰ'' ہمارے اندر کی وہ ''ہوا'' ہے جو کبھی اِدھر سے اُدھر چلتی ہے اور کبھی اُدھر سے اِدھر۔ لحظہ گریزاں کا میلان، کبھی ایسے کبھی ویسے۔ آج ہم ایک چیز کی خواہش کر رہے ہیں کل کسی دوسری شے کی آرزو کرنے لگیں گے۔ قرآن مجید کے مطابق ''ھویٰ'' بدترین خدا ہے۔ اگر آپ اس کی بندگی میں لگ گئے تو پھر آپ کو سر پیر کی خبر نہیں رہے گی۔ آپ کے خیالات، احساسات اور جذبات عملاً ہر روز تبدیل ہوتے ہیں۔ ہوا چلتی رہتی ہے اور قرآن نے یقین سے کہا ہے کہ اگر یہ ہوا آپ کو اڑا لے گئی تو پھر ہلاکت میں لے جا کر پٹخے گی۔ درجِ ذیل قرآنی آیات سے ہوا و ہوس کی اس رو کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۷۹:۴۰-۴۱)

اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے پیش ہونے سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو اس کے چاؤ اور خواہش سے روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہی ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ(۲۵:۴۳)

بھلا دیکھ تو اسے جو اپنی خواہش اور چاؤ کو معبود بنائے ہوئے ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ(۲۸:۵۰)

اور اس سے زیادہ بہکا ہوا کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کا

پیرو بنا ہوگا۔

اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ(۴۵:۲۳)

بھلا دیکھ تو اسے جس نے اپنی خواہش کو حاکم ٹھہرا رکھا ہے، جسے جانتے بوجھتے ہوئے اللہ نے راہ سے بھٹکا دیا۔

قرآن مجید نے ''ھویٰ'' کی جمع کو بھی اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔سترہ مقامات پر یہ لفظ آیا ہے۔ان میں سے سولہ جگہوں پر اسکے ساتھ جو فعل آیا ہے وہ ''اتبع'' to follow (پیروی کرنا، اتباع کرنا)۔نادان لوگ اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرتے ہیں، ان چھوٹے چھوٹے خداؤں کی جو ان کے اندر چھپے ہوئے ہیں اور انجام کارِ جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔پیغام بالکل واضح ہے۔انسان کو جھوٹے خداؤں سے بچنا چاہیے،ہدایتِ خداوندی کے مطابق چلنا چاہیے جو نبوت کی صورت میں انسان تک آئی ہے۔

بعد کے زمانوں میں یہی لفظ''ھویٰ'' انحراف، بدعت اور گمراہ فرقوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔جو لوگ ان فرقوں کے رکن ہیں وہ اپنی خواہشات کی ہوا کی زد میں ہیں اور انبیاء کے پیغام کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔یا پھر وہ اپنی یا اپنے پیشوا کی خام خیالی اور اوہام کی پیروی کرتے ہوئے الہامی کتب کو سمجھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ ''ھویٰ'' کا لفظ ''فرقے'' کے لیے استعمال کرنا Heresy کے لفظ کے استعمال کے مترادف ہے۔Heresy کی اصل یونانی ہے اور وہاں اس کا مطلب ہے ''انتخاب کرنا، چناؤ''۔Heresy وہ راستہ ہے جو آپ نے ہدایتِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے لیے چن لیا ہے۔

اگر ”الٰہ“ god جھوٹا خدا یا سچا خدا ہو سکتا ہے تو God از روئے تعریف سچا خدا ہے۔ اگر الٰہ کوئی بھی ایسی چیز ہے جس کی عبادت اور بندگی ہو سکے تو پھر God وہ ہے جس کی عبادت لازم ہے۔ ”لا الٰہ الا اللہ“ کہنے کا مطلب ہے کہ کسی طرح کی عبادت، کوئی اندازِ بندگی اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ کے سوا ہر خدا جھوٹا خدا ہے۔

## شرک

ایمان کا پہلا رکن ہے توحید، یہ اعلان کہ اللہ ایک ہے۔ توحید کا مفہوم نہایت ایجاز اور جامعیت کے ساتھ پہلے کلمۂ شہادت میں بیان ہو گیا ہے۔ اس کلمے کو کلمۂ توحید کہا جاتا ہے۔ ”لا الٰہ الا اللہ“ کا مطلب ہے کہ عبادت کا صرف ایک سچا اور رائقِ پرستش مرکز ہے، ایک ہی ہستی ہے، اللہ۔ عبادت اور بندگی کا ہر دوسرا ہدف باطل ہے۔ کسی بھی دوسری شے کی بندگی کرنا گمراہی اور خطا کاری ہے یہ شرک کے گناہ کا جرم ہے۔

”شرک“ کا مطلب ہے ”شریک کرنا، حصہ دار بننا، کسی کو شریک بنانا، کسی کو کسی کا ساجھی بنانا، کسی کو کسی اور کا شریک کرنا۔“ دینی اعتبار سے دیکھیے تو شرک کا مطلب ہوگا اللہ کے شریک بنانا اور اس میں یہ چھپا ہوا ہے کہ اگر شریک کیا ہے تو خدا کے ساتھ یا خدا کو چھوڑ کر اس کی عبادت بھی کی جائے گی۔ قرآن نے یہ لفظ ۷۵ آیات میں استعمال کیا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوگا۔ Associating others with God

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (٤:٣٦)

اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو مت ملاؤ۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۳۱:۱۳)

اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا بے شک شریک بنانا بڑی بے انصافی ہے۔

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۶:۱۹)

کہ دو، وہی ہے معبود ایک اور میں ان کو قبول نہیں کرتا جو تم شریک کرتے ہو۔

قُلْ اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ (۱۳:۳۶)

تم کہ دو کہ مجھے تو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤں۔

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے، شرک سے بچنا پیامِ قرآنی کا مرکزی حصہ ہے اس لیے کہ یہ ''توحید'' کا الٹ ہے۔ اگر کلمۂ توحید اسلام کا پہلا ستون ہے اور خود توحید اسلام کا پہلا اُصول ہے تو ہم یہ آسانی سے جان سکتے ہیں کہ شرک کو اس شدت سے کیوں منع کیا گیا ہے اور اسے اتنا برا کیوں سمجھا گیا ہے اور قرآن میں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو معاف نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴:۱۱۶، ۴:۴۸)

بے شک اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس سے نیچے جس کو چاہے بخش دیتا ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (۵:۷۲)

جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی۔

توحید کا فہم چونکہ اسلام کے لیے اس قدر بنیادی ہے لہٰذا شرک کی نوعیت پر قدرے مزید غور کرنا مفید رہے گا۔عربی کہاوت کے مطابق ''اشیاء اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں''۔دن کو ہم رات سے سمجھتے ہیں اور رات کو دن سے جانتے ہیں۔اسی طرح ''توحید'' تب ہماری سمجھ میں آئے گی جب ہم یہ جان لیں کہ شرک کیا ہوتا ہے۔

شرک کے لفظی معنی سے یہ لگتا ہے کہ انسان کو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنے کے سلسلے میں ہوشیار رہنا چاہیے تاکہ شرک کا ارتکاب نہ ہو جائے۔لیکن اگر میں کسی ہستی کو جانتا ہی نہ ہوں تو اس کے ساتھ کسی کو شریک کیوں کر بنا سکتا ہوں، اس کا ساجھی کیسے ٹھہرا سکتا ہوں؟اس طرح انسان یہ دلیل گھڑ سکتا ہے کہ اگر ہمیں خدا کے بارے میں پتا ہی نہ ہو اور ہم کسی اور کی پرستش کرنے لگیں تو ہمیں شرک کا مجرم نہیں کہا جائے گا۔یہ ذرا پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے جواب کے کئی انداز ہو سکتے ہیں۔ہم صرف ایک بہت بنیادی جواب پر اکتفا کریں گے اور اس سلسلے میں الٰہیات کے جو نازک مسائل اُبھرتے ہیں ان سے گریز کیا جائے گا۔

اکثر مسلمان مفکرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ توحید کا علم انسان کا خاصہ ہے۔اگر وہ انسان ہے تو اسے توحید کا علم اپنی سرشت میں ملے گا۔یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے کیونکہ انسان ''لا الٰہ الا اللہ'' کے علم کے ساتھ خلق کیا گیا ہے۔انبیاء اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ انسان کو اس چیز کی یاد دلائیں جو وہ پہلے سے جانتا ہے۔پس وہ شخص جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے وہ نوعِ انسانی کی سب سے بنیادی جبلت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔یوں کہیے کہ یہ انسانی فطرت سے غداری ہے بلکہ ایک طرح سے ہستیِ انسانی کے دائرے سے خارج ہو جانے کے برابر ہے۔اسی سے یہ واضح

ہو گا کہ شرک اتنا بڑا گناہ کیوں ہے۔ یہ اس چیز کو الٹ دینے کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان انسان بنتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو توحید سے بے خبری کا دعویٰ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میں تو انسان ہی نہیں ہوں۔ اگلے جہان میں جنت انسانوں کی سرزمین ہے جبکہ جہنم اللہ کی مخلوق میں سے ان لوگوں کا ٹھکانہ ہے جن کا آغاز تو انسان کے طور پر ہوا تھا لیکن وہ اپنی انسانیت سے گر گئے اور انسان کی سطح تک اٹھ کر زندگی نہ گزار پائے۔

شرک کی بحث ہو تو ان چیزوں کی نوعیت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جن کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا جا سکتا ہے۔ یہ صرف اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی یا ہستیوں کی عبادت یا معاملہ نہیں ہے یا محض لفظی اور سطحی معنی میں بت پرستی کا ذکر نہیں ہے۔ یاد رہے کہ ''ھویٰ'' بھی ایک خدا ہے اور جو لوگ ''ھویٰ'' کے غلام ہوتے ہیں، ''ھویٰ'' کی پیروی کرتے ہیں وہ مشرک ہیں۔ پس اپنی ہی رائے اور اپنے احساسات کا اتباع بھی شرک کی ایک شکل قرار پائے گی۔ بہت سے علماء کی رائے مطابق یہ شرک کی بت پرستی سے بھی بری شکل ہے کیونکہ بت پرستی صاف اور سادہ چیز ہے لہٰذا اس پر قابو پانا اور اس کا علاج کرنا بھی نسبتاً آسان ہے۔ لیکن ہوا و ہوس کی بندگی سینوں میں چھپی رہتی ہے اور اکثر ایسے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو بظاہر بہت پارسا لگتے ہیں۔

شرکِ جلی یا واضح، کھلے شرک کا علاج یہ ہے کہ شریعت پر عمل کیا جائے۔ بالفاظِ دگر جب انسان اسلام کی پہلی جہت پر عمل کرتا ہے تو وہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کر رہا ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا عمل کا درست سمت اور درست نہج پر آ جاتا ہے۔ تاہم شرکِ خفی یا شرکِ پنہاں ''اسلام'' کے دائرے سے متعلق نہیں ہے، اس کا

تعلق ایمان اوراحسان سے ہے یعنی دین کی دوسری اور تیسری جہت سے۔اس کو پہچاننا اور اس کا مداوا کرنا کھلے شرک کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہے۔اب معاملہ صرف اتنا نہیں رہ جاتا کہ انسان بعض اعمال انجام دے کر"توحید" کی ظاہری صورت قائم کر لے بلکہ شرکِ خفی کے بچنے کے لیے انسان کو اپنے خیالات،فہم و افکار،رویے اور اخلاقی صفات،سب کو"توحید" کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ انہیں حکمِ خداوندی ہے کہ وہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کریں تاوقتیکہ وہ "لا الہ الا اللہ" کا اقرار نہ کر لیں۔اس زبانی اقرار سے وہ مسلمان معاشرے کے فرد بن جائیں گے۔اس معاشرے کا اچھا فرد بن کر دکھانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پانچ ارکانِ دین میں باقی ارکان پر بھی عمل پیرا ہوں۔ رسولِ خداؐ کا فرمان ہے کہ"نماز چھوڑ دینے سے آدمی شرک اور کفر میں جا پڑتا ہے۔"[۴] اس سے ایک مرتبہ پھر نماز کی بنیادی اہمیت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ لیکن نماز کی پابندی کرنا ایک ظاہری عمل ہے اور اس سے لازماً یہ پتا نہیں چلتا کہ انسان کے اندر کیا ہو رہا ہے۔لوگ باگ شرعی احکام پر عمل کر رہے ہوتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایمان ان کے دل میں اُتر چکا ہے۔کتنی ہی احادیث ایسی ہیں جن میں آنحضرتؐ نے لوگوں کے رویوں اور ان کی سوچ کے بارے میں تشویش کا اظہار فرمایا ہے۔آپؐ کے صحابہ میں سے ایک نے یوں روایت کی ہے کہ:

ہم آپس میں دجال کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ آنحضرتؐ اپنے گھر سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے۔آپؐ نے فرمایا،میں تمہیں ایک ایسی بات بتاؤں جو میرے لیے دجال سے زیادہ خوفناک ہے؟ اصحاب نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ فرمائیے۔آپ نے کہا:شرکِ خفی۔یا یہ کہ کوئی شخص نماز ادا کرے اور نماز کو

خوب سنوار کر پڑھے محض اس لیے کہ ان لوگوں کو دکھا سکے جو اسے نماز پڑھتے دیکھ رہے ہوں۔۵

ایک اور حدیث میں یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ عام مفہوم میں بت پرستی یا Paganism ایسی اصطلاحات ہیں جو اس مسئلے کی گرد کو بھی نہیں پہنچتیں جو شرک کے عنوان سے زیر بحث آتا ہے۔

مجھے اپنی امت کے لیے جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ ہے شرک۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سورج کی پوجا کرنے لگیں گے، یا چاند کی یا بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ وہ عمل کریں گے مگر ماسوی اللہ کے لیے اور چھپی ہوئی خواہشات سے۔۶

مختصراً یہ کہیے کہ مسلمانوں کی نظر میں خدا ہی وہ واحد ہستی ہے جو صحیح معنوں میں عبادت، اطاعت اور بندگی کے لائق ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا اصل فطرتِ انسانی کے بنیادی داعیے impulse سے غداری کے برابر ہے۔ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ انسان ایک سے زیادہ خداؤں کی پرستش کرے بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی خواہشات کا اتباع کرنے لگے یا ہدایتِ خداوندی سے کمتر کسی اور شے کی پیروی کرے۔

بادیٔ النظر میں ''توحید'' کا عملی اطلاق دیگر ہر شے سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ اس کا تعلق زندگی کے روزمرہ معمول سے ہے۔ اسی سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے عمل کا محرک کیا ہونا چاہیے اور یوں اس کا اسلام کی تیسری جہت ''احسان'' سے بہت قریبی ربط بن جاتا ہے۔ سارے غلط محرکات کی تہ میں ایک ہی چیز کام کر رہی ہوتی

ہے، یہ ایک کی جگہ دو یا دو سے زیادہ دیکھنے کا نام ہے جبکہ اصل میں وہ ایک ہی ہے۔ اس سے ہر نوع کی گمراہی، غلط کاری اور خسران جنم لیتا ہے۔

اگر توحید کا مطلب ہے صرف اللہ کی عبادت کرنا اور شرک دوسرے خداؤں کی پرستش کا نام ہے تو ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم اللہ کی عبادت کیونکر کریں اور دوسروں کی عبادت سے کیونکر بچیں۔ پہلا جواب ہوگا کہ ''اسلام'' اپنے محدود معانی میں یعنی احکاماتِ شریعت۔ لیکن شریعت کا اطلاق صرف عمل پر ہوتا ہے۔ محرکات، رویوں، فہم اور سوچ کے انداز کا کیا ہوگا؟ ان کو کیونکر تبدیل کیا جائے اور توحید سے ہم آہنگ کیا جائے؟ اس قبیل کے سوالات کا جواب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم یہ اچھی طرح وضاحت سے سمجھ لیں کہ جب ہم اللہ God کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے، ہم کس حقیقت کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ کتاب کے اس حصے کے باقی ماندہ صفحات میں ہم اس موضوع کو گفتگو کا ہدف بنائیں گے۔

## آیاتِ خداوندی

قرآن کلامِ خداوندی ہے، انسانوں سے اللہ کا خطاب ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اس کا اپنا اظہار ہے۔ ایسے ہی جیسے ہم بات کرتے ہیں تو اپنا اظہار وابلاغ کرتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ایک کردار ادا کر رہے ہوں لیکن یہ کردار بہر حال ہم نے خود اپنے لیے منتخب کیا ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کردار کو ہماری طرح ادا نہیں کرسکتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ کردار جو ہم ادا کر رہے ہیں اس سے بھی کسی حد تک ہماری ذات کا اظہار ہوتا ہے۔

جب مسلمان علماقرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہر سورۃ، ہر آیت، ہر لفظ اور ہر حرف کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنا آپ ان آیات میں کھول کر بیان کر رہا ہو۔قرآن میں کوئی چیز بھی بے اہمیت نہیں کیونکہ جب خدا کلام کرتا ہے تو وہ اس امر سے کاملاً آگاہ ہے کہ وہ انسانوں سے کیا کہہ رہا ہے۔انسانوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ہوسکتا ہے ہمیں یہ آگہی میسر نہ ہو کہ ہمارے الفاظ کیا کہہ رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہماری طرح بے خبر اور غافل نہیں ہے۔پس اسے ٹھیک معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔انسان اپنی اپنی بساط اور ہمت کے مطابق اس کے کلام کو سمجھ لیتے ہیں۔اسلام میں مذہب کے، دین کے معنی ہی آخرالامر یہ ہیں کہ قرآن کو سمجھا جائے اور اس کے پیغام کو اپنی روزمرہ زندگی میں ایک مجسم صورت میں ڈھال دیا جائے۔

قرآن نوعِ انسانی کو اللہ کی خبر دیتا ہے کیونکہ یہ اللہ کا وہ بامعنی اور ارادی کلام ہے جو انسان کو خطاب کرتا ہے۔قرآن میں کی ہر شے اللہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی نشانی ہے، اس کا پتا دیتی ہے۔اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن مجید نے اپنے فقروں اور الفاظ کو ''آیات'' (نشانیاں) کہہ کر کیوں یاد کیا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ

(۲:۹۹)

اور ہم نے تیری طرف واضح اور روشن دلیلیں اُتاریں ہیں۔ان سے وہی منکر ہوں گے جو بے حکم فاسق ہیں۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۱۰:۱)

یہ آیات ہیں پکی کتاب کی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا

(۱۲:۱-۲)

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی۔ہم نے اس کو اُتارا ہے قرآن عربی زبان کا۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا اظہار و بیان ہے تاہم صرف یہی ایک بیان نہیں۔ دیگر صحائف بھی اس کا بیان کرتے ہیں اور اس کی مخلوق بھی یہی کام انجام دیتی ہے۔ قرآن مجید نے ''آیت'' کا لفظ تقریباً چار سو مقامات پر استعمال کیا ہے۔اس کے بالکل عمومی معنی تو اس چیز کے ہوتے ہیں جو دوسری کسی چیز کی خبر دیتی ہو۔ذرا زیادہ خاص معنوں میں اس لفظ سے مراد ہے زمین و آسمان کی ہر شے بحیثیت اللہ کی نشانی کے۔ ہر شے اللہ کا پتا دیتی ہے۔کیونکہ ہر شے ''مسلم'' ہے، اپنے وجود میں اللہ کے حکم کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے ہمیں عالم خلق میں، اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کی خبر دیتا ہے۔اللہ کی نشانیاں صرف عالمِ فطرت یا تاریخی واقعات ہی میں نہیں ہیں، یہ نشانیاں ہمارے اندر بھی پائی جاتی ہیں:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ (۱۷:۱۲)

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (۳۶:۳۳)

اور مردہ زمین بھی ان کے لیے نشانی ہے کہ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس میں سے دانہ اُگایا کہ اسی کو یہ کھاتے ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ (۳۰:۲۲)

اور زمین وآسمان کا بنانا بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے اور تمہاری بھانت بھانت کی بولیاں اور رنگوں کا اختلاف۔

وَمِنْ اٰیٰتِہِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ (۴۲:۳۲)

اور اس کی ایک نشانی ہے سمندر میں چلنے والے جہاز، جیسے نشانِ راہ۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۔ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ (۲۱-۵۱:۲۰)

اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی۔ کیا تم دیکھتے نہیں؟

قرآن مجید میں ''آیت'' کا لفظ اس سے محدود تر معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ان مقامات پر آیت کا لفظ ان معجزات اور الہامی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آیا ہے جو انبیاء کو اس بات کے ثبوت اور دلیل کے طور پر دیے گئے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام بر ہیں، پیغامات خداوندی لے کر آئے ہیں۔ آیاتِ خداوندی کے ذریعے اللہ کے پیغمبر انسانوں کو تاریخ کی معنویت سے آگاہ کرتے ہیں۔ اگر سب انبیاء اور ان کے ماننے والے ''مسلم'' ہیں تو سب انبیاء کا عمل، ان کا کارِ نبوت اللہ کی حکمت اور قدرت کی خبر دیتا ہے، یہ حکمت و قدرتِ خداوندی کی نشانی ہے:

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ۔ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰیَۃٍ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (۱۵۴-۲۶:۱۵۳)

بولے، ضرور تم پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔تم ہم ایسے ہی ایک آدمی ہی ہو۔سو اگر سچے ہو تو کوئی نشانی لے کر آ ؤ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ

اور ہم نے موسیٰ کو فرعون اور اس کے سرداروں

اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا ئِہٖ (۹۷-۹۶:۱۱)

کے پاس اپنی نشانیاں ایک واضح سند کے ساتھ بھیجا۔

فَلَمَّا جَآءَ ھُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی (۲۸:۳۶)

پھر جب موسیٰ ان کے پاس ہماری کھلی نشانیاں لے کر پہنچے تو وہ بولے، اور کچھ نہیں یہ جادو گھڑ لیا ہے۔

لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِہٖٓ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ (۱۲:۷)

بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں کی سرگذشت میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان سب مفاہیم کے علاوہ قرآن مجید اپنے الفاظ کو بھی آیات کہتا ہے اور اس سے یہ اصطلاح ہر سورت کے ذیلی اجزاء کے عنوان کے طور پر استعمال ہونے لگی ہے۔

مختصر یہ کہ ''آیت'' (نشانی-Sign) کے لفظ کا اطلاق کسی بھی چیز پر ہوسکتا ہے۔ہر شے ایک نشانی ہے کیونکہ ہر شے اللہ کی مخلوق ہے۔کائنات کی ہر شے آیتِ خداوندی (آیۃ اللہ) ہے۔یہ الگ بات ہے کہ جدید سیاسی حوادث کی وجہ سے یہ خاص اصطلاح ایک اور انداز میں زبان زدِ عام ہوگئی ہے اور اب اسے بعض علماء کے

لقب کے طور پر برتا جانے لگا ہے۔ ورنہ اصطلاحی معنی میں تو شیطان بھی اللہ کی ایک نشانی ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس کا عمل بھی عالمِ تخلیق میں حکمتِ خدواندی کو ظاہر کرتا ہے۔

اہم بات یہ ہے ''آیت'' کی اصطلاح پر گفتگو مکمل کرنے سے پہلے اس لفظ میں مضمر بعض نکات کھول کر بیان کر دیئے جائیں۔ آیت یا نشانی اس لیے ہوتی ہے کہ انسان اسے پڑھ سکے۔ ہم نشانیاں اسی وقت مقرر کرتے ہیں یا اشارے اسی لیے کرتے ہیں کہ ہمیں ایک پیغام دینا ہوتا ہے۔ قرآن میں اس اصطلاح کا تین مفاہیم یا تین معنوں میں استعمال ہمیں اسلام کی ایک گہری معنویت سے باخبر کرتا ہے اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جو مسلمانوں کے لیے اس قدر بدیہی ہے کہ اگر غیر مسلم اسے فوری طور پر گرفت میں لانے سے قاصر رہ جائیں تو مسلمان اکثر اس پر حیرت کرتے ہیں۔ سارا عالمِ طبعی اور الہامی صحیفے ہم سے براہِ راست کلام کرتے ہیں اور ان کا ایک خاص پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس پیغام کو پڑھیں اور پھر اس کے مطابق مناسب عمل کریں۔ قرآن میں اللہ کی نشانیوں کا ذکر آتا ہے تو اس کے بعد عموماً اختتام ان کلمات پر ہوتا ہے کہ ''لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ '' (شاید تم سمجھو) ''اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ '(کیا تم کو عقل نہیں) ''لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ'' (تا کہ تم سوچو) ''اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ'' (کیا تم سوچتے نہیں) ''اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'' (کیا تم دیکھتے نہیں) ''لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ'' (تا کہ تم یاددہانی حاصل کرو)۔ انسان کا بدترین عمل یہ ہے کہ وہ اس پیغام کو نظر انداز کر دے جو اس کی نگاہوں کے سامنے ہر سو پھیلا ہوا ہے، توحید کا پیغام:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا

وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ (١٢: ١٠٥-٦)

اور زمین و آسمان میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ ہو کر گزرتے ہیں اور ان پر دھیان نہیں کرتے اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھرائے ہوئے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا (٣٢: ٢٢)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی باتوں سے یاددہانی کروائی جائے اور پھر وہ اس سے منہ موڑ جائے۔

## تعبیرِ آیات

آیاتِ خداوندی سے تاریخ کے دائرے میں اللہ کی خبر ملتی ہے۔ آیاتِ خداوندی کی دو بنیادی قسمیں ہیں۔ آیاتِ نبوت اور آیاتِ طبیعت یا رسولوں کی لائی ہوئی نشانیاں اور عالمِ طبعی میں موجود نشانیاں۔ آیاتِ نبوت کو زبانی یا تحریری نشانیوں (مذہبی صحیفے) اور جسمانی طبیعی نشانیوں یعنی معجزات میں بانٹا جا سکتا ہے۔ آیاتِ طبیعی کو بھی دو قسموں مین بانٹا جا سکتا ہے، خارجی نشانیاں جیسے ہمارے گردو پیش کی دنیا کی نشانیاں خواہ وہ سماجی ہوں یا عالمِ طبعی میں پائی جائیں اور داخلی نشانیاں جو ہمارے اندر کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ آیاتِ نبوت میں سے کچھ پر ہم آگے چل کر اس وقت گفتگو کریں گے جب نبوت کی بحث آئے گی۔ خارجی اور داخلی نشانیوں پر بھی تفصیل سے غور کیا جائے گا جب ہم انسان اور کائنات کے باہمی رشتے پر بحث کریں گے۔ سرِ دست ہم صرف ایک سوال اٹھانا چاہتے ہیں: آیاتِ خداوندی سے

ہمیں ''اللہ'' کے لفظ کے فہم میں کیا مدد ملتی ہے؟

آیات یا نشانیوں کی تعریف ہی یہ ہے کہ آیت، آیتِ خداوندی ہی ہوتی ہے۔ اگر ہم آیاتِ خداوندی کو سمجھ لیں تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی ہمارے فہم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ کی نشانیوں کو سمجھنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ ہم عالمِ طبعی پر نظر ڈالیں اور اس کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک لحاظ سے یہی وہ کام ہے جو جدید سائنس کرتی ہے۔ سائنس عالمِ طبعی اور اس کائنات کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تاہم سائنس میں حقیقت کی ماہیت کے بارے میں بعض مفروضات کام کر رہے ہیں اور اسی لیے وہ خدا کو معرضِ بحث سے خارج کر دیتی ہے کیونکہ اس کی نظر میں سائنسی معاملات ایک الگ چیز ہیں اور خدا کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں۔ عالمِ طبعی کے بارے میں روایتی اسلامی نقطۂ نظر اور جدید سائنس کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مسلمان اس ایمان کے ساتھ آغاز کرتے ہیں کہ ''لا الہ الا اللہ''۔ مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو پتا ہوتا ہے کہ یہ آیات اور نشانیاں جو ہیں وہ اللہ کی نشانیاں ہیں لیکن انہیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام، اس کا خطاب ان سے کیا ہے۔ سائنسدانوں کا احساس یہ ہے کہ عالمِ طبعی کے مظاہر کو سمجھنے کے عمل کا اس سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دو یکسر مختلف نقطۂ نظر وجود میں آ جاتے ہیں جن کے درمیان فاصلہ ختم کر کے انہیں ایک دوسرے کے قریب لانا آسان نہیں رہتا۔

بات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کے بجائے ہم ایک تمثیل کے ذریعے اسلامی اور سائنسی اندازِ فکر کے فرق کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تصویر کو بہت سے لوگ دیکھ رہے ہیں، مثلاً مائیکل انجلو کی تصویر کو۔ اور یہ سمجھنے کے لیے کوشاں

ہیں کہ مصور نے کیا کہا ہے۔تصویر میں چھپے ہوئے پیغام کی تعبیر پر لوگوں کی آراء مختلف ہیں لیکن ایک نکتے پر سبھی متفق ہیں کہ تصویر میں اہم ترین بات یہ ہے کہ مصور نے اس کے وسیلے کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔دوسری طرف ہم اس تصویر کا مطالعہ بیسیوں سائنسی علوم میں سے کسی ایک کے نقطۂ نظر سے بھی کر سکتے ہیں۔کینوس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے،آب ورنگ کو جانچا جا سکتا ہے،پینٹ پر غور ہوسکتا ہے،تصویر میں دکھائے گئے مختلف اجزاء کے درمیان جو اقلیدسی ربط ہے اس کا جائزہ لیا جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ان سب کاموں کے لیے طبیعیات،کیمیا،حیاتیات،جیومیٹری اور دیگر سائنسی علوم کا استعمال کرنا ہوگا۔اسی کام کے لیے کچھ اور علوم کا زاویۂ نگاہ بھی برتا جا سکتا ہے،مثلاً سماجیات،تاریخ اور نفسیات کیونکہ ان شعبوں میں جدید سائنسی علم کو درست اور حتمی تسلیم کر کے بات کی جاتی ہے۔یہ سب ٹھیک،درست ہے اور کسی شے پر اس انداز سے نظر کرنے اور اسلامی تناظر کے مطابق اس پر غور کرنے میں اس لحاظ سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔اب فرض کیجیے کہ سائنسدانوں کا ایک گروہ یہ دعویٰ کرنے چلے کہ یہ تصویر خود بخود وجود میں آ گئی تھی۔اس کا کوئی مصور نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس کا مقصد اس تصویر سے کسی چیز کا اظہار کرنا نہیں تھا۔وہ تو بس کینوس پر بے تکے رنگ بکھیر رہا تھا۔اور اگر اس کا کوئی پیغام،اس کی تصویر کشی کا کوئی مقصد رہا بھی تھا تو ہمارے پاس اسے سمجھنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کے لیے ''توحید'' کا ثبوت ہی یہ ہے کہ اشیائے کائنات ایک خاص ڈھنگ سے پائی جاتی ہیں ایسے ہی جیسے اکثر لوگوں کے لیے تصویر کا وجود ہی مصور اور اس کے پیغام کا ثبوت ہے۔جس طرح ہر باہوش اور عقل والے آدمی کے لیے یہ ایک بدیہی چیز ہے کہ عجائب گھر میں آویزاں تصاویر کا کوئی خالق تھا اسی طرح

روایتی مسلمانوں کے لیے یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کی ہے، اس کے لیے انہیں کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس فطری بصیرت کو بسا اوقات ''بوڑھی عورتوں کا دین'' کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ اس سے اس نقطۂ نظر کی تحقیر مقصود نہیں ہے صرف یہ بتانا درکار ہے کہ اتنا بے عقل کوئی بھی نہیں ہوتا کہ اس سامنے کی بات کو سمجھ نہ پائے۔ 'بوڑھی عورتوں کا دین'' کے الفاظ ایک قصے سے ماخوذ ہیں جو رسولِ خداؐ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

ایک روز رسول اللہؐ اپنے چند اصحاب کے ہمراہ بستی میں سے گزر رہے تھے۔ آپؐ کی ملاقات ایک ضعیف اور بوڑھی عورت سے ہوئی جو چرخے پر بیٹھی اون کات کر دھاگہ بنا رہی تھی۔ آپؐ نے اسے سلام کیا اور اسے بات چیت کرنے لگے۔ آپؐ نے پوچھا کہ تم اللہ پر ایمان رکھتی ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیوں؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ ایک چرخہ تک تو گھومتا نہیں جب تک کہ اسے گھمانے والا ہاتھ نہ ہو تو پھر ان آسمانوں کو حرکت دینے والا بھی تو ہوگا جبھی تو یہ گردش میں ہیں۔ آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ کی طرف دیکھ کر فرمایا ''تم میں بوڑھی عورتوں ایسا ایمان ہونا چاہیے''۔ ے

سوال یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کی نشانیوں سے انسان کتنا سیکھ سکتا ہے؟ کئی ادیان میں یہ فلسفے اور الٰہیات کا دائمی سوال رہا ہے اور اس سے ایک اور سوال جڑا ہوا ہے کہ انسان کو اللہ کی طرف سے وحی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ مسلمانوں کی عمومی رائے یہی ہے کہ آیاتِ خداوندی کے فہم کے لیے اللہ کی مدد ضروری ہے۔ انبیاء کی لائی ہوئی ہدایت کے بغیر آیاتِ خداوندی کو پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے زبان جانے بغیر کسی کی بات سمجھنے کی کوشش کرنا یا سرے سے نطق و گویائی کی شناخت نہ رکھتے ہوئے

بھی کلامِ انسانی کو سمجھنے کی سعی کرنا۔

کائنات، خدا اور انسان کے علم کے بارے میں مسلمانوں کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان جاہل ہے۔ کتنے ہی بھید اور گتھیاں ایسی ہیں جو انسانی عقل کبھی سلجھا نہیں سکے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سمجھنے کی کوشش ہی ترک کر دے۔ بے خبری اور بے علمی کا کسی حد تک درماں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس درماں طلبی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ انسان انبیاء کی بات پر کان دھرے بالخصوص یہ جانا جائے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، خدا کی نشانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو کہا گیا ہے اسے سمجھنے کا مطلب ہے وہ سب جان لینا جو اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے بارے میں بتا رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ کا ایک پیغام ہے: اسے قرآن کہتے ہیں۔ سیدنا محمدؐ یہ پیغام لے کر آئے ہیں۔ یہ پیغام ہم سے کیا کہتا ہے، یہ جاننا ہو تو اسے پڑھنا ہو گا، سمجھنا ہو گا۔ اس پیغام کا موضوع ہے ''توحید'' یہ بات ہم عرض کر چکے ہیں۔

عمومی تبصرہ اگر کسی حد تک مفید ہو سکتا ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ جن مغربی اہلِ علم نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے تاریخ کے سیاق و سباق میں، تاریخی حوالے سے اس کی معنویت کی تلاش کی۔ قرآن کے پس منظر میں موجود یہودیت اور نصرانیت کا جائزہ لیا، سماجی تانے بانے اور رشتوں پر نظر کی، اقتصادی معاملات دیکھے اور زبان و بیان کے مسائل کو پرکھا۔ ان کا احساس یہ رہا ہے کہ اگر رسول خدا کی ذات اور ابتدائی مسلمانوں کے گرد و پیش پھیلے ہوئے سماجی اور تاریخ حالات دریافت کر لیے جائیں تو یہ ایک بنیادی اہمیت کی چیز ہو گی۔ جس آیت میں کوئی

تاریخی واقعہ مذکور ہوا ہے اس واقعے کے حوالے ہی سے سمجھنا چاہیے۔

شرح و تعبیر کے اس جدید مغربی اندازِ نظر کے بعض اجزاء ایسے ہیں جو مسلمانوں میں بہت شروع کے زمانے سے معروف رہے ہیں اور مغربی اہلِ علم اکثر اوقات اپنے پیشرو مسلمان مصنفین ہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے ہیں۔ تاہم اسلام کے روایتی نقطۂ نظر اور اس مغربی طرزِ فکر میں ایک بہت بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی نگاہ میں کسی آیت کی تاریخی معنویت جان لینے سے اس کے معانی ختم نہیں ہو جاتے۔ اگر ان کو یہ دلیل دی جائے کہ قرآن کو تاریخی واقعات کے حوالے سے سمجھنا چاہیے تو مسلمان مفسرین یہ جواب دیں گے کہ تاریخ کے واقعات تو خود اللہ کی نشانیاں ہیں اس لیے ان کی معنویت عام واقعاتی سطح سے بالاتر ہے۔ تاریخی حالات کو آپ کیونکر سمجھ سکتے ہیں اگر آپ یہ نہ جان پائے کہ ان واقعات سے ''توحید'' کے بارے میں کیا پیغام ملتا ہے؟ مذہبی کتابوں میں پائی جانے والی آیاتِ خداوندی اور عالمِ طبعی میں اللہ کی نشانیوں میں فرق یہ ہے کہ کتابی آیات ہم سے کھلے، واضح انداز میں اور الفاظ میں یہ کہہ دیتی ہیں کہ یہ اللہ کا پیغام ہے۔ تاہم تاریخ کی نشانیوں میں چھپا ہوا پیامِ ربانی انسان کو اس وقت تک سمجھ نہیں آ سکتا جب تک وہ مذہبی صحیفوں کی آیاتِ خداوندی کا فہم نہ حاصل کر لے۔

کتابِ خداوندی کی آیات اور تاریخی نشانیوں کی تفسیر و تعبیر کے سلسلے میں روایتی اسلامی طرزِ فکر اور جدید اندازِ نظر ایک بات پر متفق ہیں۔ دونوں کے نزدیک یہ طے ہے کہ تاریخ میں ایک معنی ہیں اور تاریخ کا یہ مفہوم تب سمجھ آتا ہے جب ہم یہ جان لیں کہ جو ہوا اس کے اسباب کیا تھے۔ جدید مذہبی طرزِ فکر میں اسباب و علل کا یہ سلسلہ ''نیچے سے اوپر'' کو حرکت کرتا ہے اور اس کے مطابق، خدا،

دین، معاشرہ، سماج، انسان اور تاریخ وغیرہ سب تصورات کے معنی ان عناصرِ ترکیبی میں تلاش کرتا ہوں گے جن سے مل کر ان تصورات کی تشکیل ہوئی ہے۔ یہ عناصرِ ترکیبی طبعی بھی ہو سکتے ہیں، ماحول سے متعلق بھی اور سماجی، نفسیاتی یا اقتصادی بھی۔ اس کے برعکس اسلامی طرزِ فکر ''اوپر سے نیچے'' کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس کا آغاز ''توحید'' سے ہوتا ہے اور پھر توحید کی بنیاد پر یہ ہر دوسری شے کو اللہ سے جوڑ کر، اس کے حوالے سے اپنی جگہ پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شے کے ''معنی'' کو اس کی ''معنویت'' میں تلاش کیا جاتا ہے۔ The meaning of a thing is found in its sign ificance.

ہر شے ایک نشانی ہے اور نشانی اللہ کا پتا دیتی ہے۔

مسلمانوں کو اس بات سے انکار نہیں ہے کہ تاریخی عناصر اہم ہوتے ہیں۔ خود قرآن نے ان کی اہمیت واضح کی ہے۔ جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو ''اپنی قوم کی زبان میں'' کلام کرتے ہوئے بھیجا۔ (بلسان قومہ)۸ تو اس سے خاص طور پر اس تصور کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جو پیغامِ ربانی کسی قوم پر نازل کیا جاتا ہے وہ اس کے ثقافتی، تاریخی اور لسانی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہ کر ہم اس امر کا بھی اثبات کرتے ہیں کہ یہ سب پیامِ خداوندی ہیں۔ خدا ان تنزیلات میں انسان سے کلام کر رہا ہے، عربی میں یا عبرانی، سنسکرت یا چینی زبان میں اور انسان اس پیغام کا مخاطب ہے، یہ پیغام سن رہا ہے۔ ایک طرف یہ رائے ہے اور دوسری طرف یہ نقطۂ نظر کہ زبان انسان کی ایجاد ہے اور جیسے اس نے زبان گھڑی اسی طرح خدا بھی گھڑ لیا۔

آیاتِ خداوندی کی شرح و تعبیر کا روایتی اسلامی نقطۂ نظر اور ان آیاتِ خدا

وندی کو تاریخ کے حوالے سے سمجھنے کے مختلف جدید انداز ایک دوسرے سے الگ ہیں۔اس چیز کو اختصار سے کہنے میں یہ خطرہ ہے کہ بات کچھ پامال سی ہو جائے گی تاہم اسے انجیل کے اس قول کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو رسول خداؐ نے بھی فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا۔'' 9 مسلمان علماء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کو جس سے انسان کا رشتہ ناطہ بنتا ہے حقیقتِ ربانی کے حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ اسی حقیقت سے فطرتِ انسانی کا تعین ہوتا ہے۔جدید اہلِ علم نے اس قول کو الٹ دیا ہے۔ان کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے ان کے لیے خدا اس معاملے میں کوئی فعال عملی کردار نہیں ہے بلکہ ان کے خیال میں خدا ایسی چیز ہے جسے خود انسان نے گھڑ لیا ہے۔آج کے اہلِ علم کی نظر میں ''انسانوں نے خدا کو اپنی صورت پر خلق کیا ہے۔'' اسی لیے تاریخِ عالم میں مذہبی عقیدہ و عمل کا جو بے شمار تنوع ہمیں نظر آتا ہے اس کی توجیہ جدید اہلِ علم یہ کرتے ہیں کہ چونکہ مذہب انسان کی خود ساختہ چیز ہے لہٰذا اس میں اتنی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔

اسلام نے ماہیتِ اشیاء کو کس طرح پیش کیا ہے،اس کی منطقی ترتیب کیا ہے، یہ اگر جاننا ہو تو آج کے جدید آدمی کو ایک نکتہ ذہن میں رکھنا لازم ہے اور وہ یہ کہ مسلمان کے لیے ہر شے کا آغاز اللہ تعالیٰ سے ہے اور پھر معاملہ نیچے کی طرف سفر کرتا ہے۔ہم لوگوں کے لیے (عام طور پر) ہر شے کا آغاز انسان سے ہوتا ہے اور پھر بات اوپر کی جانب چلتی ہے (بلکہ یوں کہیے کہ ہر سمت بکھر کر رہ جاتی ہے)

آج کے جدید ذہنی پس منظر میں تو اوپر نیچے، بالا و پست کے الفاظ بھی الجھن سے خالی نہیں ہیں کیونکہ اس کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی پیمانہ استعمال کرنا پڑتا ہے جس

کے مطابق اوپر نیچے کی سمت کا فیصلہ ہو سکے اور ایسے کسی پیانے پر ہمارے زمانے کے لوگ آسانی سے متفق نہیں ہوتے۔

## اسمائے الٰہیہ

قارئین پر اب یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ خدا کا ایک کام چلاؤ تصور اسلام جیسے دین سے انصاف کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گا کیونکہ اس دین میں اس کا اپنا ایک تصورِ خدا ہے اور یہ ایک حتمی اور مطلق مرکزی حیثیت رکھتا ہے جس سے ہر دوسری شے کو جانچا جاتا ہے۔مسلمان خدا کو کیا سمجھتے ہیں، یہ جاننا ہو تو قرآن کی جانب لوٹنا چاہیے۔

قرآن چونکہ خود اللہ کا کلام ہے لہٰذا اس میں جو کچھ ہے وہ اسی کا اظہار ہے جیسے ہماری کہی ہوئی ہر بات، خواہ کسی کا قول ہی کیوں نہ دہرایا گیا ہو، یہ بتاتی ہے کہ ہم کون ہیں۔لیکن جس چیز کو اللہ کی طرف سے اپنا اظہارِ ذات کہا گیا ہے اسے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مضبوط نقطۂ آغاز ہونا چاہیے جس سے ہم اپنا جائزہ شروع کر سکیں۔سب سے سامنے کی چیز دین کا رکنِ اوّل یعنی کلمۂ شہادت ہے، ''اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔''

یہ لفظ ''اللہ'' جو ہے اس سے مراد کس قسم کی ہستی ہے؟ اسلام نے اس سوال کا عام طور پر جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو وہ دیکھا جائے جو قرآن مجید نے ہمیں ''کھلے لفظوں'' میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بتایا ہے (اس لیے کہ یوں تو اس کی کہی ہوئی ہر بات کسی نہ کسی داخلی قرینے سے اللہ ہی کے بارے میں ہوتی ہے) اس ضمن میں قرآن کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔

قرآن اللہ کے بارے میں کیا کہتا ہے، یہ جاننے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ بس اسے پڑھنا شروع کر دیجیے۔ لیکن ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس سلسلے میں جدید انسان کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں اور یہ راستہ اس کے لیے آسان نہیں ہے۔ یہ کام اس کے لیے سہل یوں بنایا جا سکتا ہے اگر ہم اسلامی الہیات میں پائے جانے والے بعض مسلمہ بنیادی تصورات کی مدد سے اس کے لیے ان باتوں کی ایک درجہ بندی کر دیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہی گئی ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو معانی سے معمور ہے۔ اس کی گہرائی بے پایاں ہے اور یہ صدیوں سے لاتعداد فلسفیوں، متکلمین اور علمائے الہیات، فقہا، شعراء اور اہلِ فن کے لیے منبعِ فیض رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شعبۂ زندگی سے متعلق انسانوں پر اس کے جو اثرات رہے ہیں ان کا تو یہاں مذکور ہی نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ہم قرآن کی کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ہم کسی بھی موضوع پر جو کچھ بھی کہیں گے وہ ہمیشہ ابتدائی نوعیت کا اور ایک نقشے خاکے کا اسیر رہے گا۔ قرآن کے متن کو دیکھیے اور تاریخ کے منظر نامے پر جس طرح ارتقاء ہوتا ہے اسے دیکھیے تو معاملہ بہت زیادہ پیچیدہ نظر آئے گا۔ یہ حرفِ اعتذار ذہن میں رکھ کر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنی تعلیمات کو ''اسماء الحسنٰی'' میں سمو دیا ہے۔ ''الحسنٰی'' کا لفظ ''حسن'' کا صیغۂ تفضیل ہے جس کا مطلب ہے ''بھلا، خوب صورت، حسین۔''

اللہ تعالیٰ کے ناموں کو ''سب سے حسین'' (الحسنٰی) کہنے سے قرآن کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے، خیر ہے اس لیے اس کے نام جن سے اس نے خود کو موسوم کیا ہے وہ بھی اچھے اور حسین ہیں کیونکہ ان میں جمالِ خداوندی کا اظہار

ہوتا ہے اور چونکہ اللہ کی رحمت، خیر اور جمال اس کی مخلوق سے بے انتہا بڑھی ہوئی ہے اس لیے اس کے اسماء کا جمال بھی ہر دوسری شے کے نام سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

ایک معروف حدیث میں رسولِ خدا نے فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں''۔ اسلام کی علمی روایت میں ۹۹ اسمائے خداوندی کے بارے میں لکھی جانے والی کتب نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کتابوں میں مصنفین میں سے کئی حضرات نے ذکر کیا ہے کہ ۹۹ کے عدد کو لفظی معنی میں نہیں لینا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کی کوئی فہرست بہ ہر لحاظ جامع اور مستند نہیں ہے۔ خود قرآن میں آپ ۹۹ سے زیادہ نام شمار کر سکتے ہیں۔ ان قرآنی الفاظ میں سے کون سا نام اسمائے حسنیٰ میں سے ایک قرار دیا جائے گا یہ فیصلہ کچھ اہم دینی مضمرات رکھتا ہے۔ بہر کیف اس نکتے پر کسی کو اختلاف نہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام مذکور ہیں۔ قرآن میں اکثر آنے والے اسمائے خداوندی میں الرحمٰن، الرحیم، العلیم، الحی، القدیر، الخالق، الغفار، الودود شامل ہیں یاد رہے کہ یہ نام ذاتی نام نہیں ہیں جیسے مشتری یا شیوا۔ اللہ تعالیٰ کے کوئی ذاتی نام نہیں ہیں سوائے شاید ''اللہ'' کے۔ ہم نے ''شاید'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اسلام کی دینی فکر میں یہ مسئلہ اس انداز میں اٹھایا نہیں گیا۔

مسلم علمائے الٰہیات میں سے بہت سے حضرات کی رائے ہے کہ ''اللہ'' ایک اسمِ عَلَم ہے جو خدا تعالیٰ نے اپنے لیے اختیار کیا ہے لیکن انگریزی کے لفظ Personal کا صحیح مترادف ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اسمِ عَلَم کے طور پر ''اللہ'' کے لفظ کے کوئی مخصوص معنی نہیں ہیں جیسا کہ ''لندن'' کے لفظ کے کوئی خاص

معنی نہیں ہیں کہ ہم کہ سکیں کہ لندن نام کے ہر شہر کی چند متعین صفات ہوتی ہیں۔ بعض دیگر علماء نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ "اللہ" کے نام کو کئی مختلف بنیادی لفظوں سے ماخوذ مانا جائے۔ اس طرح انہوں نے اس کے کئی معنی مقرر کیے ہیں۔ اگر یہ رائے تسلیم کی جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ" بھی العلیم، الرحمٰن اور القدیر کے مانند ایک نام ہوگا۔ مثال کے طور پر بعض علماء کی رائے ہے کہ "اللہ" کا لفظ "الٰہ" سے نکلا ہے اور اس کا مطلب ہے "ال الٰہ" The God۔ دیگر علماء کی رائے اس سے مختلف ہے۔ جدید ماہرینِ لغت عام طور پر یہی رائے درست قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ صرف علم لغت کا مسئلہ نہیں ہے، اس کے الٰہیاتی اور فکری مضمرات بھی سامنے رہنا چاہئیں۔ یہ نکتہ مدِنظر رہے تو اس بات کی بھی سمجھ آجائے گی کہ بہت سے مسلمان مصنفین نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کیوں کیا ہے جو جدید اہلِ قلم کی رائے میں مسلّم اور بدیہی ہیں۔

جن ادیان میں تعددِ الٰہ کا تصور مروج ہے ان کے ہاں عموماً ہر خدا یا دیوی دیوتا کی ایک شخصیت یا چہرہ ہوتا ہے جو ایک یا ایک سے زیادہ صفات کو جسمانی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہندو دیو مالا میں برھما، وشنو، شیو، کے اعمال اور تصرفات دکھائے گئے ہیں اور ان کا بیان اس انداز میں ہوا ہے گویا کہ یہ دیوتا الگ الگ شخصیات ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہندو یہ بھی اکثر کہتے ہیں کہ برھما "خالق" ہے، وشنو "حفاظت کرنے والا (الحفیظ)" ہے اور شیو "مارنے والا (الممیت)" ہے۔ پھر انہی سب خداؤں کی دیگر صفات بھی ہیں جو ان میں اور دوسرے خداؤں میں اکثر مشترک ہوتی ہیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے جو نام آئے ہیں ان کا اسلام کے تصورِ کائنات میں

ایک کردار ہے اور اسلام کے تناظر میں ان کی جو حیثیت ہے وہ کچھ اعتبار سے اس کردار سے مشابہ ہے جو خدایانِ متعدد ان ادیان میں ادا کرتے ہیں جہاں تعددِ الٰہ کا تصور پایا جاتا ہے لیکن ان میں اور اسلام میں ایک اہم اور بنیادی فرق ہے کہ ہمارے ہاں اسمائے خداوندی کو کبھی بھی شخصیات نہیں بنایا جاتا نہ ان کو جداگانہ ہستیوں کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہاں پر اسم ایک صفت کو، ایک وصف کو ظاہر کرتا ہے، کسی محسوس مادی چیز کو نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام میں خدا کو کبھی بھی ''باپ'' یا ''آسمان'' کہہ کر نہیں پکارا جاتا یا ''سورج'' یا ''چاند'' کبھی نہیں کہا جاتا۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے جو نام سب سے زیادہ concrete معلوم ہوتا ہے وہ غالباً ''المِلک'' (king، بادشاہ) ہے۔ لیکن دوسرے اسمائے خداوندی کی طرح اس نام میں بھی یہ مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی ٹھوس یا مادی شکل میں تصور نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ حقیقت ہے جس میں صفاتِ شاہی اس درجے تک پائی جاتی ہیں کہ اور کسی ہستی کو اس نام سے موسوم کرنا زیبا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ''المِلک'' ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ساری قدرت، اختیار اور سروری اسی کی ہے اور سلاطین ارضی، صدارتیں کرنے والے اور استبدادی حکمران اللہ کی قدرت اور اس کی بادشاہی کے مقابلے میں بس چند مٹے مٹے نقوش کہے جا سکتے ہیں۔

''توحید'' کا مطلب ہے کہ وہ صفات جو اللہ تعالیٰ کے اسماء سے متعلق ہیں وہ صحیح معنوں میں، حقیقت میں صرف اللہ کی صفات ہیں اور مخلوقات میں اگر یہ پائی جاتی ہیں تو ثانوی اور مجازی طور پر۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ کلمۂ توحید میں آپ چاہیں تو کوئی بھی اسمِ خداوندی رکھ کر پڑھ سکتے ہیں۔ ''لا الٰہ الا اللہ'' میں اسم

''الرحمٰن'' رکھیے تو یوں ہوگا کہ ''لا رحمٰن الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی رحمٰن نہیں)

یوں پہلا کلمۂ شہادت ایک ایسا کلمہ بن جاتا ہے جسے آپ فی الفور ''توحید'' کے مختلف معانی و مضمرات بیان کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ ''الرحمٰن'' ہیں تو ''الرحمٰن'' کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ خدا ''ہر وہ شے ہے جسے عبادت، عقیدت یا اطاعت کا موضوع و مرکز بنایا جائے''۔ ''الرحمٰن'' منبعِ رحمت ہے یعنی، خیر، محبت، شفقت اور دوسروں پر مہربانی۔ الرحمٰن ہدفِ عبادت ہے، معبود ہے مرکز اطاعت ہے کیونکہ ہر شے کو اپنی بقا کے لیے رحمت کی احتیاج ہے۔ رحمت کے بغیر ہمیں خیر و خوبی نصیب ہوگی نہ شفقت نہ محبت۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہم ہست سے نیست ہو جائیں گے کہ ہماری ہستی خود ایک عطائے خداوندی ہے جس پر سپاس گذاری واجب ہے۔ سو کلمۂ شہادت ہمیں بتاتا ہے کہ رحمت ساری کی ساری ایک عطیہ ہے ''الرحمٰن'' کا۔ ''لا الہ الا الرحمٰن'' کا مطلب ہے ''لا رحمۃ الا رحمۃ الرحمٰن'' (الرحمٰن کی رحمت کے سوا اور کوئی رحمت نہیں) یا ''لا رحمٰن الا الرحمٰن'' (رحمت والا اگر کوئی ہے تو صرف الرحمٰن)۔ رحمتِ خداوندی اس کائنات کی ہر رحمت پر سایہ فگن ہے۔ اس کی رحمت سچی رحمت ہے۔ دوسری سب رحمت بس نام کی رحمت ہے۔ درجِ ذیل حدیث میں رسول خدا نے یہی بات فرمائی ہے۔

جس روز اللہ تعالیٰ نے ارض و سماء کو خلق کیا، اس روز اس نے سو رحمتیں بھی تخلیق کیں۔ ان میں ہر رحمت زمین و آسمان کو بھر سکتی تھی۔ ان میں سے ایک رحمت کو اللہ تعالیٰ نے دنیائے ارضی کے لیے رکھا۔ اسی رحمت سے ماں اپنے بچے کی طرف جھکتی ہے اور چرند پرند ایک دوسرے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ قیامت کا دن آن لگے گا

تو وہ اس ایک رحمت کو باقی رحمتوں سے مکمل کر دے گا۔؎

اللہ تعالیٰ ''الحمید'' (لائقِ تعریف، قابلِ ستائش) ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن مجید کی پہلی آیت ''الحمدللہ'' (تعریف اللہ ہی کے لیے ہے)۔ اس دنیا میں جو کچھ تعریف کے لائق ہے وہی کچھ ہے جو، اچھا، سچا اور مناسب وموزوں ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر وہ شے جو حقیقی ہے یعنی ہر وہ شے جو حقیقت کے مطابق ہے۔ اور حقیقت خود اللہ تعالیٰ ہے جو خیر و رحمت ہے، صاحبِ جمال ہے، لائق حمد ہے۔ ''الحمدللہ'' کہنے کا مطلب ہے کہ ''الحمید'' کا نام صرف اللہ ہی کے لیے زیبا ہے۔

اللہ تعالیٰ ''العلیم'' ہے۔ ''لا الہ الا العلیم''۔ ہر علم ''العلیم'' ہی سے آتا ہے۔ کسی کو کوئی علم نہیں سوائے ''العلیم'' کے۔ علم اگر ہے تو اللہ ہی کا۔ علمِ انسانی سارے کا سارا بس نادانی کے درجات کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ ''القوی'' ہے، قوت والا ہے۔ ''لا قوی الا القوی'' (قوت والا اگر کوئی ہے تو فقط ''القوی'')۔ اللہ تعالیٰ کی لامحدود و بے انتہا قوت کے سامنے ہر جسمانی، دنیاوی، سیاسی اور کائناتی قوت ہیچ ہے۔

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۲:۱۶۵)

سارا زور اور اختیار اللہ ہی کا ہے۔

لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۸:۳۹)

کچھ زور نہیں مگر جو اللہ نے دیا۔

رسول خدا ؐ نے یہی بات ان کلمات میں فرمائی ہے جو مسلمانوں میں زبان زدِ عام ہیں۔

”لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الۡعَلِی الۡعَظِیۡم“

(کوئی زور اور قوت نہیں، ہاں مگر وہ جو اللہ علی وعظیم کی دی ہوئی ہو)!!

اللہ تعالیٰ ”الخالق“ ہے۔ ”لا خالق الا اللّٰہ“ اللہ کے سوا اور کوئی خلق نہیں کرتا۔ قرآن مجید نے اسے ایک استفہامیہ فقرے کی شکل دی ہے اور یہ پوچھا ہے کہ

هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَيۡرُ اللّٰهِ (۳۵:۳)

اللہ کے سوا ہے کوئی اور بنانے والا؟

اللہ تعالیٰ ”الباقی“ ہے۔ ”لا باقی الا اللہ“ (اللہ کے سوا سب فانی ہے)۔

كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ (۲۸:۸۸)

ہر شے فنا ہے، سوائے اللہ کی ذات کے۔

كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ

(۵۵:۲۶-۲۷)

روئے زمین پر جو کوئی ہے ختم ہو جانے والا ہے، اور تیرے رب کی بزرگی اور عظمت والی ذات باقی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ ”الغنی“ ہے۔ ”لا غنی الا اللّٰہ“ زمین و آسمان کی ہر چیز اپنی ہستی اور اپنی بقا کے لیے سراسر اللہ کی محتاج ہے۔

یا ایھا النّاس انتم الفقراء الی اللّٰہ ۚ واللّٰہ ھو الغنی الحمید (۳۵:۱۵)

لوگو! تمہی اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ وہی ہے بے نیاز سب خوبیوں سے سراہا

گیا۔

اللہ تعالیٰ ''مالک الملک'' ہے۔(۳:۲۶) (بادشاہی کا مالک)۔ ہر شے کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور کسی شے کا کوئی اور مالک نہیں۔

لِلّٰہِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرضِ (۵:۱۷) (۳:۱۸۹)

اللہ ہی کی ہے سلطنت زمین و آسمان کی۔

لَم یَکُنْ لَہٗ شَرِیكٌ فِي الْمُلْك(۱۷:۱۱۱)

سلطنت میں اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

تَبَارَكَ الَّذِی بِیَدِهِ الْمُلْكُ وهُو علی کُلِّ شَيْئٍ قَدِیر(۱۷:۱۱۱)

بڑی برکت ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہے راج اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اسی طرح ہم ننانوے اسمائے خداوندی کا ذکر کر سکتے ہیں لیکن اس کے بجائے ہم صرف ایک اور اسمِ خداوندی کی وضاحت کر کے بات مکمل کرنا چاہیں گے۔ یہ اسمِ خداوندی دیگر اسمائے کے مقابلے میں توحید کے مفہوم کو ایک اعتبار سے زیادہ وضاحت اور سہولت سے بیان کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ نام ''الحق'' ہے۔ اللہ تعالیٰ ''الحق'' ہے۔ ''لاحق الا الحق'' الحق کے سوا اور کوئی شے حقیقی نہیں۔ اللہ کے سوا ہر شے، بے حقیقت، فانی، گزراں، مٹ جانے والی، سراب آسا اور نیست و ہیچ ہے۔ خلاصہ یہ کہ اشیاء کی ہر صفت، ہر خاصیت جس کا کوئی مثبت پہلو ہے اللہ تعالیٰ کی کسی صفت سے ماخوذ ہے اور اسی کی

وجہ سے اپنا وجود رکھتی ہے۔ ہر اچھی، قابلِ تعریف، بقا رکھنے والی اور حقیقی شے اللہ ہی کی ہے۔اسی لیے ''الحمدللہ'' تعریف اللہ ہی کے لیے، کسی اور کو زیبا نہیں۔

کائنات یا عالَم کو عموماً ''ماسوی اللہ'' (اللہ کے سوا ہر شے) کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔ پہلا کلمۂ شہادت یہ بتاتا ہے کہ کائنات بے حقیقت ہے۔ تجزیہ کرتے جائیے تو آخر میں یہ نکلے گا کہ الحق کے مقابلے میں یہ محض لاشی ہے۔لیکن یہ نقطۂ نظر لاشیئیت Nihilism کی طرف نہیں لے جاتا۔ لاشیئیت کا تصور یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہماری ہستی کی نوعیت اگر نیستی کی ہے، اگر یہ ایک سراب، ایک فریب ہے تو اس سے ایک بے معنویت اور یاسیت کا احساس ابھرنا چاہیے۔لیکن 'توحید' ہمارے لیے اعتماد، ایمان اور خوشی کا راستہ کھول دیتی ہے۔

اگر یہ دنیا اور خود ہم بھی غیر حقیقی ہیں تو اس بات کو کیا کہیے گا کہ ہم نہ صرف اس لمحۂ موجود میں جی رہے ہیں بلکہ اپنی بے حقیقتی اور بے ثباتی کی آگہی بھی رکھتے ہیں۔ ''ہم بے حقیقت ہیں، غیر حقیقی ہیں'' یہ کہتے ہوئے ان الفاظ کا کہنے والا غیر حقیقی کیونکر ہوسکتا ہے؟ ہمارا اپنا آپ، ہمارا کلام و گویائی اور ہماری فہم، ہمارا علم کوئی نہ کوئی حقیقت تو رکھتا ہوگا ورنہ نفسِ انسانی نہ یہ سمجھ سکے گا اور نہ اس بات کو کہہ سکے گا کہ وہ بے حقیقت ہے۔پس دنیا کی بے حقیقتی میں بھی ایک طرح کی حقیقت ضرور ہے۔اگر دنیا سرے سے غیر حقیقی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہم سے خطاب کرنے، انسان سے کلام کرنے کی زحمت ہی کیوں کیا کرتا؟ ہاں یہ ہے کہ دنیا میں جو بھی حقیقت پائی جاتی ہے وہ نہ ہماری ہے نہ اس دنیا کی۔ حقیقت اللہ کی ہے۔ ''الحمدللہ''۔ ہم بطور ''ہم'' بے حقیقت ہیں لیکن جس حد تک اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحمت اور کرم کیا ہے اسی قدر ہم اس رحمت و کرم کے نتیجے کے طور پر حقیقی ہیں۔

اس الجھن کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ کی حقیقت تو حقیقتِ مطلقہ ہے لیکن ہماری حقیقت ایک اضافی حقیقت ہے۔اللہ کی حقیقت دائمی اور غیر متغیر ہے، وہ پیمانہ جس سے ہر دوسری چیز کو جانچا جاتا ہے۔دیگر تمام حقیقتیں حقیقتِ خداوندی کے عمل سے وجود میں آتی ہیں پس اللہ کے سوا ہر شے کو صرف اللہ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے،ان کی حقیقت اضافی حقیقت ہے۔لا الہ الا اللہ کا مطلب ہے ماسوٰی اللہ کو، اللہ کے علاوہ ہر شے کو اللہ کے حوالے سے سمجھا جانا چاہیے۔

ہر چیز کو سمجھنے کا حتمی اور آخری حوالہ ذاتِ خداوندی ہے۔کسی شے پر غور کرتے ہوئے اگر اس نسبت اور اس حوالے کو فراموش کر دیا جائے تو پھر یہ ہوگا کہ ہم اس شے کو صرف اس جیسی دوسری غیر حقیقی اشیاء کے حوالے سے سمجھ سکیں گے۔ہمارا علم، غیر حقیقی، غیر یقینی، متغیر اور بے اعتبار رہ جائے گا۔ہم شک، تذبذب اور حیرانی میں پڑے رہ جائیں گے۔انسان کو یقینی علم تبھی میسر ہوگا جب وہ اس حتمی حوالے کا، اس نقطۂ مطلقہ کا ادراک حاصل کر لیں گے اور اس کا دارومدار ہے "توحید" پر۔"توحید" سے ایک اور عہدِ وفا، ایک تعلق استوار ہوتا ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔یہاں آ کر ہم ایک مرتبہ پھر علم اور ایمان کی یکجائی اور مطابقت کے روبرو ہو جاتے ہیں۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ قرآن مجید کی دوسری سورت کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (۲:۲)

یہ کتاب الٰہی ہے اس میں کچھ شک نہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شک اور تردد صرف ''توحید'' سے دور ہوتا ہے جس سے انسان اس امر کی شناخت تک پہنچتا ہے کہ ہر ممکنہ صفت اپنی نہاد میں، اپنی اصل و اساس میں حقیقتِ مطلقہ سے منسلک ہے اور اسی سے اپنی حقیقت پاتی ہے۔

## کلام

خدا اپنی آیات، کلام کے ذریعے سے ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ مسلمان قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کو کلامِ خداوندی سمجھتے ہیں۔ اس کلام کے الفاظ اور جملوں کو آیات کہا جاتا ہے۔ تاہم جس طرح خدا کلام کے ذریعے سے کتابی آیات نازل کرتا ہے، اسی طرح کلام ہی کے ذریعے سے آسمانی اور زمینی آیات بھی ظاہر کرتا ہے۔ انجیلِ عبرانی میں اللہ تعالیٰ نے کلام ہی سے تخلیق کی ابتداء کی ہے اور آفرینش کے لیے کہا: ''روشن ہو جا!'' بہت سے مسلمان علماء کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ تخلیق کا پورا سلسلہ اللہ کے کلام پر چل رہا ہے۔

قرآن کی کئی آیات ہیں جن میں اللہ کے کلام یا کلمات کا ذکر آتا ہے مثلاً یہ آیت دیکھیے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ م بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۳۱:۲۷)

زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ قلم ہوں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ، اس کی روشنائی ہوں تب بھی اللہ کے کلمات ربا تیں ختم نہ ہو پائیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے حکمتوں والا۔

پہلی نظر میں لگتا ہے کہ یہ آیت خدا کی کتاب کا بیان کر رہی ہے، لیکن بیشتر مفسرین اس کو اللہ کی تخلیقی قوت سے متعلق سمجھتے ہیں۔ ہر شے کلمہ ''کن'' سے وجود میں آتی ہے۔ اللہ کہتا ہے: ''ہو جا'' اور وہ موجود ہو جاتی ہے۔ پس ہر مخلوق ایک کلمہ ہے...... خدا کا کلمہ...... خدا کی تخلیقی قوت لامتناہی ہے، لہٰذا اس کی مخلوقات کے وجود میں آنے کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تخلیق بذریعۂ کلام کے قرآنی مضمون کو سند بنا کر کئی مسلمان مفکرین خدا اور کائنات کے تعلق کو سمجھنے کے لیے کلام کی تمثیل کو ایک ذریعے کے طور پر کام میں لاتے ہیں۔ انسانی کلام، الوہی کلام ہی کی ایک نشانی ہے۔ ہم لفظ کیسے ایجاد کرتے ہیں؟ خدا مخلوقات کو اسی طرح پیدا کرتا ہے۔

ہم گفتگو کرتے ہیں تو اس امر کا آغاز بہر حال کچھ کہنے کی نیت اور ارادے سے ہوتا ہے، چاہے وہ نیت اور ارادہ خود ہم پر واضح نہ ہو۔ گفتگو کا عمل غیر ارادی نہیں ہوتا...... حتیٰ کہ اضطراری بول بھی کسی نہ کسی اندرونی احساس یا خیال، جیسے حیرت یا دُکھ کا اظہار ہوتے ہیں۔ ہم کسی خیال کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، سو بول پڑتے ہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ ہم انسان ہیں، ہر طرح کے نقائص میں گرفتار انسان، اس لیے ہماری زبان سے نکلنے والے لفظ بھی اکثر اُدھورے اور بے تکے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو کہنا چاہتے ہیں، کہہ نہیں پاتے۔ البتہ خدا کا معاملہ دوسرا ہے۔ ہمارے حدود و قیود اس پر وارد نہیں ہوتے۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے، کہہ دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اس کے کلمات کو لازماً سمجھ بھی لیتے ہیں۔ قرآن لوگوں سے بار بار کہتا ہے کہ اللہ کی بات تک پہنچنے کے لیے آیاتِ ربانی میں غور و فکر کرتے رہیں۔ اللہ کا کلام بالکل واضح اور روشن ہے مگر سننے والے ایسے نہیں کہ سنتے ہی پوری

بات سمجھ جائیں۔

انسانی کلام کو مثال بنا کر گفتگو کو اور آگے بڑھائیں تو ہمیں اس میں اور خدا کے کلام میں کئی دلچسپ مماثلتیں ملتی ہیں۔ مثلاً: لفظ اور اس کے بولنے والے میں کیا نسبت ہے؟ یقیناً لفظ وہ نہیں ہے جو اس کا متکلم ہے۔ لفظ تو پل بھر کے لیے ہوتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ اپنے متکلم سے بالکل ہی الگ ہو، کیونکہ متکلم سے منقطع ہو کر تو کلام وجود ہی نہیں پکڑ سکتا۔ الفاظ اپنے وجود کے لیے مکمل طور پر متکلم کے محتاج ہیں۔ خدا کی تمام مخلوقات کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی ہستی بھی (ابدیت کے نقطۂ نظر سے) بس ایک لمحے کی ہے، اور یہ بھی اپنے وجود کے لیے سرتاسر خدا کے محتاج ہیں۔ خدا ایک کلمہ کہتا ہے جو ممکن ہے کہ ہمیں صدیوں پر محیط لگتا ہو، مگر اللہ کے نظر میں تمام چیزوں کا نظامِ ہست و بود یہ ہے کہ:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸:۸۸)

ہر شے فنا ہے، سوائے اس کی ذات کے۔

الٰہیات کے بعض علماء کائنات کو ایک کتاب کی طرح سمجھتے ہیں جسے خدا نے تحریر کیا ہے۔ یہاں کی ہر شے ایک حرف ہے۔ حروف مل کر لفظ بن جاتے ہیں۔ پرندے، پھول، پتھر اور درخت، یہ سب حروف سے تشکیل پانے والے الفاظ ہی تو ہیں۔ مختلف لفظوں میں حرف یکساں ہو سکتے ہیں۔ مگر ان کا باہمی درو بست اتنا متنوع ہے کہ ان سے بننے والے الفاظ ایک سے نہیں ہوتے۔ ہم سر، دُم، بازو، ٹانگ، دل اور جگر کو ''حرف'' کہہ سکتے ہیں۔ بیشتر جانور انہی حروف سے بنے ہیں، لیکن ان کی ترتیب میں اختلاف کی وجہ سے جانور آپس میں مختلف ہیں۔ اسی طرح نباتات اور معدنیات بھی ''الفاظ'' ہیں مگر ان کے ''حروف'' حیوانات سے یکسر مختلف

ہیں۔

حروف کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ انہیں ایک دوسرے سے جوڑا جائے تو وہ الفاظ بن جاتے ہیں، بامعنی الفاظ۔ تاہم کسی عبارت کے سیاق وسباق میں رکھ کر نہ دیکھا جائے تو لفظ بھی حقیقتاً بے معنی ہی ہوتے ہیں۔ سیاق وسباق سے ہٹ کر ہم کسی لفظ کے بارے میں پورے یقین نہیں کہ سکتے کہ اس کا یہ مطلب ہے، اور اگر ہم کوئی جملہ بنانا چاہتے ہیں، یعنی کسی بامعنی اظہار کے خواہاں ہیں تو پھر ہم یہ نہیں کر سکتے کہ اِدھر اُدھر سے کچھ لفظ اٹھا کر انہیں بلا سوچے سمجھے جوڑتے چلے جائیں۔ اللہ کے تخلیقی اور تکوینی کلمات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ مثلاً: ہاتھی لہسن اور چیونٹی یہ خدا کے بولے ہوئے لفظ ہیں لیکن انہیں طبعی دنیا کے سیاق وسباق سے کاٹ دیا جائے تو ان کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

کائنات بطور کتاب کی تمثیل کو بڑھاتے ہوئے ہم کہ سکتے ہیں کہ ہر جملے کو کسی باب یا سورت میں ہونا چاہیے۔ سورت کا لفظی مطلب، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، احاطہ ہے۔ کتابِ کائنات کی سورتیں ایسی ہی ہیں جیسے ہماری کائنات میں پائی جانے والی دنیائیں۔ تاہم ہر دنیا دوسری دنیاؤں کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق اور نسبت ضرور رکھتی ہے۔ جدید علم الافلاک کی اصطلاح میں تمام ستارے اور کہکشائیں باہمی تعلق رکھتے ہیں، چاہے اس تعلق کی کارفرمائی اور اس کی واقعی نوعیت کے بارے میں کسی یقینی بات تک نہ پہنچ سکیں۔ اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر عالم اسی حد تک کوئی معنویت رکھتا ہے جس حد تک وہ اپنے اردگرد کے عالموں سے مربوط اور متعلق ہے، خواہ زمانی طور پر یا مکانی سطح پر۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اسلامی کونیات میں ایک طرف تو ہماری دنیا ان بے شمار دنیاؤں میں سے ایک ہے جو زمانِ

واحد میں موجود ہیں، اور دوسری جہت سے یہ اس سلسلے کی کوئی کڑی ہے جس میں دنیائیں ایک کے بعد ایک کرکے آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ ہماری دنیا کے پورے معنی اسی صورت میں سمجھے جا سکتے ہیں جب ہم یہ جان لیں کہ دوسری دنیاؤں میں اس کی جگہ کیا ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی باب کی ساری معنویت اس کتاب پر منحصر ہوتی ہے، جس کا وہ ایک جزو ہے۔

مختصر یہ کہ مسلمان کائنات کو بھی کتابِ خداوندی کہتے ہیں ہیں کیونکہ ان کے بقول یہ بھی ایک مجموعۂ آیات ہے جو اللہ کے پیغام پر مشتمل ہے۔ لیکن ہمیں بہر حال اس قابل ہونا چاہیے کہ اس پیغام کو سمجھنے کے لیے، آیات کو پوری کتاب کے سیاق و سباق میں دیکھ سکیں۔ اللہ کی اس کتاب کا مرکزی موضوع بلاشبہ توحید ہے۔ یعنی یہ اقرار اور اعلان کہ اللہ ہی وہ یکتا و یگانہ حقیقت ہے جو کائناتِ ظاہر کی اصل ہے۔

## ذات وصفات

مسلمانوں کے پاس، قرآن کے بتائے ہوئے اسمائے الٰہیہ کی صورت میں، حقیقت کی ماہیت پر غور و فکر کا ایسا سامان موجود ہے جو ختم نہیں ہو سکتا۔ ان کے ہاں اسمائے الٰہیہ کی بحث کسی مجرد اور غیر متعلق کاوش سے جنم نہیں لیتی جس کو حقیقی دنیا سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس، اسمائے خداوندی کی نشانیاں ہمارے تمام افعال و احوال میں ظاہر ہیں۔ اگر کائنات اور ہمارا وجود، محض اللہ کی نشانیوں کی جلوہ گاہ ہے تو پھر ظاہر ہے کہ یہ نشانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ کون ہے یا اس کے نام کیا ہیں!

چونکہ اسمائے الٰہیہ اوصاف و خصائص کی تعیین و تصریح کرتے ہیں، لہٰذا ان کا حوالہ

صفات کے طور پر بھی دیا جاتا ہے۔ اللہ جود و کرم کی صفات رکھتا ہے، اس لیے الکریم اور العدل اس کے دو نام ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زید سخی اور عادل ہے۔ ان دو باتوں میں فرق یہ ہے کہ خدا کی نسبت سے یہ صفات مطلق ہیں، جبکہ زید کے معاملے میں اضافی۔ اللہ کو سخی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی سخی نہیں، اور نہ ہی کوئی سخی کہلانے کا حقیقی استحقاق رکھتا ہے۔ لیکن زید کو سخی کہنے کا بس یہ مطلب ہے کہ وہ اکثر لوگوں سے زیادہ سخی ہے۔ اس بات کا مثال کے طور پر یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ زید ایک فارغ شخص ہے اور اسے دوسروں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے، حالانکہ بیشتر لوگ دوسروں پر اس قدر توجہ صرف کرنے پہ راضی نہیں ہوتے۔

ہم اللہ کے بارے میں جو کچھ جان سکتے ہیں، اسے اچھی طرح واضح کرنے کی غرض سے مسلمان علما نے مختلف عنوانات کے تحت اسمائے خداوندی کی متعدد درجہ بندیاں کیں۔ مثال کے طور پر، ان اسماء کو تین مجموعوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مجموعہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ کیا نہیں ہے، دوسرے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا ہے، اور تیسرے سے یہ معلوم ہوتا ہے وہ کائنات سے کیسے متعلق ہے (یعنی کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے) انہیں اللہ کے ذاتی، صفاتی اور افعالی اسماء کہا جا سکتا ہے۔

ذاتِ شے، حقیقتِ شے ہے، اس کی سب سے گہری اساس جس سے وہ پہچانی جاتی ہے، اور وہ جو کچھ بھی ہے، اسی کی بنیاد پر ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ گائے کی ذات کیا ہے؟ اگر اس مسئلے پر غور کیا جائے تو ہم ایک واضح اور محکم بات تک پہنچ سکتے ہیں جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گائے کے لیے وہ کون سی چیز مطلقاً ضروری ہے جس کی بنیاد پر وہ گائے ہے، گھوڑا یا گدھا نہیں۔

یہی سوال خدا کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے۔خدا کی ذاتِ حقیقی کیا ہے؟ خدا کی حقیقتِ اصلی کیا ہے جس نے اسے کسی اور چیز کی بجائے خدا بنایا ہے یا جس کی بدولت خدا کائنات کی ہر شے سے الگ ہے؟ اس کا ایک عمومی جواب یہ ہے کہ خدا کسی شے سے مماثلت نہیں رکھتا۔جبکہ کائنات کی تمام اشیاء کسی نہ کسی سے مشابہ ہیں۔وہ خاصہ جس کی وجہ سے خدا ہر چیز سے ممتاز اور منفرد ہے، ٹھیک سے بیان کیا جائے تو یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء سے مطلقاً اور قطعاً الگ ہے۔ ہر لحاظ سے ہر اعتبار سے۔لیکن انسان، مثال کے طور پر، گایوں، گدھوں اور دیگر حیوانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔بعض پہلوؤں سے ان میں معدنیات کے خواص بھی پائے جاتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز انسانوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کی مشابہت ضرور رکھتی ہے۔ زیادہ واضح اور صحیح لفظوں میں کہا جائے تو ہر چیز کسی نہ کسی لحاظ سے دوسری چیز سے مشابہ ہے۔ایک خدا ہی ہے جو تمام چیزوں سے الگ ہے۔چنانچہ ہم کہ سکتے ہیں کہ اس کی ذاتی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شے سے مماثلت نہیں رکھتا۔مختصر یہ کہ

لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٌ (٤٢: ١١)

اس جیسی کوئی شے نہیں۔

ذات الٰہیہ وہی ہے جو وہ ہے اور وہ وہ نہیں ہے جو دوسری تمام چیزیں ہیں۔مگر وہ ٹھیک ٹھیک ہے کیا؟ وہ کوئی متعین شے نہیں ہے، ورنہ دوسری متعین چیزوں کی طرح کا ہو جائے گا۔لیکن کوئی شے خدا کی مثل نہیں ہے۔

اس طرح کی گفتگو ہمیشہ کسی قدر الجھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔کیونکہ یہ ایک پیچیدہ طریقہ ہے یہ بتانے کا کہ ہم نہیں جان سکتے کہ خدا کیا ہے، کیسا ہے، لیکن جب ہم خدا کی ذات کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب

ہوتا ہے کہ ہم اپنے جہل کا علم رکھتے ہیں۔ اور پھر ذاتِ خداوندی کے بارے میں ہم جان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ کوئی چیز اس کی طرح نہیں۔ ہم چیزوں کو ان کی مماثلتوں سے جانتے ہیں۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی سے مماثلت نہیں رکھتیں، تو ہم جان لیں گے کہ ہم انہیں نہیں جانتے۔ تاہم یہ جہل خود ایک معرفت ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے ہم توحید کا ایک بنیادی مفہوم سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ کا مطلب ہے: ''خدا کے علم کے سوا کوئی علم نہیں'' اور ''حقیقی علم خدا کے سوا کسی کے پاس نہیں'' مسلمان علماء نے یہی بات اس طرح کہی ہے: ''لا یعلمہ الا اللہ'' (اللہ کو کوئی نہیں جانتا مگر خود اللہ)۔

لوگوں کا یہ جان لینا کہ وہ کچھ نہیں جانتے، مسلمانوں کی علمی اصطلاح میں جہلِ بسیط (سادہ لاعلمی) کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس اپنی لاعلمی کا علم نہ رکھنا جہلِ مرکب (دہری جہالت) ہے۔ خدا کے بارے میں جہلِ مرکب میں مبتلا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کیا ہے۔ جو شخص اپنے لیے یہ گمان رکھتا ہے، وہ لا الہ الا اللہ کے بنیادی نکتے سے بے خبر ہے، اور اپنی اس بے خبری کی وجہ سے دائرہ انسانیت سے باہر کھڑا ہے۔ اس لیے، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، اکثر مسلمانوں کے لیے ان لوگوں سے متفق ہونا آسان ہے جو صاف کہتے ہیں کہ ہم خدا کو نہیں مانتے۔ کیونکہ ان لوگوں سے اگر صرف اتنا ہی پوچھ لیا جائے کہ اس انکار کا کیا مطلب ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ایسے لوگ خدا کی ماہیت کا ایک واضح اور قطعی تصور رکھتے ہیں، اور یہ تصور بہر حال (مسلمانوں کے لیے بھی) ناقابلِ قبول ہے۔

ہم نے اپنی گفتگو کا آغاز یہاں سے کیا تھا کہ کچھ نام ایسے ہیں جو ذاتِ خداوندی کے تسمیے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں

کہ خدا کیا نہیں ہے۔ چونکہ انسانوں کو خدا کی ذات اثباتی اصطلاحات میں نہیں سمجھائی جاسکتی، اس لیے سلبی اور منفی اسماء لوگوں پر ان کی اپنی محدودیت واضح کرتے ہیں۔ سلبی نام کی ایک مثال 'قدوس' ہے، جس کا ترجمہ عام طور سے، پاک اور مقدس (holy) کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ان تمام عیوب و نقائص سے ماورا ہے جو مخلوقات کے لیے تصور کیے جاسکتے ہیں۔ ایک اور سلبی نام 'سُبّوح' (glorified) ہے یعنی وہ ذات جس کی تسبیح کی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، خدا کی پاکیزگی، بزرگی وعظمت اور ماورائیت (تنزیہ) ایسی ہے کہ وہ مخلوق کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ خدا کا ایک ذاتی نام 'سلام' بھی ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ ہر قسم کے عیب اور عدمِ توازن، اور ہر طرح کے جنگ وجدال سے پاک ہے۔ اسی طرح ایک سلبی اسم اور بھی ہے: 'غنی' (بے نیاز اور بے پروا)۔ خدا، کائنات کی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ان تمام احتیاجات سے ماورا ہے جن سے مخلوقات کی طبیعت اور ان کی تنگ دامانی اجاگر ہوتی ہے۔

اسمائے ذات اگر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ''خدا کیا نہیں ہے'' تو اسمائے صفات سے یہ علم میسر آتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی حقیقت تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، تاہم ہمارے لیے یہ جاننا ممکن ہے کہ کس طرح کی صفات کو اس نے اپنی آیات کے ذریعے ہم پر منکشف کرنا پسند کیا ہے۔ اس بات میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ خدا کو جاننا ممکن بھی ہے اور محال بھی۔ یہی بات کسی انسان کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص مثلاً ایوب، زندہ ہے اور علم، ارادہ، طاقت، بصارت اور سماعت سے بہرہ ور ہے۔ خوب! لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ ساری باتیں ایوب کی انفرادیت یا اس کی حقیقت کا کتنا علم فراہم کرتی ہیں؟ کیا ان

اوصاف کی فہرست دیکھ کر خود ایوب بھی مطمئن ہو جائے گا کہ ہم نے اس کے بارے میں، جیسا کہ وہ حقیقتاً ہے، تمام ضروری امور کی نشاندہی کر دی ہے؟

انسان کی ایک مثال ایوب ہے، ذرا پھر دیکھیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی بنیاد پر نوعِ انسانی کی حقیقی اور جامع و مانع تعریف متعین کی جا سکتی ہے؟ ایک زمانے میں بشریات کے ماہرین ہمیں یہ بتایا کرتے تھے کہ انسان ایک اوزار گر حیوان ہے۔ لیکن یہ ایک ادھوری اور ان گھڑ تعریف ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کو تیار نہیں ہوگا کہ ''ٹھیک ہے! میں اوزار بنانے والا حیوان ہوں اور بس۔ اس کے علاوہ میں جو کچھ ہوں، وہ آپ کو مبارک۔ میں تو اب اوزار ہی گھڑتا رہوں گا۔ میرا خاندان، میرے دکھ اور الجھنیں، میری محبتیں اور نفرتیں سب بیکار ہیں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ انھیں آپ رکھ لیں۔'' ظاہر ہے کہ ہم چاہیں بھی تو اپنی ان نامطلوب چیزوں کو اس طرح لٹا نہیں سکتے۔ اور اس سب کے بعد بھی ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا ہیں۔ اگر آپ خوب توجہ سے کام لیں تو کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ آپ پر خود اپنی ہستی کے نئے نئے پہلو نہ کھلتے ہوں۔

مختصر یہ کہ ہم کسی شخص کے بارے میں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ فلاں یہ ہے یا وہ ہے۔ لیکن ہم کچھ بھی کہہ لیں، اس شخص کی حقیقت کو بتمام و کمال بیان نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح یہ کہنا کہ خدا یہ ہے یا وہ ہے، اس کی حقیقت کا پورا اظہار نہیں ہے، بلکہ یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ خدا لامحدود، لامتناہی اور مطلقاً حقیقی ہے اور اس کے حقیقی ہونے کی کوئی حد نہیں۔ ہم جو محض اضافی طور پر حقیقی ہیں، اس کے بارے میں تھوڑا ہی جان سکتے ہیں۔ ہم حقیقت کو اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں جتنا کہ ہم خود حقیقی ہیں۔ یہاں یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ ہم کتنے حقیقی ہیں۔ توحید، اسی سوال کا

جواب ہے۔

انسانی علم کی نارسائیاں سائنسی میدان میں بھی واضح ہیں۔ مسلسل نت نئے انکشافاف کے باوجود، چند ہی لوگ ہوں گے جو واقعی اس خیال میں ہوں کہ کائنات تقریباً سمجھ میں آ چکی ہے۔ نسلِ انسانی نے ابھی زمین کی سطح اور اس کی تہوں میں موجود ان گنت مظاہر کا بھی احاطہ نہیں کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم خود اپنے سیارے یا اپنی کہکشاں یا کائنات میں پائی جانے والی کھربوں کہکشاؤں کا واقعی علم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ سائنسی حدود میں جتنا کچھ معلوم ہو سکتا ہے، اس کے مقابلے میں اس علم کو جو انسان نے اب تک حاصل کیا ہے، نرا جہل ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جہاں تک خدا کا تعلق ہے، ''کوئی شے اس جیسی نہیں ہے''۔ کل کائنات کا علم بھی خدا کو سمجھنے میں لازماً ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

اجمالاً یوں سمجھ لیں کہ صفاتی نام وہ نام ہیں جو کم از کم انسانی فہم کی عملی اغراض کے لیے اتنی صراحت کر دیتے ہیں کہ خدا کیا ہے۔ وہ اوصاف جن سے ابھی ہم نے ایوب کو موسوم کیا، خدا کے صفاتی نام بھی ہیں: الحی (زندہ)، العلیم (علم والا)، المرید (ارادہ رکھنے والا)، القوی (طاقت و قوت والا)، السمیع (سننے والا)، البصیر (دیکھنے والا)۔ یہاں بھی وہی بات ہے کہ خدا اور ایوب میں فرق یہ ہے کہ خدا کی صفات حقیقی ہیں، جبکہ ایوب کے اوصاف، حقیقت کی ایک مدہم سی چھوٹ سے زیادہ نہیں ہیں۔ انسانی زندگی کوئی حقیقی زندگی نہیں ہے، کیونکہ یہ دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن حیاتِ خداوندی ازلی ابدی ہے۔ پس، ''کوئی شے اس جیسی نہیں'' کا اصول خدا کے اسمائے صفات کے بارے میں بھی وارد ہوتا ہے۔ خدا زندہ ہے! یہ کہتے ہوئے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ اس کی زندگی نہ صرف یہ کہ ہماری زندگی کی

طرح نہیں ہے، بلکہ زندگی کی کسی بھی ایسی قسم سے مشابہت نہیں رکھتی جو ہمارے فہم و ادراک میں آسکتی ہو۔

اسمائے خداوندی کی ایک تیسری قسم بھی ہے جسے اسمائے افعال (Names of Acts) کہا جاسکتا ہے۔ افعال، خدا کی مخلوق یا اس کی فعالیت کے نتائج ہیں۔ دو چیزیں اسمائے افعال کی پہچان ہیں: (۱) انہیں صرف مخلوقات کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے اور (۲) یہ اپنا متضاد بھی رکھتے ہیں جو خود ایک اسمِ خداوندی ہوتا ہے۔ مثلاً: المحیی (زندگی دینے والا) اور الممیت (موت دینے والا)، المعز (عزت دینے والا) اور المذل (ذلت دینے والا)، العفو (معاف کرنے والا) اور المنتقم (انتقام لینے والا)۔

اسمائے صفات کے معاملے میں مخلوق سے ان کی نسبت فرض کرنا ضروری نہیں۔ خدا زندہ ہے، لیکن اس کی زندگی یہ تقاضا نہیں کرتی کہ کسی اور کو بھی زندہ ہونا چاہیے۔ خدا علیم ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے جاننے کے لیے ایک کائنات بھی ہونی چاہیے۔ (اس معنیٰ میں تو) شاید وہ خود ہی کو جانتا ہے۔ مزید براں، کسی صفاتی نام کی ضد کو خدا کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ وہ مردہ نہیں ہے، نہ جاہل ہے۔

دوسری طرف خدا کے فعلی نام مخلوق کے متقاضی ہیں۔ خدا خود کو زندگی نہیں دے سکتا، وہ تو زندہ ہی ہے۔ وہ خود کو مار بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کی زندگی کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ازلی ابدی ہے۔ چنانچہ اسم 'المحیی' خدا کے فعل ہی کی نسبت سے بامعنی ہوسکتا ہے اور اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگر وہ ایک کام کرسکتا ہے تو اس کے برعکس پر بھی قادر ہے۔ اگر وہ زندگی دے سکتا ہے تو واپس بھی لے سکتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق میں

کچھ کو عزت دیتا ہے تو کچھ کو ذلت میں بھی مبتلا کر دیتا ہے۔بعض بندوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے مگر بعض سے نافرمانی کا بدلہ لیتا ہے۔

اس گفتگو کے اختتام پر، کسی ممکنہ غلط فہمی سے بچنے کے لیے، ہمیں پھر کہنے دیجیے کہ اسمائے خداوندی کی یہ درجہ بندی، ان پر غور و تدبر کرنے کے بہت سے امکانی راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔اس بات میں کوئی چیز آخری اور حتمی نہیں ہے، اور ہم نے تو اس طرح صرف اس طرزِ فکر کی ایک مثال پیش کی ہے جو مسلمان علماء اس امرِ واقعہ پر غور کرتے وقت اختیار کرتے ہیں کہ اللہ قرآن میں متعدد ناموں کو اپنے آپ سے منسوب کرتا ہے۔

## رحمت اور غضب

اسمائے افعال وہ اسماء ہیں جن کی ضد بھی خدا کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ یہ سن کر کہ خدا کو متضاد ناموں سے پکارا جاتا ہے، ایک سامنے کا سوال کرتے ہیں: ایک ہی خدا کس طرح متضاد صفات کا حامل ہو سکتا ہے؟ وہ رحیم اور قہار دونوں کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا سادہ ترین جواب وہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا۔خدا تو بلاشبہ ایک ہے، لیکن اس کا واسطہ بے شمار مخلوقات سے ہے۔تمام خلق کا انتظام چلانے اور اسے اپنے حکم کے تحت رکھنے والے مالک و حاکم کی حیثیت سے وہ ہر مخلوق کے ساتھ کئی طرح کا تعلق رکھتا ہے۔مزید براں وہ اپنی جس مخلوق کے ساتھ تعلق کے جو رنگ رکھتا ہے، وہ انداز اور شیوۂ عمل وقت گزرنے پر تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے۔

خدا زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی۔تاہم ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کو جس

لمحے میں زندگی عطا کرے، عین اسی لمحے واپس لے لے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ کسی کو زندگی بخشتا ہے، اس زندگی کو ایک مدت تک باقی رکھتا ہے، اور پھر واپس لے لیتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آنِ واحد میں کسی کو زندگی دے رہا ہو اور کسی کو موت۔

ہم جیسے جیسے غور کرتے جاتے ہیں، اپنی مخلوق کے ساتھ خدا کی نسبتیں زیادہ گہری، لطیف اور دقیق ہوتی جاتی ہیں۔ ہر پیدائش ہر حیات بخشی ایک موت، ایک فنا کاری بھی ہے۔ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے مگر رحم مادر سے کوچ کر جاتا ہے۔ ایک آدمی اس دنیا سے گزر جاتا ہے لیکن دوسرے جہان میں آنکھ کھولتا ہے۔ بہر حال زندگی دینا اور موت کے گھاٹ اُتارنا، کچھ اتنی مختلف چیز بھی نہیں ہیں۔ تمام متضاد صفات آپس میں بڑی گہری نسبتیں رکھتی ہیں جو ہمیں یہ ثابت کرنے کے قابل بناتی ہیں کہ ان کا باہمی تضاد مطلق اور اٹل نہیں ہے۔ بلکہ اس تضاد کو سکّے کے دو پہلو کہنا بہتر ہو گا۔ جونہی ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دو متضاد نام فی الواقع ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں، ہم توحید کے قریب تر آ جاتے ہیں، یا (بالفاظ دیگر) یہ دکھانے کے لائق ہو جاتے ہیں کہ کثرت کی تہ میں وحدت ہی پوشیدہ ہے۔

چونکہ بہت سے اسمائے خداوندی میں سے ایسے جوڑے بنائے جا سکتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، لہٰذا انہیں اکثر دو طبقوں یا دستوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دستہ پُرکشش اور مشفقانہ صفات پر دلالت کرتا ہے جو یہ احساس پیدا کرتی ہیں کہ ان کے حامل کا قرب خوشگوار ہو گا۔ انہیں مادرانہ اوصاف کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں محبت کی آنچ اور آغوش میں سمیٹ لینے کی کیفیت ہے۔ رحیم (رحم کرنے والا)، رحمٰن (نہایت مہربان)، ودود (محبت کرنے والا)، رؤف (شفیق)، عفو (درگزر کرنے والا) اور جمیل (خوبصورت) ایسے اسماء اس طبقے میں شامل ہیں۔[۱۲]

اسماء کا دوسرا مجموعہ اتنا دل کھینچ لینے والا نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے بارے میں سوچ کر ہیبت اور خوف طاری ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں القہار (سب کو مغلوب رکھنے والا)، المنتقم (بدلہ لینے والا)، الجبار (زبردست)، الجلیل (عظمت و جلال والا)، العدل (سراسر انصاف)، الضار (ضرر پہنچانے والا) اور الممیت (موت دینے والا) ایسے نام آتے ہیں۔

توحید کے بارے میں مسلم فکر کے لیے اسمائے خداوندی کی ان دو اقسام کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان اسماء سے دو مختلف تناظر تشکیل پاتے ہیں، جن کی وجہ سے دنیا اور اہلِ دنیا سے خدا کے تعلق پر مسلمانوں کے دو مؤقف ہیں اور اس موضوع پر ان کی گفتگو انہیں دونوں کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے۔ ایک نقطۂ نظر خدا کو وراء الورا اور قہار و جبار دیکھتا ہے اور دوسرا قریب اور مہربان۔ (ان دونوں نقطہ ہائے نظر کی بیک وقت موجودگی پر) ممکن ہے کسی شخص کا پہلا ردِ عمل یہ ہو کہ آپ ایک بات طے کیوں نہیں کر لیتے؟

اس بارے میں آپ جتنا سوچیں گے یہ بات اتنی ہی واضح ہوتی جائے گی کہ اہم ترین سوالوں کے جوابات محض 'ہاں' یا 'نہیں' میں نہیں دیے جا سکتے۔ اور اس معاملے میں ہم جس سوال سے الجھے ہوئے ہیں، وہ تمام سوالوں سے زیادہ نازک اور اہم ہے۔ اس کا تعلق خود حقیقت کی ماہیت سے ہے۔ روزمرہ کے معاملات کے بارے میں اگر بالعموم ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں جواب دے دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ''الحق'' کے بارے میں بھی ہمیشہ اسی صراحت سے بات کرنے کے قابل ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہر شے اتنی سادہ اور سیدھی ہوا کرتی بلا کسی الجھاؤ کے۔ لیکن زندگی اور معاملاتِ ہستی اتنے سیدھے سادے ہوتے نہیں۔ جو لوگ ان

کے بارے میں یہ گمان رکھتے ہیں وہ اکثر اپنے گردوپیش کی دنیا کے بڑے حصے سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ بنیاد پرستی کی بہت سی شکلیں اسی سمت میں جاتی نظر آتی ہیں لیکن جہاں تک اسلام کی فکری روایت کا تعلق ہے یہ رویہ اس کے لیے ایک اجنبی رویہ ہے کیونکہ اسلامی معقولات نے ان معاملات کی نزاکت اور نقطۂ ہائے نظر کے تنوع کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔

## قرب و بعد

توحید پر نظر کرنے کے دو بنیادی زاویے ہیں۔ پہلے نقطۂ نظر سے توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز جو حقیقی ہے اور اچھی ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ ''الحق کے سوا اور کچھ حقیقی نہیں ہے''۔ لا الہ الا اللہ ''تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے''۔ اس کے سوا ہر شے چونکہ ''ماسوی اللہ'' غیر از خدا ہے لہذا غیر حقیقی ہے اور اسی سبب سے اس میں اپنی کوئی ذاتی خوبی نہیں۔

دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو توحید کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں اور دنیا میں خوبی کا جو شائبہ اور حقیقت کی جو رمق ہے وہ صرف خدا کی طرف سے ہے کہ وہی صحیح معنی میں حقیقی ہے۔ پہلے نقطۂ نظر کے مطابق اللہ تعالیٰ حقیقی ہے اور دنیا بے حقیقت۔ دوسرے اعتبار سے دیکھیے تو دنیا کسی حد تک اللہ کی حقیقت کا پرتو دکھائی دے گی۔

یہ دونوں نقطۂ نظر یا دونوں تناظر اسمائے الٰہیہ ہی سے متعلق ہیں۔ اگر ہم جلالی ناموں پر غور کریں تو نظر آئے گا کہ ان میں اللہ کے حقیقی ہونے کا اثبات اور دنیا کے بے حقیقت ہونے کا اعلان ہے۔ اللہ تعالیٰ الجلیل، المجید، العظیم، الکبیر ہے جبکہ دنیا ناچیز و دوں نہاد اور بے حیثیت ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دائم و حقیقی ہے اور

اس کی حقیقت کے مقابل دنیا محض ایک سایۂ گریزاں، ایک مٹتی ہوئی پرچھائیں ہو کر رہ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ وہ بادشاہ ہے جس کی قدرت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ حکمران بس وہی ایک ہے، مطلق و یکتا۔ وہ دنیاؤں سے غنی اور بے نیاز ہے کہ اسے کائنات کی کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ کائنات ہر ہر بات کے لیے اللہ کی محتاج ہے کہ وہی اس دنیا کے لیے سامانِ ہستی فراہم کرنے والا، اس کے وجود کا منبع و ماٴخذ ہے۔

اسم 'المَلِک' (شہنشاہ) سے بات میں آج وہ زور پیدا نہیں ہوتا جو دورِ جدید سے پہلے تک اس لفظ سے خاص تھا، جب دنیا میں بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ آئینی بادشاہ کو بادشاہ کہنا مشکل ہے۔ صدر اور مطلق العنان ڈکٹیٹر بھی بادشاہ سے الگ چیز ہیں۔ قدیم تناظر میں شہنشاہ اس دنیا کی حتمی اور مطلق صاحبِ اختیار و اقتدار ہستی ہوتا تھا۔ اسلام میں یہ زاویۂ نگاہ موجود ہے اور اس بات میں مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو شہنشاہ (المَلِک) کہا گیا ہے۔ بادشاہ کا فرمان حرفِ آخر ہوتا تھا۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ جلاد تیغہ لیے بادشاہ کے پہلو میں کھڑا رہتا تھا اور رعایا میں سے جس کی طرف بادشاہ انگلی کا اشارہ کر دیتا اس کا سر وہیں قلم کر دیا جاتا۔ بسا اوقات بادشاہ اپنی رعایا سے پردے میں رہتا تھا کہ اس کے قریبی لوگوں کے سوا اس کے چہرے پر نگاہ ڈالنے کا حق کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ اجازت کے بغیر یا اتفاقاً اس کے چہرے پر نظر پڑ جاتی تو یہ دیکھنے والے کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ بساطِ ہستی پر اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی کی مضبوط علامتوں میں سے بادشاہوں کی تمثیل بھی ہے۔ عوام سے دور ہونا بادشاہ کا خاصہ تھا کہ اس کی ہیبت اور خوف لوگوں پر قائم رہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ ایک زبردست، طاقتور، شہنشاہِ

حاکم ہے اور العلی، العظیم، المتعالی، القدوس، العزیز جیسے اسماء اسی کو زیبا ہیں کہ وہ سب سے وراء اور منزہ ہے۔ مخلوق سے اپنا فاصلہ اور امتیاز برقرار رکھنے کے لیے بادشاہ اکثر قہر و غضب کا ہولناک مظاہرہ اپنی قدرت اور قوت کے ذریعے کیا کرتے ہیں۔ اپنے حکم سے سرتابی کرنے والوں کے خلاف اپنے لشکر روانہ کرتے ہیں اور بادشاہ کی دی ہوئی سزا یقیناً بہت ہولناک ہوتی ہے۔ جب لوگ اللہ کے بارے میں ان صفاتِ جلال و غضب کو مدنظر رکھ کر سوچتے ہیں تو قدرتی ردِ عمل دہلنے، دبکنے کا ہوتا ہے۔ اگر قرآن میں اللہ کے بارے میں بس اتنا ہی ہوتا تو اسلام ایک خوفناک قسم کا مذہب بن کر رہ جاتا۔ لیکن اللہ کے ناموں میں رحمت و جمال کے اسماء بھی ہیں۔ اللہ کو اپنی مخلوقات میں سے ایک ایک کا خیال ہے۔ جیسے ایک ماں کے بہت سے بچے ہوں اور وہ ان میں سے ہر ایک کو سب سے اعلیٰ اور بہترین چیز فراہم کرنا چاہے۔

ایک روز رسولِ خداؐ چند اصحاب کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ بدوؤں کا ایک پڑاؤ دیکھ کر سب لوگ رکے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خیموں والے بدو مسلمان ہیں۔ آپؐ پڑاؤ میں استراحت کے لیے تشریف فرما ہوئے۔ زمین میں گڑے ایک تنور میں ایک عورت روٹی لگا رہی تھی۔ بچہ پہلو میں لیے ہوئے تھی۔ تنور کی آگ کو ہوا دینے لگی تو اچانک شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ دیکھ کر عورت پھرتی سے اچک کر بچے کو آگ کی لپیٹ سے بچانے کے لیے پیچھے ہٹی۔

چند منٹ بعد وہی عورت آنحضرتؐ کے پاس آئی اور پوچھنے لگی ''کیا آپؐ اللہ کے رسول ہیں''؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ عورت بولی ''کیا یہ سچ ہے کہ اللہ ارحم الراحمین ہے؟ (سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے)۔ آپؐ نے فرمایا تم نے ٹھیک کہا۔ اس عورت نے کہا ''کوئی

عورت اپنے بچے کو آگ میں کیونکر پھینک سکتی ہے!‘‘۔

اللہ کے رسولؐ نے آبدیدہ ہو کر سر جھکا لیا۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے بعد آپؐ نے سر اُٹھا کر اس عورت کو مخاطب کیا اور فرمایا ’’عذابِ خداوندی صرف اس شخص کے لیے ہے جو خدا کا باغی اور نافرمان ہو، اس کے خلاف سرکشی کرے اور ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کہنے سے انکار کرے۱۳‘‘

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ رسولِ خداؐ کا فرمان ہے کہ اللہ کا عذاب صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ’’توحید‘‘ کے منکر ہوں اور اللہ کی رحمت سے خود کو دور کر لیں، اس ضد پر اڑ جائیں۔

قرآن مجید میں آیا ہے:

لاتقنطوا من رحمة اللّٰه ۰ إنَّ اللّٰه يغفر الذنوب جميعا

(۳۹:۳۵)

اللہ کی رحمت سے آس توڑ نہ لینا۔ بے شک وہ سب گناہ بخش دیتا ہے۔

یہ قرآن کے پیغام کا دوسرا رخ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ’’شہنشاہِ سخت گیر‘‘ ہے تو ساتھ ہی گویا مادرِ مہربان‘‘ بھی ہے۔ رحمت اور نرمی کے سبھی نام مخلوق سے اسی تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہیں: الودود، الغفور، الرحمٰن، التواب، العفو، الحی۔ یہ وہ صفات ہیں جو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے قریب ہے، کبھی ان کو تنہا بے سہارا نہیں چھوڑتا۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰ : ۱٦)

اور ہم اس سے اس کی دھڑکتی رگ سے زیادہ نزدیک ہیں۔

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ(٥٧:٤)

اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ(٢:١١٥)

سو جس طرف تم رخ کرو گے وہاں ہی اللہ کو پاؤ گے۔

خدا اگر ایسا ہو تو انسان فطری طور پر کیا کرے گا، خود کو اس کے قریب محسوس کرے گا، اس سے محبت کرے گا۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو رخ ہیں! ایک رحمت کا رخ اور دوسرا غضب کا پہلو، ایک روئے محبت اور دوسرا روئے جلال، ایک قریب چہرہ اور دوسرا بعید۔ لوگوں کو روئے قہر و غضب سے خوف کھانا چاہیے اور روئے مہربان سے محبت کرنا چاہیے۔ لیکن ان احساسات کا اظہار کیونکر ہو؟ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ جس چیز سے لوگ خوفزدہ ہوں اس سے دور بھاگتے ہیں۔ لیکن خدا سے چھپنا روپوش ہونا ممکن ہی کب ہے کہ جدھر منہ کیجیے ادھر تو ہی تو ہے۔ اس لیے قرآن کا حکم ہے " فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ" (٥١:٥٠) (سو بھاگو اللہ کی طرف) حضورؐ دعا فرمایا کرتے تھے[۱۴]

''میں تیرے غضب سے تیری رحمت کی پناہ لیتا ہوں، تیرے عذاب سے تیری مغفرت کی پناہ لیتا ہوں اور تجھ سے تیری ہی پناہ میں آتا ہوں''۔ خدا سے ڈر کے آپ اس سے دور نہیں بھاگتے، اس کی طرف بھاگتے ہیں۔ اور جب آپ اللہ سے پیار کرتے ہیں تو بھی اسی کی طرف دوڑتے ہیں۔ توحید میں یہی بات مضمر ہے۔ بات کسی جانب سے بھی شروع کیجیے لوٹ کر اللہ ہی کی طرف آنا پڑتا ہے۔

دوری اور نزدیکی کے نقطہ ہائے نظر پر وحدت و کثرت یا یکتائی اور تعدد کے

باہمی تعلق کے حوالے سے غور کرنا بھی مفید ہوگا۔ توحید اس بات کا اثبات ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ اس کائنات سے یکسر وراء ہے لہٰذا یہ کائنات اس کی وحدت میں کسی طرح شریک نہیں ہو سکتی۔ سو نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات کو لاتعداد حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وحدت ہے، جبکہ دنیا عالمِ کثرت ہے۔ موخر الذکر نقطۂ نظر سے دیکھیے تو یہ ہوگا کہ اللہ کی وحدت کائنات میں منعکس ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کائنات ایک کل ہے اور اس کے تمام اجزاء ہم آہنگی، توازن اور اعتدال میں باہم شریک ہیں۔

## تنزیہ اور تشبیہ

علمِ الٰہیات یا علمِ کلام کی اصطلاحی زبان کی جو نشو و نما ساتویں / تیرہویں صدی کے بعد ہوئی اس میں دو اصطلاحات بہت کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ ان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کے قرب و رحمت اور بُعد و غضب کے تصور میں جو فرق ہے اسے ظاہر کیا جا سکے۔ یہ اصطلاحات ہیں تنزیہ اور تشبیہ۔ تنزیہ کا مطلب ہے اللہ کے بے ہمتا و ماوراء ہونے کا اعلان اور تشبیہ کا مفہوم ہے اللہ کی اپنی مخلوق سے مشابہت یا مخلوق کا اللہ کی مثال پر ہونے کا اثبات۔

تنزیہ کا لفظی مطلب ہے "کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے بری، آزاد اور پاک قرار دینا"۔ یہ اعلان ہے اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں پائے جانے والے تمام عیبوں اور کمی، کوتاہی سے پاک اور آزاد ہے۔ تنزیہ کے تناظر میں دیکھیے تو اللہ تعالیٰ اتنا مقدس اور پاک ہے کہ خلق کی ہوئی کسی چیز سے اس کو تشبیہ نہیں دی جا سکتی، تصورات سے بھی نہیں کیونکہ ہمارے تمام خیالات اور تصورات بھی تو ذہنی مخلوقات ہی ہیں۔ قرآن کی جو آیت تنزیہ کو سب سے زیادہ وضاحت سے بیان کرتی ہے

یوں ہے ”لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ“ (کوئی شے اس جیسی نہیں)

اسمائے الٰہیہ میں سے جن ناموں کو تنزیہ کے نام کہا جاتا ہے ان کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ ذاتِ الٰہی کے اسماء ہیں مثلاً القدوس، الغنی، المتعالی، السبوح۔ لیکن جلالی ناموں اور اسمائے غضب کو بھی تنزیہی نام کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا زور اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے مختلف اور الگ ہے یعنی یہ کہ وہ مخلوقات کے پست اور ادنیٰ معاملات سے یکسر ماوراء ہے۔

”تشبیہ کا مطلب ہے کہ ”کسی چیز کو دوسری کسی شے سے مشابہ قرار دیا جائے“ یہ اس بات کا اعلان ہوا کہ خدا کی کوئی نہ کوئی مشابہت اپنی مخلوق سے ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مخلوق کا خدا سے تعلق کیونکہ پیدا ہوتا! کائنات میں خدا کی نشانیاں اور صحیفۂ خداوندی میں اس کی صفات بیان ہوئی ہیں مثلاً حیات، علم، ارادہ، قدرت، رحمت، کرم، رزاقی۔ یہ سب خدائی صفات ہیں مگر یہی صفات اللہ کی مخلوق میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اللہ کے تمام نام ایک طرح کی ”تشبیہ“ کا تصور پیدا کرتے ہیں کیونکہ ان سے یہ سوچنے کی گنجائش نکلتی ہے کہ خدا ایسا ہوگا یا ویسا ہوگا۔ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ ”اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے“ تاہم اللہ کے کسی نام کو سوچتے ہی ذہن میں اللہ کے بارے میں ایک تصور قائم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ الرحمٰن ہے تو رحمت کا جو مفہوم ہمارے اندر ہے اسے لے کر ہم اللہ کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جب ہم اللہ کے کسی ذاتی نام مثلاً الغنی کو سامنے رکھتے ہیں تو اس نام کو بھی ہم غنی اور بے پرواہ ہونے کے اپنے تصور ہی کے حوالے سے سمجھتے ہیں۔

یوں تو اسمائے الٰہیہ میں سے ہر اسم ایک نوع کی تشبیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے

تاہم اسمائے جمال اور اسمائے رحمت کا زور ''تنزیہ'' کی نسبت ''تشبیہ'' پر زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اسماء جو ہمیں اللہ کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ وہ مخلوق سے قریب ہے، اس پر مہربان ہے اور اس کی بھلائی چاہتا ہے، انہیں تشبیہی ناموں کا یا اسمائے تشبیہ کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ خدا اگر رحیم و ودود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہم سے دور نہیں ہے، لاتعلق نہیں ہے۔ اسمائے جمال و رحمت ایک ایسے خدا کا بیان ہیں جسے لوگ سمجھ سکتے ہیں اور جس سے محبت کر سکتے ہیں۔ ان اسماء سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک شفیق اور مہربان ماں کی طرح خدا بھی اپنی مخلوق کے قریب ہوتا ہے اور اس کی ہر ضرورت اور احتیاج پر نظر رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص مجھ پر مہربان، میرا بھلا چاہنے والا، محبت دینے والا ہو تو انسان کا فطری جواب محبت اور بھلائی ہی کا ہوگا۔

''تنزیہ'' کا تناظر یہ ہے کہ وحدتِ خداوندی کا اثبات اس اعلان سے کیا جائے کہ اللہ ایک ہے اور صرف وہی اصل و حقیقی ہے۔ اس کے سوا ہر شے غیر حقیقی ہے، بے اہمیت ہے اور اعتنا کے لائق نہیں۔ خدا کی یکتا و بے ہمتا حقیقت کسی بھی غیر حقیقی پن سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس تشبیہ کے تناظر میں دیکھیے تو یہ معلوم ہوگا کہ اللہ کی وحدت ایسی جامع ہے کہ اس کی حقیقتِ واحدہ تمام مخلوقات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دنیا جو غیر حقیقی اور سراب و فریبِ نظر لگتی ہے وہ درحقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ الحق اور الاحد نے اس میں اپنی نشانیاں اور آثار ظاہر کیے ہیں۔ دنیا و مافیہا کو الگ کرنے کی بجائے اللہ کی وحدت ہر شے کی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' کو اکثر ''الظاہر'' (آشکار، ہر شے سے ظاہر) اور ''الباطن'' (چھپا ہوا، ہر شے سے مخفی) کے دو اسمائے الٰہی سے متعلق کہا جاتا ہے۔ الحق جس حد تک ''الباطن'' ہے، ظاہر و آشکار تمام غیر حقیقی ہے اور وحدت صرف الحق

ہی کا حصہ ہو گی۔لیکن دوسری جانب جس حد تک اللہ تعالیٰ الظاہر ہے اسی قدر عالمِ ظاہر بھی الحق ہے۔پس کائنات اگر حقیقی ہے تو اللہ کی حقیقت کے وسیلے سے اور اگر واحد ہے تو اللہ کی وحدت کے سہارے۔

اللہ کی تنزیہ و تشبیہ ہر دو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ اگر ماوراء ہے تو ساتھ ہی القریب بھی ہے۔اگرچہ اللہ تعالیٰ الجمیل ہے اور اپنے جمال کی وجہ سے دلوں میں محبت جگا دیتا ہے لیکن اس کا جمال مخلوقات کے حسن کی طرح نہیں ہے۔لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیٔ۔اس کے قرب میں بھی دوری ہے اور اپنی تشبیہ میں بھی وہ تنزیہ کی شان رکھتا ہے۔

تنزیہ کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع دائرے کا تصور کیجیے۔

## نقشِ اوّل۔تنزیہ

خدا اس دائرے کے مرکز میں ہے، دائرے کا وہ مرکزی بلا جہت نقطہ جس سے دائرے کا ظہور ہوتا ہے۔وہ دنیا جو ہمارے تجربے میں آتی ہے اس دائرے کے محیط پر واقع ہے،مرکز سے بے انتہا دور۔دنیائیں بہت سی ہیں۔ان کا تصور یوں کیجیے کہ اس ایک مرکز کے گرد دائرہ در دائرہ ہم مرکز دائروں کا ایک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ان میں سے کچھ خدا سے قریب ہیں،دوسرے ذرا دور ہیں۔ان سب کا مرکز ایک ہے اور یہ سبھی مرکز سے کٹے بھی ہوئے ہیں کہ اللہ سب سے منزہ و ماوراء ہے۔صرف مرکزی نقطہ ایسا ہے جو بلا جہت و بلا سمت ہے،" لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیٔ" ساتھ ہی ساتھ ہر ہم مرکز دائرہ دوسرے دائروں سے مشابہ ہے۔مخلوقات اپنے خواص و صفات میں ایک دوسرے کی شریک ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان صفات میں سے کسی میں

شریک نہیں ہے۔

''تشبیہ'' کی تصویر کشی کرنا ہو تو اسی نقطۂ بے جہت کو ایک اور انداز میں دیکھنا ہو گا۔ اب کی مرتبہ یوں تصور کیجیے کہ اس مرکز سے لاتعداد خط نکل کر گرے یا دائرے کے محیط کی طرف باہر جا رہے ہیں۔ (نقش دوم)۔ کائنات کی ہر مخلوق ان نصف قطری لکیروں میں سے ایک خط پر واقع ہے اور مرکز سے براہ راست جڑی ہوئی ہے؟ اسے اپنی حقیقت اسی مرکزی نقطے سے حاصل ہوتی ہے۔ نصف قطر کے ان خطوط، مرکز سے پھوٹنے والی ان شعاعوں کا مطلب ہے اللہ کا تعلق اپنی مخلوق سے محبت، رحمت، کرم، مہربانی اور درگزر کا ہے۔

## نقشِ دوم۔ تشبیہ

یاد رہے کہ ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' دونوں ہی حقیقت کی مکمل تصویر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ادھورے نقوش ہیں۔ کائنات کو سمجھنا ہو تو دونوں تناظر بیک وقت نگاہ میں رکھیے (نقشِ سوم) تب ہمیں سجھائی دے گا کہ ہر شے بیک آن اللہ کے قریب بھی ہے اور اس سے دور بھی، اللہ کی شبیہ بھی ہے اور تشبیہ سے بری بھی۔ ہر شے کو بیک وقت رحمت و غضب، جلال و جمال، حیات آفرینی اور موت، انعام و عطا اور قبض و سلب، حقیقت و عدمِ حقیقت ہر دو کا سامنا رہتا ہے۔ یہ ہے ''توحید''۔

## نقشِ سوم۔ توحید

تشبیہ و تنزیہ کے یا خدا سے قرب و بعد کے یہ دو تناظر، یہ دو زاویۂ نظر آپ کو اسلامی کتب میں اور مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ ایک سادہ سی مثال لیجیے۔ قرآن کی ترکیب ''الحمد للہ'' کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ مسلمان یہ

کلمات ہر طرح کے مواقع اور مختلف سیاق و سباق میں استعمال کرتے ہیں کہ اس سے اللہ کے لیے شکر کا اظہار ہوتا ہے۔ اچھی صورتحال کا سامنا ہو تو لوگ الحمدللہ کہتے ہیں، کچھ کھائیں پیئں تو الحمدللہ کہتے ہیں، کوئی چیز اچھی لگے تو الحمدللہ کہتے ہیں۔ کوئی شخص اگر عام لوگوں سے قدرے زیادہ سنتِ رسولؐ کا پابند ہوا تو وہ ہر بات پر اللہ کا شکر ادا کرے گا، کیا اچھی اور کیا بری، کیا دکھ اور کیا سکھ۔ وہ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی آئے اس کو احساسِ تشکر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ''الحمدللہ علی کل حال'' (تعریف اللہ ہی کے لیے ہے ہر حال میں)۔[۱۵]

حمد و تعریف کے یہ کلمات تمام نعمتوں کو لوٹا کر اللہ سے وابستہ کر دیتے ہیں کائنات میں اور نفسِ انسانی میں جو نشانیاں ہیں یہ انہیں لے کر ان کی نسبت ان کے ربانی مأخذ و منبع سے قائم کر دیتے ہیں۔ یوں تناظرِ تشبیہ کا اثبات ہوتا ہے، اللہ کا قریب ہونا اور ہر عمل میں فعلِ خداوندی کی کارفرمائی، انسانوں کے لیے اللہ کی شفقت خیر خواہی اور رحمت۔

''سبحان اللہ'' کے کلماتِ قرآنی بھی عموماً استعمال کیے جاتے ہیں۔ ''الحمدللہ'' کے برعکس ان کلمات کا زور ''تنزیہ'' پر ہے۔ یہ الفاظ ایسے موقعوں پر ادا کیے جاتے ہیں جب اللہ تعالیٰ یا اس کے کسی کام کے بارے میں کوئی وسوسہ ذہن میں گزر کرے یا کہیں اگر اس بات کا عندیہ پایا جائے کہ اللہ کے ہاں بھی انسانوں کی طرح کے محرکاتِ عمل پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں اکثر یہ ترکیب اسی مفہوم میں برتی گئی ہے مثلاً جب کبھی اسلام سے پہلے کی اقوام کی مختلف آراء کی تردید کا ذکر آیا۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَباً ط سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷:۱۵۹)

اورانہوں نے خدا اورجنوں کے درمیان بھی ناتا جوڑ رکھا ہے... اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

یہ دوتراکیب قرآنی ایسی ہیں جن کو مسلمان روزمرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اکثر ان کے معانی سے بے خبری میں غور کیے بغیر عادتاً بولتے ہیں۔ یومیہ زندگی میں یہ تشبیہ اور تنزیہ کا اظہار ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ دونوں ہی تراکیب ضروری ہیں۔انسان کی اوراس کی زندگی کی حیثیت ہی ایسی ہے کہ اس کے لیے اللہ حاضر بھی ہے اور غائب بھی۔

خلاصہ یہ کہ ''تشبیہ'' و ''تنزیہ'' توحید کے قطبین سے عبارت ہیں۔ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے یہ دونوں تناظر ہر اس گفتگو میں مدنظر رکھنے ضروری ہیں جو کائنات میں انسان کی حیثیت اور منصب، نبوت کی ماہیت اور معاد جیسے بنیادی موضوعات کے مباحث سے متعلق ہو۔

## رحمت غضب سے بڑھ گئی

توحید کا تناظر اللہ کی وحدانیت پر زور دیتا ہے کہ اللہ ہی ایک سچی حقیقت ہے۔ اس کے مطابق کائنات کی ہر شے اللہ سے متعلق ہے۔حقیقت سے کوئی ناتا نہ ہوتو اشیاءمعرضِ ہستی میں کیونکر آسکیں گی۔اس نقطۂ نظر کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہر شے سے لا انتہا دور اور ماوراء ہے (تنزیہ) لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ہر شے میں حاضر و موجود ہے (تشبیہ)۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ اسمائے جلال وغضب کا تعلق "تنزیہ" سے زیادہ ہے اور تشبیہ سے کم۔ اس لیے کہ اللہ کے جلالی نام اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اللہ دنیا سے یکسر الگ اور کلیتاً ماوراء ہے، بڑی قدرت والا ہے، عظمت وکبریائی کا حامل ہے، بزرگ و برتر ہے۔ القہار، الجبار، القوی، المذل، الخافض، المانع، المقسط، المنتقم اور ذوعقاب الیم جیسے اسماء ایک ایسے شہنشاہِ عالم کی خبر دیتے ہیں جو اپنے بندوں سے دور ہے اور اپنی قلمرو میں جو چاہتا ہے کرتا ہے، اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ میں یا آپ کیا سوچتے ہیں۔

اسی طرح اسمائے جمال ورحمت "تنزیہ" کی نسبت "تشبیہ" سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں کہ ان میں ایک ایسی ہستی کی خبر پنہاں ہے جو روزمرہ زندگی کی معمولی معمولی تفصیلات تک کی خبر رکھتی ہے۔ اگر خدا "اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد" (۵۰:۱۶) (شہ رگ سے بھی قریب تر) نہ ہوتا تو یہ کیوں کہتا "اُدْعُونِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ" (۴۰:۶۰) (مجھے پکارو کہ میں پہنچوں تمہاری پکار پر)

اگر خدا کو ہم قریب بھی سمجھیں اور دور بھی، شفیق ومہربان بھی اور قہار و جبار بھی، بے نیاز بھی اور بندوں کا خیال رکھنے والا بھی تو ہوگا یہ کہ جلد ہی اللہ کے بارے میں ورطۂ حیرت میں پڑ جائیں گے۔ اس کی رحمت کی امید کریں یا اس کے غضب سے خوف کھائیں؟ جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوا روایتی جواب یہ ہے کہ انسان کو بیم ورجاء، خوف اور امید ہر دو سے بہرہ مند ہونا چاہیے۔ خوف اگر نہ ہو تو لوگ باگ دلیر ہو کر من مانی کرنے لگیں اور نتائج سے بے پروا ہو جائیں۔ امید ٹوٹ جائے تو انسان مرجھا کر موت کا شکار ہو جائے۔

خوف اور امید میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا چاہیے یا لوگوں کو بیم و

رجاء برابر برابر رکھنا چاہیے؟ اگر اللہ تعالیٰ کے جلالی اور جمالی نام بالکل مساوی ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ انسان کو خوف اور امید برابر کی رکھنا چاہیے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی روایت کے مطابق جلال اور جمال ایک سطح کی چیز نہیں ہیں۔

ہم نے پہلے کہیں بیان کیا تھا کہ خوفِ خدا سے وہ ردِعمل پیدا نہیں ہوتا جو کسی مخلوق کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں اگر آپ کسی چیز سے خوفزدہ ہوں تو اس سے دور بھاگتے ہیں لیکن اگر اس سے کسی فائدے کی امید ہو تو اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ تاہم معاملہ اگر خوفِ خدا کا ہو تو واحد منطقی راہِ عمل یہی رہ جاتی ہے کہ اس کے خوف سے اس کی جانب قدم بڑھائے جائیں کہ اس سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے؟ خدا کا ہر نوع کا تعلق قربِ خداوندی کی آرزو کو جنم دیتا ہے۔ خدا اگر دور ہے تو انسان کا ردِعمل یہ ہونا چاہیے کہ اس بُعد سے پیچھا چھڑانے کے لیے قرب کا متلاشی ہو اور قربِ خداوندی کے احساس کا ردِعمل یہ ہوگا کہ وہ زیادہ قرب کی طلب کرے۔ قرب (یا اسم القریب) صفاتِ تشبیہ میں سے ہے، تنزیہی صفات میں سے نہیں۔

تنزیہِ خداوندی کا پیغام یہ ہوا کہ انسان کو تشبیہ تک پہنچنے، اپنے اندر صفاتِ خداوندی سے مشابہت پیدا کرنے کی سعی و کاوش کرنا چاہیے۔ دوسری طرف تشبیہ کا پیغام یہ ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ تشبیہ کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ مقصودِ نظر، مطلوبِ آدرش تشبیہ ہوا، تنزیہ نہیں۔

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے دور ہے لیکن یاد رہے کہ یہ خدا ''توحید'' کا خدا ہے آج کے مقبولِ عام معاصر کلچر کا پیدا کردہ خدا نہیں۔ ''توحید'' کا خدا علم و حیات، ارادہ، قدرت، نطق و کلام، خیر و رحمت اور ہر حقیقی شے کا منبع ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دور ہے تو اس سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ حقیقت سے دور پڑے ہیں کیونکہ ان کی زندگی، ان کا علم و ارادہ، قدرت اور دیگر تمام مثبت صفات بہت ہی مدھم اور مٹی ہوئی ہیں۔

لیکن اللہ قریب بھی تو ہے کہ حقیقت سے مفر کس کو ہے۔انسان کہنے کا مطلب ہی حیات، علم، ارادہ وغیرہ کا اثبات ہے خواہ یہ صفات کتنی ہی عارضی، دھندلی کیوں نہ ہوں۔اس سے فرار اختیار کر کے ہم ایک عدمِ مطلق میں پناہ نہیں لے سکتے اس لیے کہ اوّل تو یہ صفات انسانوں کی صفات ہی نہیں ہیں۔جو شے آپ کی ملکیت ہی نہ ہو وہ آپ اٹھا کر پھینک کیسے سکتے ہیں۔مذکورہ صفات اللہ کی صفات ہیں اور جب تک اس کا حکم ہوگا یہ صفات ہمارے اندر موجود رہیں گی۔آگے چل کر جب ہم معاد کی بحث کریں گے تو ذکر آئے گا کہ اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ موت ایک مسکن سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا نام ہے۔حالات بدل جاتے ہیں، ہستی کے بنیادی خواص نہیں تبدیل ہوتے۔

کہنے کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ حقیقی ہے جبکہ مخلوق اشیاء غیر حقیقی ہیں۔مخلوقات کو جو حقیقت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اور یہ حقیقتِ مستعار اسی کی ہی قدرت اور تصرف میں ہے۔اللہ کی عطا کردہ اس حقیقت سے گریز کا مخلوق کے پاس کوئی راستہ نہیں۔الحق ہی سب کچھ ہے جبکہ عدمِ حقیقت لاشے ہے۔حقیقت اللہ کا خاصہ ہے۔جو شے جتنی حقیقی ہو گی خدا سے اتنی ہی قریب ہو گی۔جتنی غیر حقیقی ہو گی اتنی ہی خدا سے دور ہو گی۔لیکن خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی اشیاء اس سے نزدیک ہوتی ہیں، اس لیے کہ حقیقی ہونے کا مطلب ہے خدا کی نشانی ہونا، نورِ خداوندی کی ایک کرن۔

قرآن اور حدیث میں قرب اور بُعد کا ذکر عموماً اس اعتبار سے آیا ہے کہ ان صفات کے نتائج انسانوں کے لیے کیا نکلتے ہیں۔ اللہ سے دور ہونے کا مطلب ہے جلال اور قہر کی صفات کے زیرِ نگیں آ جانا اور یہ ایک تکلیف دہ صورتحال ہو سکتی ہے۔ قربِ خداوندی کا مطلب ہے کہ آپ رحمت و جمال کی صفات کے زیر اثر ہوں اور یہ آپ کے لیے خوب ہو گا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ قرآن کس طرح جہنم کو اللہ سے دوری اور جنت کو اس کے قرب سے وابستہ کرتا ہے۔ یہاں صرف اس نکتے پر توجہ دلانا مقصود ہے کہ جلال اور قہر کے مقابلے میں جمال و رحمت کہیں زیادہ حقیقی ہیں کیونکہ جمال اور رحمت قربِ خداوندی کی علامت ہیں۔ جو بھی اللہ سے قریب تر ہے وہ اس سے زیادہ مشابہ ہے لہٰذا زیادہ حقیقی ہے، جو دور ہے وہ اس کے برعکس۔ بنا بریں صفاتِ تنزیہ کے مقابلے میں تشبیہی صفات الحق کی بہتر نمائندگی کرتی ہیں۔

جلال اور غضب کے اسماء کی نسبت جمال و رحمت کے نام اللہ کی حقیقی فطرت کی جانب زیادہ رہنمائی کرتے ہیں۔ اس بات کی طرف قرآن نے جس طرح اشارہ کیا ہے اس کا ایک اندازہ اس آیت میں ملتا ہے جہاں اللہ کی رحمت کے ہر شے پر محیط ہونے کا ذکر ہے۔

قَالَ عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنۡ أَشَآءُۖ وَرَحۡمَتِي وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٖ (۷:۱۵۶)

فرمایا: میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔

قرآن کبھی یہ نہیں کہتا کہ خدا کا غضب ہر شے پر نازل ہوتا ہے۔ اس کا غضب صرف ان مخلوقات کے لیے ہے جو یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں کہ اللہ ان کے

قریب ہے اور اپنے فکر وعمل سے حقیقت کو للکار کر اس کے مقابلے میں پر اتر آئیں۔

رسولِ خداؐ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش پر لکھ رکھا ہے، "رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي" [16] (میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے) رحمت غضب پر غالب ہے۔

یہ سبقت، یہ بڑھا ہوا ہونا زمانی نہیں ہے وجودی ہے۔ بالفاظِ دگر رحمت غضب کے مقابلے میں زیادہ بنیادی حقیقت ہے۔ رحمت کا تعلق الحق کی ماہیت سے ہے۔ رحمت اس کی فطرت کا جزو ہے جبکہ غضب ایک ثانوی وصف ہے جو بعض مخلوقات کی خاص حالت کی وجہ سے ابھرتا ہے۔

اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے، یہ اسلامی فکر کے اہم ترین اصولوں میں سے ایک ہے۔ نظری اور عملی اعتبار سے اس کے بے شمار نتائج ہیں۔ انکی طرف ہم اکثر اشارہ کریں گے۔ سر دست یہ کہنا کافی ہے کہ اس اصول سے تنزیہ اور تشبیہ کے مابین ایک تعلق قائم ہوتا ہے۔ تنزیہ خداوندی ہستی کی ایک حقیقت ہے لیکن اس کی تشبیہ زیادہ بنیادی حقیقت ہے۔ توحید یہ بتاتی ہے کہ خدا ہم سے مختلف ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتی ہے کہ خدا ہر اعتبار سے مختلف نہیں ہے اور یہ قولِ ثانی ہی قولِ فیصل ہے۔ رحمت غضب پر غالب ہے اور رحمت سے الحق کا قرب میسر ہوتا ہے۔

اسلام اپنا آغاز اس بات سے کرتا ہے کہ ہم مختلف ہیں۔ ہم اللہ سے مختلف ہیں اور اس سے دور ہیں۔ خدا ہم سے یکسر مختلف و ماوراء ہے۔ مخلوقات سرے سے عاجز و بے سامان ہیں کہ ان کے دامن میں کوئی بھی مثبت صفت نہیں ہے۔ لیکن

اسلامی تعلیمات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو غضب کے نرغے میں (دوری میں) چھوڑ دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ رحمت (یعنی قربِ خداوندی) تک انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا سے اپنی دوریوں کے ازالے کے لیے کچھ کرے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو قربِ خداوندی کی سمت قدم بڑھاتا ہے۔ قرب ایک مطلوب اور پسندیدہ چیز ہے کہ یہ قرب ہر حقیقی، نفع بخش، پرمسرت اور خیر کی چیز کا قرب ہے۔

رحمت کو اگر مخلوقات میں اثر آفریں و کارفرما ایک صفتِ خداوندی کے طور پر دیکھیے تو اس کا مطلب ہوگا اللہ کا ہر وہ عمل جو اس نے اس لیے کیا کہ اس کے بندے خیر و حقیقت سے بہرہ مند ہو سکیں۔ رحمت، اللہ تعالیٰ کے اساسی اور اصلی ارادے کی نمائندہ ہے کیونکہ اللہ خود رحمت ہے۔ غضب ایک عارضی معاملہ ہے اور اسے آخر کار دور ہو ہی جانا ہے کیونکہ غضب کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو اللہ سے کٹی ہوئی ہیں اور اللہ سے صحیح معنوں میں کٹی ہوئی اور جدا بھلا کیا چیز ہو سکتی ہے؟ جیسے ہی قربِ خداوندی میسر ہوگا غضب محو ہو جائے گا۔

اسلامی فکر میں رحمت کا جو بنیادی کردار ہے اسے بیان کر کے ہم اللہ کے اسماء و صفات کی اس بحث کو اختتام تک لے آتے ہیں۔ ہمارا یہ ہرگز مدعا نہیں کہ اس مبحث کا کبھی بھی پوری طرح احاطہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسماء و صفات پر گفتگو توحیدِ خداوندی کی شرح و توضیح کا صرف ایک وسیلہ ہے اور توحید اس امر کی وضاحت ہے کہ خدا کا اپنی مخلوق سے کیا تعلق ہے وہ مخلوق جو لاتعداد آیاتِ خداوندی کے مصداق ہے۔ اللہ کی ہر نشانی سے اللہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ ہر نشانی سے فطرتِ الٰہی کے کسی پہلو کا علم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ان نشانیوں کی کوئی انت

نہیں! انتہا ہو بھی کیونکر۔ یہ کائنات کیا ہے؟ ماسوی اللہ کو، غیر از خدا ہر چیز کو کائنات کہتے ہیں اور یہ کائنات خود بے پایاں ہے۔

## افعالِ خداوندی

اللہ تعالیٰ کی صفات پر بات کرنے کی ویسے تو کوئی انتہا نہیں ہے لیکن عام طور پر ان کو ننانوے ناموں میں سمیٹ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے خواص کا مبحث بھی سخنِ ناپیدا کنار کے مترادف ہے۔ جدید سائنس اس کی مثال ہے۔ لیکن قرآن و حدیث نے ہمیں فکر کی تنظیم کرنے والے ایسے واضح تصورات دیئے ہیں جن کے سہارے مسلمان علماء نے کائنات کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے کہ دنیا اللہ کی نشانیوں کا ایک مربوط اور عظیم الشان مرقع نظر آتی ہے، یا آیاتِ خداوندی کا ایک وسیع مجموعہ جس میں آیات تو بہت سی ہیں لیکن پیغام سب کا ایک ہے۔

اسلامی الٰہیات کی اصطلاحی زبان میں اشیائے مخلوقہ یا خلقِ خدا کو ''افعالِ خداوندی'' کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ ہر شے اللہ کی خلق کردہ ہے اور اس کی صفات کی نشانی ہے۔ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ ''افعال'' Acts کی اصطلاح دیگر دو اصطلاحات یعنی ''ذات'' Essence اور ''صفات'' Attributes کے سیاق و سباق میں اور انہی کے حوالے سے استعمال ہوتی ہے۔ ذاتِ الٰہی تو اللہ کا اپنا آپ ہے، اس کی کنہ اور حقیقت جس کو صرف وہی جانتا ہے۔ صفاتِ خداوندی اللہ کے وہ اوصاف و خواص ہیں، وہ اسماء ہیں جو اس نے اپنی نشانیوں کے وسیلے سے اپنی مخلوق پر منکشف کیے ہیں۔ یہ نشانیاں، یہ آیات اس کی کتابوں میں بھی ہیں اور عالمِ تکوین یعنی اس کائنات میں بھی۔ اس تناظر میں افعالِ خداوندی کیا ہوئے؟ افعالِ خداوندی کائنات کی وہ اشیاء اور حوادث و واقعات ہیں

جو اللہ کی فعالیت کے آثار ہیں۔

ان تین اصطلاحات کا باہمی تعلق جاننا ہو تو اپنی ذات پر ان کا اطلاق کر کے دیکھیے۔انسان کی ذات خود وہ انسان ہے بلا لحاظِ صفات یعنی اس سے قطع نظر کہ وہ مرد ہے یا عورت، بوڑھا ہے یا جوان، خوش مزاج ہے یا چڑچڑا، ذہین ہے یا غبی، طاقتور ہے یا کمزور۔صفات وہ اوصاف اور خاصیتیں ہیں جو اس انسان کو حاصل ہیں مثلاً، مرد ہونا، جوان ہونا، خوش مزاجی، ذہانت۔افعال ہر وہ عمل ہے جو ایک شخص کرتا ہے یا اس سے ظاہر ہوتا ہے اور ہم اس عمل سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ جوان، خوش مزاج اور ذہین ہے۔

یہاں ذرا غور کیجیے کہ افعال کا انحصار صفات پر ہے اور صفات کا دارومدار ذات پر۔خدا کا ذکر ہو، انسانوں کا تذکرہ ہو یا کسی بھی چیز کا معاملہ ہو یہ ترتیب درست مانی جائے گی۔ایک طالب علم اپنی جماعت میں حاضر ہوتا ہے، یہ ایک فعل ہے۔اس فعل کا انحصار بہت سی صفات پر ہے مثلاً حیات، علم، ارادہ، قوت اور گویائی کا ملکہ۔ان سب صفات کا ہونا مشروط ہے اس بات سے کہ ان صفات کا حامل، صاحبِ صفات کوئی شخص بھی ہو، ایک ذاتِ انسانی۔اگر ذاتِ انسانی، کوئی شخص ہی موجود نہ ہو تو صفات پر گفتگو بھی ممکن نہیں رہے گی۔

ایک اور مثال لیجیے۔آپ ایک بڑھئی ہیں اور مکان بناتے ہیں۔ذات آپ خود ہیں۔صفات میں چوبی تعمیر کا ہنر، مکان بنانے کا ارادہ اور ہتھوڑا، آری اٹھانے کی قوت شامل ہیں۔افعال میں وہ سب کام شامل ہوں گے جو آپ مکان بنانے کے لیے انجام دیں گے۔مآل کار مکان تیار ہو گا جیسے یہ ساری کائنات بن کر تیار ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ جب ہم اللہ کی،توحیدِ خداوندی کی بات کرتے ہیں تو بات تین مختلف سطحوں پر کی جاتی ہے۔سب سے پہلے ہم اس امر کا اثبات کرتے ہیں کہ ایک حقیقتِ واحدہ ہے (ذاتِ الٰہی) جو ظاہری اشیاء کی کثرت کے پردے میں پنہاں ہے۔اس کے بعد ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک (ذات) ہم پر کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارا یہ بیان صفات کہلائے گا۔تیسرے درجے پر ہم یہ بتاتے ہیں کہ یہ اشیاء، جو ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہیں، افعال ہیں اور ان کا عمل میں آنا منحصر ہے ان صفات پر جو ہم نے پہلے بیان کیں۔

افعالِ خداوندی کیا ہیں؟ وہ تمام اشیاء جو اس نے زمان ومکان کے اندر اس کائنات میں تخلیق کی ہیں۔ یہ دنیا، یہ کائنات اپنے زمان ومکان کی ساری پہنائی و گیرائی سمیت ایک لامحدود فعلِ الٰہی کی طرح ہے۔اس عمل سے،اس فعلِ خداوندی سے ہر وہ چیز جو اس دنیا کے بارے میں اللہ کے بے پایاں و لامنتہا علم میں ہے، خارج میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

ایک دوسرے زاویے سے نظر کیجیے تو یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ بس دو ہی چیزیں وجود رکھتی ہیں۔ ذاتِ خداوندی اور فعلِ خداوندی۔ جب اس تناظر میں بات کی جاتی ہے تو عموماً یوں کی جاتا ہے کہ اللہ ہے اور یا پھر ماسوی اللہ۔یوں ''ماسوی اللہ'' (اللہ کے علاوہ اور ہر شے )مترادف ٹھہرتا ہے کائنات کا یعنی تمام افعالِ خداوندی کا مجموعہ اور حاصل۔اس لحاظ سے دیکھیے تو خدا اور اس کائنات کے درمیان جو نسبت ،جو رشتہ قائم ہو گا اسے صفات یا اسماء کا نام دیا جائے گا۔صفات کی اپنی الگ ہستی نہیں ہے بلکہ ان کے حوالے سے انسانی ذہن یہ جان لیتا ہے کہ افعالِ خداوندی کا ذاتِ خداوندی سے کیا تعلق ہے۔

اپنے آپ کی مثال لیجیے۔بساطِ ہستی پر آپ ہیں یا پھر آپ کے سوا دوسرے لوگ۔آپ کی صفات اس بساطِ ہستی پر، آپ سے اور آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے الگ کوئی تیسری چیز نہیں ہیں۔آپ کی صفات کئی ہو سکتی ہیں، مثلاً چھوٹا بڑا، ماں بیٹی، ذہین احمق، مضبوط یا کمزور، درگذر کرنے والا یا کینہ پرور وغیرہ۔ پہاڑوں، سیاروں اور ستاروں کے مقابلے میں آپ چھوٹے ہیں، کیڑے مکوڑوں، جرثوموں اور ایٹمی ذرات کے مقابلے میں بڑے۔اپنی اولاد کے رشتے میں آپ ماں ہیں اور اپنی والدہ کے ناطے سے آپ ایک بیٹی۔اپنے دوستوں میں سے کچھ لوگوں کے مقابلے میں یا اپنے پالتو کتے اور مکھیوں کے مقابلے میں ذہین ہیں۔آپ کے شناسا لوگوں کے حلقے میں بعض لوگوں سے موازنہ کیا جائے یا ارسطو اور آئین سٹائین کے مقابلے میں رکھا جائے تو آپ کم عقل قرار پائیں گے۔کتے کا پلا آپ کی ٹانگ پر منہ مار دے تو آپ اسے چھوڑ دیتے ہیں اور مچھر خون چوسنے لگے تو اسے مارنے پر تل جاتے ہیں۔

آپ کی تمام صفات کا دارومدار اس پر ہے کہ دوسری اشیاء سے آپ کی کیا نسبت یا رشتہ قائم ہو رہا ہے۔اسی طرح خدا کی صفات کا تصور بھی تبھی ہو سکے گا جب اللہ اور ماسوی اللہ، خدا اور غیرِ خدا کے تعلق کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ دوسری اشیاء وہی ہیں جنہیں ماسوی اللہ کہا گیا ہے یعنی اللہ کے آثارِ افعال۔

## غیب و شہود

دنیا کے بارے میں قرآن جو بھی بتاتا ہے اسے آپ افعالِ خداوندی کا بیان کہہ سکتے ہیں۔لیکن قرآن میں دونوں طرح کے بیان ہیں، عمومی بھی اور خصوصی بھی۔کچھ آیات میں بہت سے افعال یا سبھی افعالِ خداوندی کا ذکر ہے جبکہ دوسری

آیات صرف ایک یا چند افعال کا تذکرہ کرتی ہیں۔قرآن میں افعالِ خداوندی کے بیان پر غور وفکر کر کے اور احادیث کی مدد سے نیز اپنے وقت کے تصورِ کائنات کے مطابق مسلم مفکرین اس نتیجے تک پہنچے کہ افعالِ خداوندی کو دو بنیادی اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔

بہت سی قرآنی آیات یہ کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ''عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَة'' (دیکھے اور اندیکھے کا جاننے والا) ہے۔صاف سی بات ہے کہ عالمِ ہستی میں جو کچھ ہے اسے یا تو ہم دیکھ سکتے ہیں یا نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے علم کی حدود وہی ہیں جو ہمارے دیکھنے، گرفت میں لینے، احاطہ کرنے، جانچنے پرکھنے اور تجزیہ کرنے کی حدود ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ عملاً ساری کائنات ہمارے علم سے باہر ہے کیونکہ ہمارے پاس اسے دیکھنے اور اپنی گرفت میں لانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔اس کے برعکس اللہ تعالیٰ ہر شے کو جانتا ہے خواہ ہم اسے دیکھ سکیں یا وہ ہمارے لیے اندیکھی چیز ہو۔

یاد رہے کہ قرآن جب ''الغیب'' (اندیکھا، غیر مرئی) کا ذکر کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد وہ نہیں ہوتا جس تک ہماری نگاہ کی عملاً رسائی نہیں ہے بلکہ وہ جس کی دید ہماری نظروں کے لیے اُصولاً ممکن نہیں ہے۔ہماری آنکھیں صرف مادی اشیاء کو دیکھ سکتی ہیں جبکہ کائنات کو لیجیے تو نہ صرف مادی اشیاء کی سطح پر اس کی حدود بے انتہا وسیع ہیں بلکہ غیر مادی چیزوں کی اقلیم میں بھی اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

قرآن کی دوسری سورت کے آغاز میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اہلِ تقویٰ میں سے ہیں، اللہ کے معاملے میں احتیاط سے چلتے ہیں اور ''غیب پر ایمان رکھتے ہیں''

(یُـومِـنُـونَ بِالغَیبِ) (۲:۴) چنانچہ اگر ارکانِ ایمان کو ایک لفظ میں سمیٹنا درکار ہو تو ہم اسے ''الغیب'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اللہ کی کتابیں ہمارے لیے ایک تحریری صورت میں دکھائی دینے والی چیز ہیں تاہم ان کے معانی ہمارے لیے غیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنی کتاب کے معانی کا فہم حاصل کرنے کے لیے وقت اور توانائی کا بیش از بیش سرمایہ صرف کیا ہے اور آج بھی اس سعی میں مصروف ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے حقیقت کی دو بنیادی اصناف کا تعین کیا ہے، مرئی حقیقت اور ان دیکھی حقیقت یا غیبی حقائق (الغیب absent) اور مشہود حقائق (الشہادۃ) یعنی حاضر و نظر آنے والے حقائق۔ الغیب کو ہم دو بنیادی اقسام میں بانٹ سکتے ہیں، خدا اور فرشتے۔ خدا کو خدا کے سوا کسی نے نہیں دیکھا جبکہ فرشتوں کو دوسرے فرشتے، خدا تعالیٰ اور بعض خاص لوگ مثلاً انبیاء بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے انسانوں کی اکثریت کے لیے تو غیبی مخلوق ہیں لیکن خود اپنے لیے اور اللہ تعالیٰ کے لیے مرئی ہیں، غیب نہیں ہیں۔

عالمِ مرئی وہ ہے جو ہمارے حواس کی گرفت میں آتا ہے۔ ہر وہ شے جسے ہم واقعی دیکھتے ہیں یا اُصولی طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ عالمِ مرئی یا عالمِ حس و شہادۃ کی پھر دو اقسام ہیں۔ کچھ چیزیں تو وہ ہیں جنہیں ہم سب دیکھتے ہیں اور دوسری قسم ان اشیاء کی ہے جنہیں دیکھنے میں سب لوگ شریک نہیں ہیں مثلاً خواب یا قابوس یا واہمے۔ خواب صرف خواب دیکھنے والے کو نظر آتا ہے۔ دنیا کا دوسرا کوئی شخص اسے نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ ہاں ہمارے خواب اللہ کے لیے غیر مرئی نہیں ہیں نہ ہی اُن فرشتوں کے لیے یہ خواب ان دیکھی چیز ہیں جن کا کام ہی خوابوں کی نگرانی کرنا ہے (اس لیے کہ

اپنے فرائض کے اعتبار سے فرشتوں کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں)۔مخلوقات کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں جن کا تعلق نیم مرئی دنیا سے ہے، یہ ہستیاں اکثر اوقات نظر نہیں آتیں لیکن بعض مواقع پر خود کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ جنات کا تعلق اسی قسم سے ہے (آگے چل کر ہم ان کے بارے میں مزید گفتگو کریں گے)

## ارض وسماء

کائنات پر گفتگو ہو تو قرآنی اصلاحات کا ایک اور جوڑا بکثرت استعمال ہوتا ہے: ارض وسماء (زمین اور آسمان)۔آسمان کی بات ہو رہی ہو تو یہ اہم نکتہ سامنے رہنا چاہیے کہ آسمان اور بہشت الگ الگ چیزیں ہیں۔اسلام میں جنت کے مقابل ہمیشہ جہنم یا دوزخ آتی ہے جبکہ آسمان کے مقابل اس کے الٹ یعنی زمین کا ذکر آتا ہے۔جنت دوزخ کا تعلق معاد یا آخرت سے ہے۔ان کا پورا اور حتمی تجربہ تو یومِ آخرت سے پہلے نہیں ہوسکتا۔جبکہ ارض وسما کائنات کی اس حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں وہ لمحۂ آفرینش سے لے کر یومِ آخر تک رہے گی۔جب وقتِ آخر آن لگے گا تو زمین وآسمان میں انقلاب آجائے گا، ان کی ماہیت بدل دی جائے گی۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (١٤:٤٨)

یاد رہے وہ دن جب یہ زمین ایک اور زمین سے بدلی جائے گی اور آسمان، اور لوگ نکل کر کھڑے ہوں گے اللہ کے سامنے، جو زبردست ہے، ایک ہے۔

قرآن میں سات آسمانوں کا ذکر ہے جن میں سے سات سیارے ہیں

(سیارہ عربی اور یونانی اصطلاح میں ''متحرک اجرامِ فلکی'' کا ہم معنی ہے)۔ یہاں یہ اہم بات پیشِ نظر رہے کہ ان اجرامِ فلکی کو جدید فلکیات کے معنی میں سیارے نہیں سمجھنا چاہیے۔ مسلمانوں میں اگرچہ اعلیٰ درجے کا علمِ فلکیات بھی پروان چڑھا لیکن قرآنی فلکیات ایک اور چیز ہے۔ یہ آیات وعلامات کی فلکیات ہے۔ دوربین وغیرہ کے بغیر انسانی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسی کو عالمِ غیب کے اُمور مثلاً خدا، فرشتے، آخرت کے بارے میں کچھ بتانے کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے۔ بنابریں قرآن میں آسمانوں کا ذکر اسی سطح تک رہتا ہے جس حد تک ایک انسان اپنے گھر کے صحن میں کھڑا ہو کر شبِ تاریک میں آسمان کا مشاہدہ کرتا ہے۔

بہتر ہوگا کہ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ ان لوگوں کے لیے آسمانوں میں معانی کا ایک خزینہ ہوتا ہے جو عالمِ طبعی میں فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر آسمان ان لوگوں کو صاف نظر بھی تو آتا تھا کہ نہ فضا اتنی کثیف اور آلودہ تھی نہ انسان کی بنائی ہوئی تیز روشنیاں نظر کو چکا چوند کیے رکھتی تھیں۔ جدید دنیا میں سائنسی معلومات نے ہمیں عالمِ طبعی کے براہ راست تجربے سے دور کر دیا ہے۔ اب ہم چیزوں کو ویسے نہیں دیکھتے جیسی وہ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس کے برعکس ہم ہر چیز کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جو ہمیں گرامر سکول نے تعلیم کی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہمیں اکثر کسی چیز کو دیکھنے میں دلچسپی ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہمارا خیال ہوتا ہے کہ سائنسدان، ماہرین ان کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور رہے ہم تو ہم گردوپیش کی اشیاء کے بارے میں کونسی پتے کی بات معلوم کر لیں گے! بہرکیف ہمارے ٹیلی ویژن سیٹوں کی سکرین پر کوندنے والی برقی روشنی ہمارے لیے کہیں زیادہ متحرک اور دلآویز ہے۔ ستارے ہمارا کیا دل لبھائیں گے جو بمشکل حرکت

کرتے ہیں۔(ٹیلی ویژن آنے سے پہلے لوگ رات میں کیا کیا کرتے تھے؟)

نیچے سے اوپر چلیے تو سات سیارے کچھ اس ترتیب میں ہوں گے: قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مریخ، مشتری، اور زحل۔ ہر سیارہ اپنے اپنے **فلک** میں محوِخرام ہے۔ روایتی طور پر ان افلاک میں دو افلاک اور بھی گنوائے جاتے ہیں، عرش و کرسی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرش و کرسی **فلکِ** ستارگان اور فلکِ بے اجرام کا دوسرا نام ہے۔ قرآن میں ''کرسی'' کا ذکر صرف ایک مرتبہ آیا ہے اور یہ آیت قرآن کی مشہور ترین آیات میں سے ہے۔ آپ نے اسی آیت کو اکثر مساجد اور مزارات میں کندہ دیکھا ہوگا۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِط مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَج وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَج وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ج وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۲:۲۵۵)

اللہ! اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ جیتا جاگتا، سب کو تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمان میں ہے اور زمین میں۔ کون ایسا ہے جو اس اذن کے بغیر اس سے کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو خلق کے روبرو ہے اور جو اس کے پیٹھ پیچھے۔ اور یہ اس کے علم میں سے کچھ بھی نہیں گھیر سکتے۔ سوائے اس کے جو وہ چاہے۔ سمائی ہے اس کی کرسی میں زمین و آسمان کی اور ان کے سنبھالنے سے وہ تھکتا نہیں اور وہی ہے سب

سے اُوپر، بزرگ و برتر۔

ذرا غور کیجیے کہ قرآن ان آیات میں کائنات کے بارے میں کچھ نہیں کہ رہا۔ بات صفاتِ خداوندی کی ہو رہی ہے۔ اللہ کو ہر شے کا علم ہے لیکن انسانوں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اللہ نے اسے بتایا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کا علم متعین اور محدود ہے، علمِ خداوندی بے قیاس و بے کراں۔ اس کے بعد ان آیات میں کائنات کا یونہی ضمناً ذکر آیا ہے "السموات والارض"۔ اور یہ کہا گیا کہ اللہ کی کرسی زمین و آسمان پر محیط ہے۔ "کرسی" وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے "قدم" رکھے ہوئے ہیں۔ اگر اللہ کے "قدم" کائنات سے وراء پائے جاتے ہیں تو اس کا "سر" کہاں ہوگا؟ اللہ کا نہ سر ہے نہ قدم، کم از کم انسانوں کی طرح کے تو بالکل نہیں لیکن اس تمثیل میں ہماری کائنات سے اس کی نسبت کا اشارہ ملتا ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز سب سے فروتر ہے وہ کائنات کی ارفع ترین سطح سے بھی بلند تر ہے۔ انسانوں سے معاملہ کرنے کے لیے اللہ کو کہاں تک نیچے آنا پڑتا ہے، دوسری طرف انسان اگر خدا کی طلب میں نکلے تو اسے کتنا اوپر اٹھنا ہوتا ہے؟

کرسی کا مقام عرشِ خداوندی سے نیچے ہے۔ عرشِ خداوندی وہ ہے جہاں زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد شہنشاہِ عالم فروکش ہوئے۔ قرآن میں ۲۱ مقامات پر عرش کا تذکرہ ہے اور سبھی جگہ قدرتِ خداوندی اور اللہ کی بادشاہی کی طرف اشارہ ہے۔ شاید جلالِ بادشاہی اور قہرِ سلطانی کے تلازمات اور مفاہیم کو متوازن کرنے کی غرض سے ایسا کیا گیا ہے کہ قرآن میں صرف ایک اسمِ خداوندی کو براہِ راست عرش سے متعلق کہا گیا ہے یعنی الرحمٰن۔

اللہ تعالی دیگر بادشاہوں کی طرح نہیں ہے جن کی اوّلین خاصیت جلال و

غضبنا کی ہوا کرتی ہے۔اس کے برعکس اللہ وہ شہنشاہِ عالم ہے جس کا کرم اس کے قہر پر غالب ہے۔یاد رہے کہ عرشِ خداوندی پر لکھا ہوا ہے ''رحمتی سبقت غضبی'' اللہ کا قانون اس کے بندوں کے لیے خیر کے سوا اور کچھ نہیں۔اس لیے قرآن میں عرش کا تصور ایسا ہے جس میں جلال و جمال کی صفات دونوں کا امتزاج ہے۔وہ شے جو ساری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہو اس کے لیے یہ نہایت مناسب ہے کیونکہ کائنات پر دونوں طرح کی صفات کی فرمانروائی ہے۔

زنہار یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن میں جہاں آسمانوں کا ذکر آیا ہے وہاں نظامِ شمسی کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ہر آسمان کا ایک سیارہ ہے اور یہ سیارہ دیکھا جاتا ہے لیکن آسمان خود غیر مرئی ہیں۔کچھ احادیث میں اس امر کی وضاحت ہوتی ہے ہے مثلاً وہ تمام احادیث جن میں آنحضرتؐ کے سفرِ معراج کا ذکر ہے۔قرآن میں اس سفر کا تذکرہ تین جگہ آیا ہے۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِالۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (۱۷:۱)

پاک ذات ہے، جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا اس ادب والی مسجد سے اُس ادب والی مسجد تک جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں تا کہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔

''معراج'' کے لفظی معنی ہیں زینہ یا سیڑھی۔حضرتِ یعقوبؑ نے جو سیڑھی زمین سے آسمان تک بلند ہوتی دیکھی تھی، جس سے فرشتے آتے تھے اور جاتے تھے (باب پیدائش ۱۲:۲۸) معراج کا مذکورہ تصور اس سے غیر متعلق نہیں ہے۔رسول اللہؐ

کو اس سیڑھی سے اللہ تک لے جایا گیا اور اسی سیڑھی سے آپؐ اپنے لوگوں میں واپس آئے تا کہ پیغامِ خداوندی کی تکمیل کریں۔

سفرِ معراج مختصراً یوں ہے کہ ایک رات آپؐ کو حضرت جبرئیل نے نیند سے جگایا اور ہمراہ لے چلے۔ آپؐ کو براق پر سوار کروایا۔ براق وہ پروں والا گھوڑا تھا جو ہر گام حدِ نگاہ تک کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ اس مرکبِ تیز گام نے چند قدم میں یروشلم کے معبد تک پہنچا دیا جہاں آدمؑ سے عیسیٰؑ تک تمام انبیاء یکجا تھے۔ اس معبد کو قرآن نے مسجدِ اقصیٰ کا نام دیا ہے۔ وہاں آپؐ نے نماز پڑھی۔ تمام انبیاء نے آپؐ کی امامت میں نماز ادا کی۔

حضرت جبرئیل نے آپ کا ہاتھ تھاما اور آپؐ فلکِ قمر کی طرف بلند ہو گئے۔ جبرئیل نے درِ فلک پر دستک دی، آواز آئی ''کون ہے''؟ جبرئیل نے بولنے والے کو یقین دلایا کہ ان کو بلوایا گیا ہے۔ اجازت ملنے پر حضور کو لے کر اندر داخل ہوئے۔ سیدنا آدمؑ آپؐ کے منتظر تھے۔ جبرئیل نے تعارف کروایا۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا ''مرحبا اے فرزندِ صالح اور رسولِ صالح'' جبرئیل اور محمد رسول اللہؐ اس سے آگے سفر جاری رکھتے ہیں۔ باقی کے تمام چھ افلاک میں ان کی ملاقات ایک یا ایک سے زیادہ انبیاء سے ہوتی ہے۔ سیرِ افلاک سے گزر کے آپؐ نے جنت و جہنم دونوں کو دیکھا۔ عہدِ حاضر کے چند اہلِ علم نے اشارہ کیا ہے کہ معراج نبیؐ کے بیان کے مطالعے سے دانتے کے ہاں طربیۂ خداوندی (Divine Comedy) میں جنت دوزخ کی تصویر کشی کا خیال پیدا ہوا تھا۔

جنت کا آخری کنارا شاید عرشِ خداوندی سے ذرا ہی نیچے ہے۔ یہاں تک پہنچے تو جبرئیل نے کہا کہ اس مقام سے آگے رسولِ خداؐ کو بارگاہِ خداوندی میں تنہا

جانا ہوگا۔جبرئیل اگراس سے آگے بڑھے تو ان کے پر جل جائیں گے۔سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس ماورائے قیاس نور کے سامنے حاضر ہوگئے جو بیان میں نہیں سما سکتا۔اس کے بعد کی ہمیں خبر نہیں۔واپسی پر جبرئیل پھر آپ کے ہمراہ ہوئے اور ہر آسمان پر رکتے ہوئے ،اس فلک پر مقیم نبی کوالوداع کہ کر واپس لوٹ آئے۔۱۷

سفرِ معراج کے اس بیان سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ افلاک کی اس بحث کا ان سیاروں سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے جن سے ہم آشنا ہیں۔بعض مسلمان علماء نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بیانیہ علامتی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر فلک ایک الگ درجۂ وجود کا حوالہ ہے۔مختلف افلاک جداگانہ مراتبِ ہستی کے نمائندہ ہیں اور ہر مرتبۂ ہستی میں مختلف صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے۔سفرِ معراج میں سیدنا محمد کی ملاقات جن انبیاء سے ہوئی ان میں سے ہر نبی مجموعی پیامِ خداوندی کے ایک جزو کا نمائندہ تھا یا یوں کہیے کہ ان آیاتِ خداوندی کی کلیت کے ایک حصے کی نمائندگی کرتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں یا کائنات میں ظاہر کی ہیں۔کسی مسلمان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ آیا ہوگا کہ سیدنا آدمؑ ،سیدنا موسیٰ ،سیدنا ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء ان سیاروں پر رہتے ہیں،کم از کم ان سیاروں پر تو ہرگز نہیں جو جدید علمِ فلکیات کے نظام میں پائے جاتے ہیں۔ان کے لیے تو آسمان میں آوارہ خرام یہ سیارے اللہ کی نشانیاں ہیں جو عالمِ ہستی کو پیغاماتِ خداوندی سے معمور رکھتے ہیں۔ افلاک ایک علامت ہیں اور ان بلند تر اقالیمِ ہستی کی نشاندہی کرتے ہیں جو سیر الی اللہ کے مسافروں کے راہ میں آتی ہیں۔آگے چل کر ہم دیکھیں گے تمام اہلِ ایمان کو موت کے فوراً بعد انہیں تمام آسمانوں سے گزارا جاتا ہے۔اس سفر کے بعد وہ اپنی قبر میں اتر کر روزِ محشر کا انتظار کھینچتے ہیں۔۱۸

زمین و آسمان کی بحث میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اللہ کی تخلیق کردہ اس دنیا کی چیزوں کی باہمی نسبت کیا ہے یا یوں کہیے کہ اللہ کے سامنے سر افگندہ و فرمانبردار اس کائنات میں کیا درجہ بندی اور نظامِ مراتب متعین ہوتا ہے۔ کائنات سے اللہ کی کیا نسبت اور تعلق ہے اسے سمجھنے کے لیے ہم ایک طرف تو اللہ کی صفات کو کائنات کے خواص کے برعکس دیکھتے ہیں (تنزیہ) اور دوسری جانب یہ دکھاتے ہیں کہ دونوں اطراف کے اوصاف و صفات میں کسی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے (تشبیہ)۔ اسی طرح مخلوقاتِ خداوندی کی باہمی نسبتوں کو جاننے کے لیے ہم تنزیہ و تشبیہ کے مذکورہ بالا تعلق سے کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں اور اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ زمین و آسمان کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا خدا اور کائنات کا۔ آسمان اور زمین میں ایک بہت چھوٹے پیمانے پر وہی نسبت ہے جو خدا اور کائنات کے درمیان پائی جاتی ہے۔

مسلمان مفکرین جب زمین و آسمان پر صفاتِ تنزیہ کے حوالے سے غور کرتے ہیں تو ان دونوں کو ایک دوسرے کے الٹ صفات سے موصوف کرتے ہیں: بلند و پست، روشن و تاریک، قوی اور کمزور، فاعل و منفعل، دینے والا / پانے والا۔ جب وہ صفاتِ تشبیہ پر زور دیتے ہیں تو بیان کا رخ اس جانب ہوتا ہے کہ آسمان کی صفات زمین میں بھی پائی جاتی ہیں البتہ ان میں آسمان والی بات نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ ''الخالق'' ہے۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (۳:۳۵)

کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوا۔

سوال کا اسلوب خطابیہ ہے۔ کسی کو اس امر میں شبہ نہیں کہ جواب نفی میں ہے۔

آیت کا زور اللہ کی تنزیہ پر ہے۔دوسری جانب ایک اور آیت میں یوں آیا ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰالِقِيْنَ (۲۳:۱٤)

سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ دوسری چیز بھی صفتِ تخلیق میں کسی حد تک شریک ہیں۔ کائنات میں اگر کہیں صفاتِ تخلیق نمودار ہوئی ہیں تو آسمان ہی میں۔اس کے برعکس زمینی صفات کا انحصار آسمان کے فعل کی قبولیت پر ہے۔تاہم آسمان کو بھی زمین درکار رہے کہ اگر زمین نہ ہو تو آسمان کو اپنا ہنر دکھانے کے لیے میدان ہی میسر نہ ہو گا۔

آسمان ایک مرتکز، مجمل اور غیر مادی قوت کا نمائندہ ہے جبکہ زمین منتشر، مفصل اور مادی علامات و آیات کا مجموعہ ہے جن سے آسمان کی اندیکھی قوت کا ظہور ہوتا ہے۔صفاتِ آسمانی کا قرآنی استعارہ آبِ زلال ہے، صاف اور بے آلائش۔آسمان جب پانی برساتا ہے تو اس بارانِ سماوی سے زندگی کی ان گنت صورتیں جنم لیتی ہیں۔قرآن کے الفاظ میں:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۳۰:۲۱)

اور ہم نے پانی سے ہر شے کو زندہ کیا۔

بہت سے مسلمان مفکرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا مدلول صرف نباتات اور حیوانات ہی نہیں ہیں۔اس کا اشارہ تمام مخلوقات کی جانب بھی ہے کیونکہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے گن گاتی ہے جیسا کہ قرآن میں بارہا آیا ہے۔جب تک کوئی شے ذی حیات نہ ہو اسے تسبیح پر قدرت کیسے ہو گی۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ (٦:٩٩)

اور اسی نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر ہم نے اس سے ہر اُگنے والی چیز نکالی۔

وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (٢٢:٥)

اور تم زمین کو دیکھتے ہو دبی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اس پر پانی اُتارا، وہ تازہ ہو کر اُبھری اور اُگائیں بھانت بھانت کی خوشنما چیزیں۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِّنُحْيِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (٢٥:٤٨)

اور ہم نے اُتارا آسمان سے ستھرا پانی کہ اس سے دھرتی کو جو مر گئی تھی پھر سے زندہ کر دیں۔

آسمان سے برسنے والا پانی اگر ''ماءِ طھور'' (نرمل، ستھرا پانی) ہے تو ساتھ ہی ساتھ اپنی اجمالی نوعیت کی بنا پر ''ایک'' بھی ہے۔ جب زمین یہ پانی پی جاتی ہے تبھی اس پانی سے کثرت اور تنوع کی نمو ہوتی ہے،

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ (١٣:٤)

اور زمین میں کئی کھیت ملے ہوئے، اور باغ ہیں انگور کے، اور کھیتی، اور کھجوریں جڑواں اور اکہری، سب کو پانی ایک ہی ملتا ہے۔

سرزمین اس جگہ کی نمائندہ ٹھہری جہاں آسمان کے خواص ظاہر ہوتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے زمین و آسمان مل کر (یعنی پوری کائنات) اللہ کی نشانیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آسمان اللہ سے قریب تر ہے، زمین دور افتادہ۔ پس آسمان ہمارے ذہن کو تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے جبکہ زمین پر صفاتِ تنزیہ کا غلبہ ہے۔ لیکن زمین میں بھی اللہ کی صفات جمال و رحمت کی نشانیاں ہیں۔ ارضِ ثمر بار کی آغوش میں جتنی نعمتیں ہیں وہ انہی صفات کا ظہور ہیں چنانچہ زمین کو بھی تشبیہ کے نقطۂ نظر سے دیکھنا لازمی ٹھہرتا ہے۔ دوسری طرف آسمان ''تنزیہ'' سے آزاد نہیں ہے کیونکہ

كُلُّ شَيءٍ هَالِكٌ الاوَجُهه (۲۸:۸۸)

ہر شے فنا ہے سوائے اس کی ذات کے۔

اِن مٹ جانے والوں میں زمین و آسمان بھی شامل ہیں۔

زمین و آسمان میں اللہ کی نشانیاں کیونکہ ظاہر ہوتی ہیں ہمیں اس موضوع پر قرآنی تعلیمات کا جائزہ لینا ہو تو بات کا کوئی کنارہ نہیں ہوگا۔ یہ مبحث سارے کا سارا توحید ہی کا بیان ہوگا لیکن ہم فی الوقت ایک خاص تصور پر توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں جو حدیثِ جبرئیل میں مذکور ہوا ہے یعنی فرشتے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ نبوت و معاد کی نسبت فرشتوں کا تعلق ''توحید'' سے زیادہ ہے اگر چہ ان دو اقالیم میں بھی ان کی ایک اہم حیثیت ہے۔ اب ہم آپ سے عرض کریں گے کہ ملائکہ کا قرآنی تصور کس طرح مسلمانوں کے تصورِ خدا کی تشکیل اور ان کے تصورِ کائنات نیز تصورِ انسان کی صورت گری کرتا ہے۔

# فرشتے

حدیثِ جبرئیل میں رسولِ خدا نے فرمایا تھا ''اور تم ایمان لاؤ اللہ کے فرشتوں پر''۔ اللہ کا تصور نہ ہو تو اللہ پر ایمان لانا بے معنی ہے۔ اسی طرح جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ فرشتے ہوتے کیا ہیں اس وقت تک ان پر ایمان لانے کے بھی کوئی معنی نہ ہوں گے۔ فرشتوں کا اسلامی تصور اگر سمجھنا ہو تو ہمارے معاشرے میں فرشتوں کے بارے میں چلتے ہوئے خیالات کسی طرح مددگار ثابت نہیں ہو سکتے جیسے تصورِ الٰہ کے فہم کے لیے لوگوں کے مروجہ خیالات پر انحصار کرنا بے سود رہتا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ کندھوں سے پر اُگائے، تیر اندازی کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے لڑکے یا رباب بجاتی ہوئی یونانی دوشیزاؤں کی قسم کی ذہنی تصویروں سے آغازِ کلام ہی میں پیچھا چھڑا لیا جائے۔

عربی کا لفظ ''مَلَک'' (عبرانی لفظ مَلَاکَی طرح) وہی معنی رکھتا ہے جو یونانی لفظ Angelos کے ہیں یعنی فرستادہ، پیام بر۔ قرآن میں یہ اصطلاح، عموماً صیغۂ جمع میں آئی ہے اور لگ بھگ ۹۰ مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ بہت سے فرشتوں کا قرآن نے نام لے کر بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً جبرئیل، میکائیل، ہاروت و ماروت۔ اس کے علاوہ کئی طرح کے فرشتوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے کہ جن سے ان کے فرائض یا کارِ منصبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس زمرے میں جو الفاظ آتے ہیں ان میں مندرجہ ذیل اسماء اور دیگر نام شامل ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| ''تالیات'' (تلاوت کرنے والے) | ''سٰبِحٰت'' (تیرنے والے) | |
| ''صٰفّٰت'' (صفیں باندھے ہوئے) | ''زاجرٰت'' (ڈانٹنے والے) | |
| ''سٰبقٰت'' (آگے بڑھنے والے) | ''نٰشطات'' (چھڑا دینے والے) | |

| | | | |
|---|---|---|---|
| "نازعات" | (گھسیٹ لانے والے) | "حافظین" | (حفاظت کرنے والے |
| "کراماً کاتبین" | (معزز لکھنے والے) | "ملك الموت" | (موت کا فرشتہ) |
| "رِضْوَان" | (رضوان) | "حاملین" | (اٹھانے والے) |
| "مُقَرَّبُون" | (قریب کیے گئے) | "مُدَبِّرَات" | (تدبیر کرنے والے) |
| "ملقیات" | (ڈالنے والے) | "مُعَقِّبٰت" | (پیچھا کرنے والے) |

قرآن میں ان فرشتوں کا ذکر یونہی گذرتے ہوئے ہوا ہے۔ان کی شرح ووضاحت کے لیے قرآن کی تفاسیر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔بہر کیف ایک بات شروع سے نظر میں رہنا چاہیے کہ قرآن میں فرشتوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔

اپنے معاشرے پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فی زمانہ کم ہی لوگ ایسے ہیں جو فرشتوں کو سنجیدگی سے مانتے ہیں خواہ اس موضوع پر چلتی ہوئی کتابوں کی تعداد بڑھتی ہی کیوں نہ جا رہی ہو۔عیسوی الٰہیات کے بہت سے ماہرین تو اس انداز میں سوچتے ہیں گویا فرشتوں کا معاملہ پرانے وقتوں کی توہم پرستی کی ایک تلچھٹ ہے یا بہت ہوا تو اسے ایک علامتی چیز کہہ دیا جاتا ہے جو اب زائد از ضرورت ہو چکی ہے۔روایتی مسلمان کے ذہن میں فرشتے ایک ہر دم حاضر و موجود حقیقت ہیں اور جیسے جیسے ایک مسلمان علم وعمل کے وسیلے سے اپنے دین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرتا ہے ویسے ویسے فرشتوں پر اس کا اعتقاد بھی پختہ ہوتا جاتا ہے۔فرشتوں کے وجود کو مانے بغیر تو نماز بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔نماز ختم کر کے نماز پڑھنے والا شخص دائیں جانب منہ موڑ کر کہتا ہے ''السلام علیکم'' خواہ وہ تنہا ہی نماز پڑھ رہا ہو۔اس کا سبب یہ ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ ان فرشتوں پر سلام بھیجنا بھی ضروری ہے جو ہر نمازی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

فرشتے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔خدا کے حضور میں فرشتے ہیں جو اس کا عرش اٹھائے ہوئے ہیں یا جو اس کے عرش کے گرد گھوم کر اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ فرشتے تخلیقِ آدم کے شاہد بنے اور ایک فرشتہ رحمِ مادر میں انسانی جنین کو روحِ انسانی سے بارآور کرتا ہے۔انسان کا وقتِ آخر آن لگے تو مرنے کے بعد اسے سب سے پہلے جو نظر آتا ہے وہ فرشتے ہی ہوتے ہیں جن میں سب سے بڑے فرشتے یعنی فرشتۂ اجل کا نام ہے عزرائیل۔

## فرستادگانِ غیب

فرشتے کرتے کیا ہیں؟ ان کا بنیادی کام ہے پیغام لانا۔مزید یہ کہ وہ اللہ کے احکامات بجالاتے ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ ہم ''پیغام'' کے لفظ کو اس کے وسیع معنی میں استعمال کریں۔وہ معنی جو اس کے عنوان ''مَلک'' میں مضمر ہیں۔اسی طرح جیسے ''اسلام'' اور دیگر اہم اصطلاحات کو وسیع معانی میں برتنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ پیغام بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم عام طور پر پیغام نہیں سمجھتے۔مثال کے طور پر فرشتوں کے لائے ہوئے معدودے چند پیغام ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی تحریری یا زبانی صحیفہ دیا جاتا ہے۔الواح اور کتابیں صرف انبیاء کو عطا کی جاتی ہیں۔

اللہ کی کتابیں جو رسولوں کی دی جاتی ہیں ان کو لانے کا فریضہ ایک خاص فرشتے کے سپرد ہے جس کا نام جبرئیل ہے۔یہ فرشتۂ وحی ہیں۔یہاں پھر یہ بات ملحوظ رہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ جبرئیل اللہ کی کتابیں لانے پر مامور ہیں تو اس بات کو نرے لفظی معنی میں نہیں لینا چاہیے۔صحیفۂ خداوندی کو اس کے وسیع معنی میں سمجھنا ضروری ہے۔اللہ کی کتاب کلام اللہ یا کلمۃ اللہ ہے جو نوعِ انسانی کو سعادتِ

ابدی کی منزل کی راہ دکھانے کے لیے اللہ نے منکشف کیا ہے۔پس صحیفۂ خداوندی کو عام معنی میں کتاب ہونا لازم نہیں۔اللہ کا کلام کسی بھی صورت و ہیئت میں ہوا سے صحیفہ کہا جاسکتا ہے۔

پیامِ خداوندی چونکہ لازماً کتابی شکل میں نہیں ہوتا لہٰذا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کا پیغام صورتِ بشری میں ظاہر ہو۔قرآن کی جن آیات میں سیدنا عیسیٰؑ اور حضرت جبرئیل کے تعلق کا ذکر ہے انہیں سمجھنے میں یہ نکتہ معاون ہوسکتا ہے۔قرآن نے تمام انبیاء اور رسولوں میں صرف سیدنا عیسیٰؑ کو ''کلمتہ اللہ'' (اللہ کا کہا ہوا) کے نام سے یاد کیا ہے۔اس لیے ان کو صحیفۂ خداوندی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔نیز فرشتوں کے ایک طبقے کو قرآن نے ''ملقیات'' (ڈالنے والے، Casters) کا نام دیا ہے کیونکہ وہ لوگوں کو پیغاماتِ خداوندی کا القا کرتے ہیں، ان کے (دل میں) ڈالتے ہیں۔چنانچہ فطری سی بات ہے کہ حضرت جبرئیل جو محمد رسول اللہؐ کے لیے قرآن لائے وہی فرشتہ تھے جن کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمے کو سیدۃ مریم علیہا السلام کے لیے القا کیا۔یہ جبرئیل ہی تھے جنہوں نے سیدہ مریم کو ولادت مسیح کی خوشخبری دی تھی۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹:۱۷)

ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو اس کے سامنے پورا آدمی بن کے آیا۔

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ (۴:۱۷۱)

مسیح، عیسیٰ ابن مریم، اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلام جو اللہ نے مریم کی

طرف القاء کیا اور عیسیٰ ہیں روح اللہ کے ہاں کی۔

فرشتوں کے لائے ہوئے پیامِ ربانی زیادہ تر کتاب کی بجائے واقعات یا حوادثِ مادی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ تمام مخلوقات کو کلماتِ الٰہی (اللہ کی بات) قرار دیا جا سکتا ہے۔اس اعتبار سے دیکھیے تو ساری مخلوق اللہ کے بھیجے ہوئے پیغاماتِ الٰہی کے برابر ٹھہرائی جائے گی۔بہ الفاظِ دیگر ہر شے اللہ کی ایک نشانی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر شے ہمیں اللہ کے بارے میں کچھ بتاتی ہے۔اللہ کی معرفت کوئی بے ترتیب و نظام چیز نہیں ہے۔علم دینے والی ذات خود اللہ کی ہے جس نے یہ نشانیاں اسی غرض سے تخلیق کیں ہیں کہ ان کے وسیلے اسے جانا جائے۔چنانچہ ''آیت'' یا نشانی کا لفظ جو طبعی مظاہر، صحائفِ خداوندی اور معجزات سبھی کی طرف اشارہ کرتا ہے اسے ''پیام'' کا قریب قریب مترادف کہا جا سکتا ہے۔

اگر فرشتے اللہ کے پیغام لاتے ہیں تو ان کا کچھ نہ کچھ تعلق اللہ کی نشانیوں سے بھی ہوگا۔ہر آیت، ہر نشانی، ہر مخلوق کی پشت پر ایک فرشتہ موجود ہوتا ہے۔بعض روایات میں آیا ہے کہ ہر چیز کا ایک فرشتہ ہوتا ہے اور بارش کے ہر قطرے کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے۔ایسا ہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر فرشتے اللہ کے پیام بر ہیں، اس کے پیغامات لاتے ہیں اور ہر شے اللہ کے پیغامات میں سے ایک ہے تو پھر اس کے سوا کیونکر ممکن ہوگا؟

خلاصہ یہ کہ ''توحید'' کی روشنی میں اللہ کی آیات پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فرشتے اس مرئی کائنات اور اللہ یعنی خالق کائنات کے مابین وسیلے اور واسطے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں۔لیکن چونکہ فرشتے خود بھی مخلوق ہیں لہٰذا ان

کا تعلق غیب کے عالم سے ہے۔پس فرشتے وہ آسمانی مخلوق ہیں جو الوہی دنیا اور زمینی دنیا کے بیچ میں ہیں۔

مسلمان مصنفین نے اس معاملے میں قرآن و حدیث پر جو غور کیا ہے اس کے نتیجے میں ان کے ہاں فرشتوں کے طبقات یا اقسام کے بارے میں کئی طرح کی درجہ بندی ملتی ہے۔یہ وہ اقسام ہیں جن سے یہ کائنات معمور ہے۔ایک مصنف نے مثلاً چودہ بڑی اقسام یا چودہ طبقے بیان کیے ہیں اور ان میں کوئی باہمی تعلق بھی نہیں دکھایا گیا (مثلاً نمبر شمار دو سے سات تک کے طبقات کو مشترکہ طور پر مقرب فرشتے archangels کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ "اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْش"(۴:۷)(جو لوگ اُٹھا رہے ہیں عرش)

۲۔ الروح، جسے بزرگ ترین فرشتہ کہا گیا ہے۔

۳۔ اسرافیل، جو دو مرتبہ صور پھونکیں گے، جب زمانے کا آخری وقت آن لگے گا۔پہلی صدا پر زمین و آسمان میں جو بھی ہو گا بے ہوش ہو جائے گا۔دوسری مرتبہ پھونکتے ہی سب لوگ اٹھا کر اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

۴۔ جبرئیل، فرشتۂ وحی

۵۔ میکائیل (۲:۹۸) جو جسم و جان کا رزق فراہم کرتے ہیں۔

۶۔ عزرائیل، موت کا فرشتہ

۷۔ کروبیان، جنہیں مخلوق کی کوئی خبر نہیں ہے اور وہ ہر آن مشاہدۂ حق میں غرق رہتے ہیں۔

۸۔ سات آسمانوں کے فرشتے۔

۹۔ محافظ فرشتے۔"وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ کِراماً کاتبین"(۸۲:۱۱)ان میں سے دو فرشتے ہر شخص پر مامور ہوتے ہیں، ایک اچھے اعمال لکھتا جاتا ہے جبکہ دوسرا فرشتہ اعمالِ بد درج کرتا ہے۔

۱۰۔ نگران فرشتے"لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَمِنۡ خَلۡفِہٖ "(۱۳:۱۱)جو برکات نازل کرتے ہیں اور مخلوق کی خبر لے کر اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔

۱۱۔ منکر اور نکیر جو قبر میں مردے سے سوال کرتے ہیں۔

۱۲۔ سفر کرنے والے فرشتے جو دنیا میں گھومتے رہتے ہیں اور وہ جگہیں تلاش کرتے ہیں جہاں لوگ اللہ کی یاد کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہوں۔

۱۳۔ ہاروت و ماروت دو فرشتے جو اہلِ بابل پر نازل کیے گئے تھے اور انہیں جادو سکھاتے تھے۔

۱۴۔ وہ فرشتے جو عالمِ ہستی کی ہر شے پر مامور کیے گئے ہیں، نظام برقرار رکھتے ہیں اور فساد سے بچاتے ہیں۔ان کی تعداد کا علم صرف اللہ کو ہے۔[۱۹]

## نور

رسول خداؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے فرشتوں کو نور پیدا کیا ہے۔"النور"اللہ کا ایک نام ہے اور قرآن میں آیا ہے کہ"اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ" (۲۴:۳۵) (اللہ ہی زمین و آسمان کی روشنی ہے)۔فرشتے کیا ہیں؟ یہ سمجھنا ہو تو یہ جاننا ہوگا کہ نور کیا ہے؟ نور کو طبعی، مادی چیز کے طور پر لینا چنداں سودمند نہ ہوگا۔اس کے بجائے

اس بات پر غور کیجیے کہ جب ہم نور یا روشنی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو کیا کیا نشانیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

نور کو عام طور پر مرئی یا دکھائی دینے والی چیز سمجھا جاتا ہے جبکہ اصل میں نور غیر مرئی ہے۔ نور تبھی نظر آتا ہے جب اس میں تاریکی کی آمیزش ہو۔ تیرگی اگر نہ ہو اور صرف نور ہی ہو تو اس کی شدت سے نظر چندھیا کر رہ جائے گی۔ ذرا غور کیجیے کہ سورج ۹۳ ملین میل کے فاصلے پر ہے اور اس پر ہم زمین کے گرداگرد پھیلی فضا کو چیر کر نگاہ ڈالتے ہیں اس کے باوجود سورج پر نظر جما کر دیکھیے تو کیا گزرتی ہے؟ اس فضا سے باہر نکل جائیں اور سورج سے صرف چند میل اور قریب ہو کر اسے دیکھنے کی کوشش کریں تو شاید ایک نگاہِ غلط ڈالنے کے خمیازے کے طور پر بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ نور جسے ہم مرئی کہتے ہیں یہ تو ایک دھندلی سی چیز ہے۔ سورج کی کھری، اَن چھنی روشنی سے اس کا کیا مقابلہ۔ نورِ ربانی کی تو بات ہی نہ کیجیے جس کے پرتو سے یہ ساری کائنات روشن ہے۔ اس لیے اسلام میں کہا گیا ہے اللہ کا نور اتنا تابندہ و درخشاں ہے کہ اس نے لوگوں کی نگاہ خیرہ کر رکھی ہے۔

خدا کو کسی نے دیکھا نہیں، فرشتے اندیکھی مخلوق ہیں اور نور غیر مرئی ہے۔ سو اس میں تعجب کیا کہ اگر اللہ اور فرشتے نور ہیں۔ آپ اعتراض اٹھا سکتے ہیں کہ ہم ہر طرف نور کی چمک دیکھتے ہیں مگر ہم نے خدا یا فرشتے تو کبھی نہیں دیکھے۔ کیا واقعی؟ ''توحید'' کا مطلب ہے کہ آیاتِ ربانی اللہ کی تنویر کے سوا اور کچھ نہیں ہیں اور ساری مخلوق اللہ کی قوتِ تخلیق کے خارجی آثار ہیں اور بس۔ ''اللہ زمین و آسمان کا نور ہے'' اور زمین و آسمان اسی نور کا پرتو یا اسی کی دمک اور ضوفشانی ہیں۔

نور غیر مرئی ہے لیکن اس شے کے بنا ہم کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں۔ سو نور کی

تعریف یہ ٹھہری کہ نور وہ غیر مرئی شے ہیں جو دوسری اشیاء کو مرئی بنا دیتی ہے۔ اسی طرح خدا اور فرشتے غیر مرئی ہیں لیکن یہ نہ ہوں تو کائنات بھی نہ ہو۔ پس خدا اور فرشتوں کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان دیکھی چیزیں جو اس کائنات کو مرئی بنا دیتی ہیں۔

نور کا الٹ ہے ظلمت یا تاریکی۔ تاریکی محض نور کا غیاب ہے۔ دوسرے الفاظ میں نور ایک شے ہے مگر تیرگی لاشئی۔ ہم دنیا کی اشیاء اس لیے دیکھ پاتے ہیں کہ ان میں ایک لاشئی کو شے سے آمیخت کیا گیا ہے۔ اگر صرف نور ہی ہوتا یا صرف ظلمت اور تیرگی ہی ہوتی تو ہم کچھ نہ دیکھ پاتے۔ جب روشنی و تیرگی یکجا ہوں تبھی کچھ سجھائی دیتا ہے، تبھی نظر اپنا کام کرتی ہے۔

اللہ نور ہے۔ نور کا متضاد تاریکی ہے جو کچھ بھی نہیں، نرا عدم ہے۔ بالفاظِ دیگر عالمِ ہستی میں اللہ کا کوئی حقیقی متضاد نہیں ہے اس لیے عدم صحیح معنی میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے ہی نہیں تو الٹ اور متضاد کی بحث کیا؟ یہ درست ہے کہ لاشئی کو شے کا الٹ کہا جاتا لیکن یہ لاشئی اپنا وجود نہیں رکھتی، یہ صرف ایک لفظ ہے، ایک مجازی اسلوبِ بیان ہے یا پھر یکے از مفروضات جسے شرح و بیان اور بحث مباحثہ کی غرض سے قبول کر لیا گیا ہو۔

تو پھر مخلوق کیا ہے، نور یا تاریکی؟ جواب ظاہر ہے کہ یہی ہو گا کہ نور اور تاریکی دونوں، یا پھر یہ کہ نہ نور نہ تاریکی۔ مخلوق اگر صرف نور ہی ہوتی، تو مخلوق نہ رہتی خدا ہو جاتی اور اگر مخلوق نری تاریکی ہی ہوتی تو اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ پس ساری مخلوق ایک ایسی ارضِ وہم و گمان میں بستی ہے جو نہ نور ہے نہ تیرگی۔

تشبیہ کے اعتبار سے مخلوقات نور ہیں جبکہ تنزیہ کے لحاظ سے انہیں تاریکی کہا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں جس حد تک خلق کو حق سے مشابہت ہے وہ نورانی ہے اور جس حد تک مخلوق اپنے خالق سے مشابہ نہیں ہے تاریک ہے۔ کچھ نہ کچھ نورانیت تو مخلوق میں ہونا ضروری ہے ورنہ اسے وجود ہی سے محروم ہونا پڑے گا۔

تیرگی میں بسر کرنا خدا سے دوری میں بسر کرنا ہے (مراد ہے اضافی تاریکی، کیونکہ تیرگیٔ مطلق تو ہو ہی نہیں سکتی)۔ تیرگی کا مطلب ہے اللہ کی صفاتِ جلال وقہر کا غلبہ جو چیزوں کو اللہ سے دور رکھتی ہیں۔ نور میں ہونا خدا کے قرب میں زندگی کرنا ہے، اس کا مطلب ہے اللہ کی صفاتِ جمال ورحمت کا غلبہ، وہ صفات جو ہر چیز کو اللہ سے قریب لے آتی ہیں۔

نور ایک ہی ہے، نورِ خداوندی۔ تاریکیاں بہت سی ہیں کہ ہر مخلوق اللہ کی نسبت سے تاریکی ہی کی نمائندہ ہے۔ تاریکی جتنی گہری ہوگی اللہ سے فاصلہ اسی قدر زیادہ ہوگا۔ مطلق تاریکی کا کہیں وجود نہیں کیونکہ اس کا مطلب ہے اللہ سے ہر طرح منقطع ہو جانا۔ کسی شے کو جامۂ وجود حاصل ہی کیونکر ہوگا اگر الحق سے اس کا سرے سے تعلق ہی نہ ہو کیونکہ وہی تو ہر صفت اور وصف کا منبع وماٰخذ ہے۔

خلق کی ہوئی اشیاء کا مسکن اللہ سے دوری ہے، مختلف ہے، غیریت ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اضافی تاریکی مخلوقات کا مسکن ہے۔ اضافی تاریکی کی کتنی ہی شکلیں ہیں، کئی طرح کے اسلوب ہیں کیونکہ مخلوقات اللہ سے بے شمار طریقوں سے مختلف ہیں اور مختلف ہونے کے یہ انداز ان گنت ہیں۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" "اس جیسی کوئی شے نہیں ہے لیکن ہر شے کا اللہ سے مشابہ نہ ہونے کا انداز جدا ہے اور اسی شے سے خاص ہے۔

شے کا مسکن اگر ''اختلاف اور جدائی'' ہو تو اس کا مطلب ہو گا کہ اللہ کو بہ لحاظِ تنزیہ سمجھا جا رہا ہے اور نتیجتاً غلبہ ہے صفاتِ قہر و جلال و غضب کا۔ دین کا مقصد ہے ''تنزیہ'' سے ''تشبیہ'' کی جانب سفر، دوری سے قربت کی طرف حرکت، اختلاف سے یگانگت اور کثرت سے وحدت کی جانب رجوع، غضب سے پلٹ کر رحمت کی سمت آنا، تاریکی سے نکل کر روشنی میں واپسی۔

قرآن میں بار بار ہے اس بات کی وضاحت ہے کہ عالمِ خلق میں اللہ کا مقصدِ تخلیق وحدت پیدا کرنا ہے اور اس چیز کے بیان کے لیے قرآن نے اکثر نور اور ظلمت کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان آیات کی معنویت اور معانی کی وسعت تب واضح ہوتی ہے جب ہم توحید کے معانی کو گرفت میں لاتے ہیں۔ درجِ ذیل آیات پڑھتے ہوئے غور کیجیے کہ ان میں ہر جگہ نور ایک ہے کیونکہ نور اللہ کی صفات میں سے ایک ہے جبکہ ظلمتیں متعدد ہیں اس لیے کہ ظلمت ایک ایسی صفت ہے جو مخلوقات کی کثرت کے لحاظ سے کتنی ہی صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (۱۳:۱٦، ۲۰:۳۵)

ذرا پوچھیے، کیا اندھا اور بینائی والا یکساں ہوں گے؟ یا کہیں اندھیرے اور اُجالا برابر ہوئے ہیں؟

هُوَالَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۵۷:۹)

وہی ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں اتارتا ہے تاکہ تمھیں اندھیرے سے اُجالے میں نکال لائے۔

اَفَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ هُوَ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦:١٢٢)

ایک شخص مردہ ہو پھر ہم اس کو زندہ کر کے روشنی دیں جسے لیے وہ لوگوں میں پھرتا ہے۔ بھلا یہ شخص اس کے برابر ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں پڑا ہے، نکل نہیں سکتا۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ (٣٣:٤٣)

وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تا کہ تمہیں اندھیروں سے اجالے میں نکال لے۔

آخری آیت میں بات پھر فرشتوں کے موضوع پر لوٹ آتی ہے جو نور سے تخلیق ہوئے ہیں اور اسی لیے ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مرئی دنیا کے ساکنوں، اس دنیا کی مخلوق میں اللہ کی طرف سے نور بانٹ سکیں۔

## فرشتوں کی نورانیت

اللہ نور ہے۔ اللہ کے نورِ مطلق کا الٹ ظلمتِ مطلقہ یا مطلق تاریکی ہے جس کا وجود ہو نہیں سکتا کیونکہ اللہ سے باہر کوئی حقیقت ایسی نہیں ہے جو ظلمتِ مطلقہ کو جامۂ ہستی عطا کر سکے۔

فرشتے "زائیدگانِ نور" ہیں۔ اسی لیے وہ اللہ سے مختلف ہیں جو نورِ غیر مخلوق ہے۔ فرشتوں کے نور کا متضاد ہو سکتا ہے، ظلمتِ مخلوقہ۔ یہ ظلمت یہ تاریکی ظلمت

مطلقہ نہیں ہے ورنہ اس کا وجود ہی نہ ہوتا، نہ اسے ایک تخلیق کردہ شے کہا جا سکتا ہے۔ فرشتوں کے نورِ مخلوق کا الٹ وہ ظلمت ہوگی جو ظلمت بھی ہو اور ملکوتی بھی نہ ہو۔یعنی وہ شے جو فرشتوں کے نور کے مقابلے میں نسبتاً تاریک اور ظلمانی کہی جائے۔

قرآن نے نورِ مخلوق اور ظلمتِ مخلوقہ دونوں کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں کیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (٦:١)

سب تعریف اللہ کو جس نے زمین و آسمان بنائے اور ٹھہرایا اندھیرا اور اُجالا۔

غور فرمایئے کہ اس آیت میں خلق کردہ نور کا ذکر صیغۂ واحد میں کیا گیا ہے۔ اس سے اشارہ اس نکتے کی طرف ہے کہ آخر الامر "لا نور الا اللہ" (اللہ کے سوا نور اور کوئی نہیں) ہر نور اللہ ہی کے نور کی ضوفشانی ہے پس سب نور آخر میں ایک ہی ہیں۔ اس کے برعکس ظلمتیں بہت سی ہیں کیونکہ کائنات کی اشیاء جس جس طرح اللہ سے مختلف اور اللہ سے دور ہوں گی اتنی ہی طرح کی ظلمتیں بھی سامنے آئیں گی۔

اندیکھے، نورِ غیر مخلوق (اللہ) کا کوئی متضاد نہیں۔نورِ مخلوق بھی غیر مرئی تو ہے مگر اس کا ایک الٹ بھی ہے یعنی ہر وہ شے جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔آپ کہیں گے کہ سورج کی روشنی بھی تو آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے۔تو کیا اسے ظلمت کہا جائے گا؟ جواب اثبات میں بھی ہے اور نفی میں بھی۔نورِ ملکوتی سے مقابلہ کیجیے تو اسے ظلمت کہیں گے، مادی اشیاء کے مقابل رکھیے تو نور قرار دیں گے۔یاد رہے کہ مطلق صرف اللہ ہی کی ذات ہے جو نورِ مطلق ہے۔جب بات عالمِ تخلیق کی ہو تو ہر شے

اضافی ہو گی۔ دوسری مخلوقات کے مقابلے میں فرشتے نورانی ہیں لیکن اللہ کے سامنے ظلمانی ہو جائیں گے۔ایک ستارے کے مقابلے میں چاند کتنا چمک دار ہوتا ہے لیکن سورج کے سامنے تاریک ہو جاتا ہے۔

فرشتوں کا نور اور طبعی روشنی الگ الگ چیزیں ہیں تاہم ان میں بعض اوصاف مشترک ہیں۔نور سے ظلمت دور ہو جاتی ہے، پرچھائیاں اور چھپی ہوئی چیزیں ختم ہو جاتی ہیں، نور روشن کرتا ہے، اجال دیتا ہے، درخشاں و تابندہ ہوتا ہے، پردے اٹھاتا ہے، انکشاف کرتا ہے۔نورِ مَلکی اور نورِ جسمانی ہر دو یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن یہ دونوں اضافی طور پر بعض اہم باتوں میں مختلف بھی ہیں۔نورِ مادی یا نورِ طبعی میں زندگی نہیں جبکہ نورِ فرشتگاں ذی حیات ہے۔نورِ جسمانی روشن کرتا ہے مگر نورِ فرشتگاں منور کرنے کے ساتھ علم بھی عطا کرتا ہے۔چراغ روشن کرنا ایک بات ہے اور فرشتے کا ظاہر ہو کر علم عطا کرنا ایک دوسری چیز ہے جیسا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل کے ذریعے قرآن عطا ہوا۔علم نور ہے اور قرآن ''نور مبین'' (۴:۱۷)(کھلی واضح روشنی) یہاں علم بطور معلومات یا اطلاعات کا ذکر نہیں، علم بطور آگہی مراد ہے۔جب مہاتما بدھ کو نروان ہوا اور وہ نورِ علم تک پہنچے تو انہیں روشنی نظر آئی مگر یہ روشنی چراغوں کی بے جان اور بے دمک روشنی نہیں تھی، نورِ ماہتاب بھی نہیں، ضیائے آفتاب بھی نہیں۔اسلامی اصطلاح میں کہیے تو یوں بیان ہوگا کہ مہاتما بدھ نے دید دوست کا مرتبہ پایا تھا، خود ''النور'' کا مشاہدہ کیا تھا، وہ جو حیات، آگہی، اور علم و شادمانی کا منبع و مصدر ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ خلق کردہ نور کا متضاد ہے خلق شدہ ظلمت۔اگر نور و ظلمت اضافی چیزیں ہیں تو مخلوقات میں سے ہر شے نور بھی ہے اور ظلمت بھی۔انحصار اس

بات پر ہے کہ آپ کس نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔اللہ کے مقابل رکھیے تو فرشتہ بھی ظلمت ہے اور عدم سے مقابلہ کیجیے تو پتھر بھی نورانی ہے۔کائنات کی ہر شے نور بھی ہے اور ظلمت بھی اور اس بات کا ''تشبیہ وتنزیہ'' سے براہ راست تعلق ہے۔اللہ تعالیٰ ''النور'' ہے۔اگر ہم اسے بے انتہا دور اور مخلوق سے بالکل غیر مشابہ، منزہ جانیں تو پھر ہر شے ظلمت قرار پائے گی۔مگر خدا اگر قریب بھی ہے اور مخلوق کو اس سے تشبیہ بھی ہے تو پھر ہر شے نورانی ہے۔[20]

کائنات کی ہر چیز کی حیثیت میں یہی دو رخا پن، یہ ابہام ہے۔اسلامی روایات میں اس کا بیان کئی طرح کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر نبی علیہ السلام نے فرمایا''اِنَّ الدُّنیَا مَلعُونَۃٌ مَلعُونٌ مَا فِیھَا اِلَّا ذِکرُاللّٰہ''[21] (یہ دنیا ملعون ہے، اس کی ہر چیز ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر کے)۔ذکرِ خدا کے بارے میں مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ ہر وہ چیز ''ذکر'' ہے جو انسان کو اللہ کی یاد دلائے، ہر وہ کوشش، ہر وہ عمل ذکر ہے جو یادِ خدا کو ذہن میں اجاگر کرنے کی غرض سے کیا جائے۔

یہ حدیث اس بات کا بیان ہے کہ اللہ کے سوا ہر شے کی، ہر چیز کی جس کا انسان کو دنیا میں تجربہ ہوتا ہے، کوئی مثبت حیثیت نہیں ہے، اس کی ذات میں کوئی خوبی اپنی نہیں ہے کیونکہ یہ ظلمت ہے۔اشیائے کائنات جس حد تک ظلمت ہیں اس حد تک انسان کو ان سے دل لگانے سے بچنا چاہیے۔تاہم کائنات کی سب اشیاء نور بھی ہیں یعنی اگر انسان انہیں اللہ کی نشانی، اس کی آیات سمجھے اور ان کی اس معنویت کو ''توحید'' کی بنیاد بنائے تو اس اعتبار سے ان کو نورانی کہا جائے گا۔یہ حدیث قرآن مجید کی ان آیات کی وجودی اور شخصی معنویت کی شرح و وضاحت کرتی ہے:

وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُم یَتَذَکَّرُونَ (۲:۲۲۱)

اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔

هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۶:۱۲۶)

اور یہ ہے تیرے رب کی سیدھی راہ۔ہم نے کھول دیں نشانیاں دھیان کرنے والوں کے لیے۔

اگر لوگ بانگ اللہ کی آیات کو نورِ ربانی کی تابانی کے طور پر دیکھنے سے قاصر ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت سے ان کا رابطہ کٹ گیا ہے۔ان کے لیے یہ دنیا تیرگی کا مسکن اور جائے لعنت ہے کیونکہ اس سے اللہ کا پتا نہیں ملتا یعنی یوں کہیے کہ یہ دنیا الحق سے منقطع ہوچکی ہے۔اگر دنیا سے لوگوں کو توحید کا سبق نہ ملے تو باقی صرف شرک ہی رہ جاتا ہے۔

آیئے اب ذرا فرشتوں کی طرف واپس چلیں۔قرآن میں بہت سی جگہ ان کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ان کی ماہیت کے بارے میں اس سے اشارے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔لیکن قرآن کی آیات پر جب تک غور و تدبر نہ کیا جائے ان اشارات کے معانی اجاگر نہیں ہوتے۔مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیت لیجیے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵:۱)

سب خوبی اللہ کو ہے۔آسمانوں اور زمین کا خالق ہے،جس نے بنائے فرشتے پیغام لانے والے،جن پر ہیں،دو دو،تین تین اور چار چار۔وہ خلق میں جو چاہے بڑھاتا ہے۔

سو پتہ چلا کہ فرشتوں کے پر ہوتے ہیں۔ اسلامی مصوری میں یا دیگر فنون میں اور اسی طرح عیسوی فنون لطیفہ میں بھی فرشتوں کو دو پروں والا دکھایا گیا ہے۔ ان کی تصویر کشی چار پروں کے ساتھ کرنا بھی کوئی ایسا مشکل نہیں کیونکہ ہمارے سامنے تتلیوں اور دیگر اڑنے والے کیڑوں کی مثال موجود ہے۔ لیکن تین پروں والے فرشتے کی تصویر کیونکر بنے گے؟ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ فرشتے کسی بھی ایسی پردار مخلوق کی مانند نہیں ہیں جو روزمرہ زندگی میں ہمارے تجربے میں آتی ہے۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آخر فرشتوں کو پروں کی حاجت کیا ہے؟ بظاہر تو یہ کہا جائے گا کہ پرواز کے لیے۔ اگر وہ خدا کے فرستادہ ہیں، اس کے پیامبر کے طور پر کام کرتے ہیں اور خدا کی تصویر ہمارے ذہن میں ایک بے انتہا دور دراز کے فاصلے پر مقیم ہستی کی ہے جسے اپنا پیغام ہم تک بھجوانا ہوتا ہے۔ تو پھر تو فرشتوں کو آمدورفت کے لیے پرِ پرواز درکار ہوں گے۔ یہ امر کہ ان کے بال و پر ہیں ہمارے لیے اس بات کا اشارہ ہے ک انکی حرکت ہم انسانوں سے بہت تیز ہے کیونکہ ہمیں صرف پاؤں دیئے گئے ہیں، پر نہیں۔

اس آیت کے معنی کی کچھ اور تہیں بھی ہیں۔ ایک پرندے یا کیڑے کو پروں کی ضرورت اس لیے رہتی ہے کہ اس کا وزن ہے اور اوپر اٹھنے کے لیے پر درکار ہیں۔ پر نہ ہوں تو وہ زمین سے بلند نہ ہو سکے گا۔ جب اسے زمین پر اترنا ہو تو وہ پر ہلانا بند کر دیتا ہے اور ہوا میں تیرتا ہوا نیچے اتر آتا ہے۔ مگر فرشتے تو نورانی ہیں، آسمان پر اللہ کے جوار و قرب میں سکونت رکھتے ہیں وہ اپنی فطرت میں ہی اللہ سے قریب ہیں۔ انہیں پرندوں کی طرح اڑ کر اوپر جانے کے لیے پروں کی ضرورت نہیں۔ وہ اڑ کر نیچے اترنے کے لیے پر رکھتے ہیں۔ اپنا پیغام دے کر وہ اپنے قدرتی مسکن کی

جانب تیرتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔

اسلامی فلسفے کے اندازِ بیان کو استعمال کریں تو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ''بال و پر'' اشارہ ہے فرشتوں کی قوتوں یا ان کے ملکہ وصلاحیت کی طرف جن کے وسیلے سے وہ اپنے تفویض کردہ فرائض انجام دیتے ہیں۔فرشتے بہت سی قسموں کے ہیں۔ان میں سے کچھ کے ذمے سادہ سے معاملات ہیں جبکہ دوسروں کے سپرد زیادہ پیچیدہ امور کیے گئے ہیں۔اپنے علم اور اپنے کام کی مناسبت سے ان کے لیے کم از کم دو ''پر'' درکار ہیں۔لیکن ان کے کام کوئی انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔یاد کیجیے کہ مذکورہ بالا آیت کیا کہہ رہی ہے ''یزید فی الخلق مایشاء'' (وہ خلق میں جو چاہے بڑھا دیتا ہے) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے پروں میں ان کے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے اضافہ کردیتے ہیں۔اس کی تائید میں وہ اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ آپؐ نے جبرئیل کو سات سو پروں کے ساتھ دیکھا۔اللہ کے سب سے اہم فرشتے کے فرائض کتنے ہوں گے۔سات سو کا عدد اس کی معنویت سمجھانے کے لیے کافی ہے۔

## آدمِ خاکی Clay

قرآن میں گندھی مٹی (طین) کا لفظ جس طرح استعمال ہوا ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسے بھی ''ظلمت'' کی طرح نور کا متضاد سمجھا جاسکتا ہے۔طین (clay) آب وگِل کے آمیزے کا نام ہے۔فرشتے نور سے تخلیق ہوئے جبکہ انسانی قالب گارے سے بنایا گیا۔یہاں اگر آپ آج کی جدید اصطلاح میں یہ سمجھیں کہ قرآن نے ایک طرح سے سائنسی معلومات پیش کی ہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انسانی بدن غذا سے نمو پاتا ہے اور انسانی غذا بنیادی طور پر پانی اور مٹی ہی ہے

جو نباتات اور حیوانات کے ذریعے سے ہم تک پہنچتی ہے چنانچہ جسم مٹی ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآنی تعلیمات کا ایک مفہوم یہ بھی ہے لیکن بات فقط اتنی ہی تو نہیں ہے۔ ہمیں یہ پوچھنا لازم ہے کہ قرآن اور اسلام کے تصور کائنات میں مٹی اور پانی سے، آب و خاک سے عموماً کیا مراد لیا گیا اور یہ بھی کہ گِل کے معنی کیا ہیں کیونکہ گِل یا گندھی ہوئی مٹی، آب و خاک کے آمیزے کا نام ہے۔[۲۲]

صفات پر نظر کرنے سے ہمیں اشیاء کی ماہیتِ ذات کا سراغ ملتا ہے۔ گارے کی صفات مٹی پانی کی صفات ہیں۔ اس پر مستزاد وہ اضافی چیز جو ان کو آمیخت کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مٹی بھاری ہے، ظلمانی ہے، خشک ہے اور اسے لامتناہی حد تک تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پانی بھی بھاری تو ہے مگر اس میں روشنی نفوذ کر سکتی ہے۔ پس یہ اتنا تاریک نہیں ہے جتنا کہ مٹی۔ پانی کو بھی آپ جتنا چاہیں تقسیم کرتے جائیں تاہم طبعی طور پر پانی ایک جسدِ واحد کی طرح ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی اور مٹی کو ملا دیں تو ان کا آمیزہ ایک ایسی چیز ہو گا جو بھاری اور تاریک تو ہے لیکن اس میں روشنی قبول کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں پانی موجود ہے۔ نیز یہ آمیزہ جڑا ہوا یکجان رہتا ہے خاص طور پر اگر اسے آگ میں پکا لیا جائے۔ قرآن کی ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ:

خَلَقَ الإِنسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (٥٥:١٤)

اس نے آدمی کو بنایا کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا۔

مٹی اور پانی کی مختلف خصوصیات ان اشیاء میں ظاہر ہوتی ہیں جو گارے سے بنائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر جسمانی یا مادی چیزیں رنگا رنگ کی ہوتی ہیں۔ انسان بھی رنگ رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت پانی اور مٹی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ ذرا

مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجیے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (۳۵:۲۷-۲۸)

تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر ہم نے اس سے رنگ رنگ کے میوے اُگا دیے۔ اور پہاڑوں میں بھی دھاریاں ہیں سفید اور سرخ، طرح طرح کے ان کے رنگ اور بھجنگ کالی بھی۔ اور آدمیوں، کیڑوں اور چوپایوں میں بھی اسی طرح کئی رنگ کے ہیں۔

بعض اصحابِ رسولؐ نے زمین کے رنگ اور انسانوں کی رنگا رنگی میں ایک معنی خیز تعلق کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ان سے روایت ہے کہ جب اللہ نے تخلیقِ آدمؑ کا ارادہ کیا تو فرشتہ اسرافیلؑ کو زمین پر بھیجا گیا کہ وہ مٹی میں سے کچھ سمیٹ کر لے آئیں۔ زمین نے اس پر فریاد کی۔ اسے اپنی مٹی کے ذرے سے بھی جدا ہونا گوارا نہ تھا (زمینی مخلوق، خاص طور پر انسان بھی یہی افتادِ طبع رکھتے ہیں۔ انہیں اپنی، اپنے سالم و سلامت رہنے کی بہت فکر ہوتی ہے) زمین نے اسرافیلؑ سے التجا کی اور اس طرح منت سماجت کر کے اپنا سوال کیا کہ انہیں زمین پر رحم آ گیا اور وہ لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس گئے۔ عرض کیا کہ زمین کی استدعا کا کیا جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں کیا خاص بات ہے۔ کسی اور فرشتے کو بھجوا دیا جائے گا۔ سو حضرت میکائیلؑ کو بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ بھی یہی ماجرا پیش آیا۔ وہ بھی خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ ان کے بعد حضرت جبرئیلؑ بھیجے گئے مگر وہی قصہ ہوا۔ آخر میں

عزرائیل" روانہ کیے گئے اور انہیں خصوصی ہدایات دی گئیں۔عزرائیل" نے زمین پر اتر کر اسے سمجھایا کہ ہم صرف تھوڑی مدت کے لیے ذرا سی مٹی چاہتے ہیں۔اسے لوٹانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔میں خود اس کی ضمانت دیتا ہوں کہ یہ خاکِ مستعار تمہیں لوٹا دی جائے گی۔عزرائیل" کی یقین دہانی پر زمین مان گئی۔پس عزرائیل" نے زمین کے چاروں کھونٹ سے ایک ایک مٹھی خاک اٹھالی،سرخ،سپید،سیاہ اور زرد۔اللہ تعالی نے اس مٹی میں پانی ملا کر اسے خاکِ آدم کی صورت میں ڈھال دیا۔ انسانوں کے رنگ جدا جدا کیوں ہوتے ہیں۔بیانِ بالا اسی کے سبب سے ہمیں آگاہ کرتا ہے اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عزرائیل" کو موت کا فرشتہ کیوں مقرر کیا گیا ہے۔انہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس خاکِ مستعار کو اس کی اصلی جگہ واپس پہنچائیں۔اسی کارن انہیں آدمی کی جان نکال کر اس کی مٹی کو واپس مٹی کے مالک تک پہنچانا ہوتا ہے۔۲۳

## ارواح واجسام

فرشتے نور سے تخلیق ہوئے اور اجسام گندھی ہوئی مٹی سے بنے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرشتے وہ نورانی اور اندیکھی مخلوق ہیں جو نورِ ربانی کے خواص میں شریک ہیں، حیات،علم،قدرت۔اس کے برعکس مادی اجسام مرئی اور تاریک چیز ہوتے ہیں اور فرشتوں کے مقابلے میں انہیں نورِ ربانی کے خصائص میں سے کچھ بھی نصیب نہیں ہوا۔مردہ، بے علم اور کمزور اجسام۔اگر مادی اجسام زندگی سے عاری ہیں تو پھر ہمارے گردو پیش یہ گردشِ اجسام کیا ہے؟ نوعِ انسانی کے بارے میں تو قرآن مجید نے بتادیا کہ خاکِ آدم میں اللہ نے زندگی پیدا کر دی کہ اس میں اللہ کی روح میں سے کچھ پھونک دیا گیا تھا:

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ • ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲:۷-۹)

شروع کی انسان کی پیدائش ایک گارے سے پھر اس کو برابر کیا اور اس میں اپنی جان میں سے پھونکا۔

جسدِ انسانی کو اس لیے زندگی ملی کہ وہ ذی روح ہے اور اس میں روحِ ربانی نے حیات آفرینی کی ہے۔ یہ روح نہ ہوتی تو جسدِ انسانی صرف آب و گل ہی رہتا۔ جب عزرائیل جان نکال لیتے ہیں تو جسمِ انسانی کی اصلیت کھلتی ہے اور جسدِ خاکی پھر سے لوٹ کر پیوندِ خاک ہو جاتا ہے۔ مسلمان مفکرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسانوں کے علاوہ دیگر جانداروں بلکہ پودوں میں بھی جو یہ زندگی اور ارادہ و خواہش جیسی صفات پائی جاتی ہیں تو یہ روح کی وجہ سے ہیں جسم کی اپنی خاصیتیں نہیں ہیں۔

تو پھر روح کیا ہے؟ اس کے معنی کی طرف ایک اشارہ تو اس عربی لفظ ہی میں موجود ہے۔ ''روح'' کا لفظ اسی مادے سے ہے جس سے ''ریح'' (ہوا) کا لفظ نکلا ہے۔ ہوا وہ چیز ہے جس کی موجودگی تبھی سامنے آتی ہے جب اس کے اثرات دوسری چیزوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ہوا سے درختوں کی شاخیں ہلتی ہیں، ہوا سے مٹی کا غبار اُٹھتا ہے، ہوا کا تھپیڑا چہرے پر لگتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہوا چل رہی ہے مگر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، صرف اس کے اثرات دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح روح کو بھی دیکھا تو نہیں جا سکتا تاہم وہ اپنے آثار و اثرات سے انسان کو اپنا پتا دیتی ہے۔ آب و گل کے ایک بدن میں زندگی کے سب آثار کا ظہور ہو جاتا ہے۔ سوئے ہوئے انسان کا بدن یا مردے کا جسم دیکھنے کو تو ایک سا ہی لگتا ہے لیکن ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اور یہ فرق اسی ان دیکھی چیز کی وجہ سے ہے جسے ''روح'' کہتے

ہیں۔

ارواح بھی فرشتوں کے مانند ہیں۔قرآن نے اس نکتے کو یوں واضح کیا ہے کہ اس میں کئی جگہ حضرت جبرئیل کو ''روح القدس'' ۲۴؎ کہا گیا ہے۔''الروح'' ۲۵؎ کا ذکر بھی آیا ہے جسے مفسرین نے بزرگ ترین فرشتہ بتایا ہے۔اکثر علماء کا خیال ہے کہ فرشتے بھی ایک نوع کی روح ہیں لیکن روح کے معانی وسیع تر ہیں کیونکہ ہر روح فرشتہ نہیں ہوتی۔ارواح اور فرشتوں میں جو فرق ہے اسے واضح کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر روح کسی بدن سے متعلق ہوتی ہے۔لیکن ہر بدن کا مواد ایک جیسا نہیں ہوتا۔اگر روح کسی ایسے جسم سے متعلق ہے جو نور سے تخلیق ہوا تو روح اور جسمِ نورانی کے اس مجموعے کو فرشتہ کہا جائے گا لیکن اگر روح کا قالب خاک سے بنایا گیا ہے تو پھر وہ کسی انسان یا حیوان کی روح ہوگی۔بعض علماء نے کہا ہے کہ نباتات اور بے جان اشیاء میں بھی روح ہوتی ہے جبکہ کچھ حضرات کی رائے میں ان اشیاء پر خاص فرشتے متعین کیے جاتے ہیں۔جو بھی ہو، یہاں نکتے کی بات یہ ہے کہ مادی اشیاء اس وقت تک اپنی ہستی برقرار نہیں رکھ سکتیں جب تک ان کے اور خدا کے درمیان کوئی حقیقتِ روحانی واسطے کا کام نہ کرے۔

روح کا بنیادی کام بدن کو چلانا اور اس پر حکومت کرنا ہے۔کوئی مادی جسم روح یا فرشتے کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا کہ اسی سے مادی اجسام کو جماؤ اور ربط باہم میسر آتا ہے، اسی سے ان کی سالمیت ہے۔مادی اجسام بنے تو بہر حال مٹی ہی سے ہیں اور مٹی آسانی سے بکھر جاتی ہے۔اس کی ذات میں خود سے وحدت نہیں پائی جاتی۔آگ سے پکی ہوئی مٹی ٹھوس لگتی ہے لیکن ایک ضرب اسے ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔اس کے برعکس روحیں نور سے تخلیق پاتی ہیں۔نور جس کی حقیقت ایک ہے یعنی تنویر

ربانی ظہورِ خداوندی۔نور صرف ایک ہے جیسا کہ قرآن نے بارہا کہا ہے۔ظلمتیں، تاریکیاں البتہ بہت سی ہیں۔یہ ''بہت سی'' جو ہیں وہ خود کو جوڑ کر نہیں رکھ سکتیں کیونکہ ان میں وحدت پیدا کرنے والی حقیقت نہیں پائی جاتی۔

قرآن میں ایسے اشارات ہیں جن سے خیال ہوتا کہ کائنات کے نظام کے ہر درجے میں خاص خاص ارواح کی عملداری ہے، ہر مرتبۂ کائنات کا انتظام کچھ مخصوص ارواح کا کام ہے۔مثال کے طور پر دیکھیے کہ انسانی روح کے بارے میں واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی روح میں سے جسدِ انسانی میں پھونکتے ہیں تو انسانی روح وجود میں آتی ہے۔اسی انسانی روح سے بدن کے اعضا، خلیات اور دست و بازو کا مجموعہ ایک کلیت بنتا ہے، ثابت و سالم رہتا ہے۔لیکن اجزائے بدن میں سے سبھی کو ایک طرح کی آزادی میسر ہے جو اعضائے بدن کی الگ الگ ارواح کی وجہ سے باقی رہتی ہے۔

اعضائے بدن کی اس آزادی کی جانب قرآن نے کئی آیات میں اشارہ کیا ہے ان آیات میں یومِ قیامت کا ذکر ہے جب لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔یہ ایک فیصلہ ہوگا، جیسے عدالت کا قانونی فیصلہ ہوتا ہے۔اس کے لیے گواہ طلب کیے جائیں گے۔شہادت دینے والوں میں فرشتے ہوں گے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدن کے اعضاء و جوارح بھی اپنے مالک کے خلاف یا حق میں شہادت دیں گے۔اس سے یہ نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک طرح کی خود مختاری حاصل ہے اور اسلام کے حوالے سے اس نکتے کی توجیہ اس وقت تک نہیں ہوسکتی تاآں کہ ہر عضوِ بدن کی اپنی الگ روح نہ مانی جائے جو اس کے لیے تدبیر کنندہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٢٤: ٢٣-٢٤)

اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہے، اس دن جس دن اس کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے سامنے بتائیں گے وہ سب کچھ جو وہ کرتے رہے تھے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ وَأَلْسِنَتُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (٣٦: ٣٥)

آج ہم مہر کر دیں گے ان کے منہ پر، اور بولیں گے ہم ان سے ان کے ہاتھ، اور ان کے پاؤں ان کے سامنے بتائیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے۔

سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام ارواح الگ الگ بھی ہوں اور ساتھ ہی ان کو بڑی ارواح نے اکٹھا بھی کر رکھا ہو۔ اس سوال کا ایک جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ نفسِ انسانی میں جو نشانیاں اور علامات ہیں ان پر غور کیجیے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (٥١: ٢٠-٢١)

اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے، اور خود تمہارے اندر بھی۔ کیا تم کو سجھائی نہیں دیتیں؟

اس ساری کائنات کو اگر ایک کتاب سے تشبیہ دی جاتی ہے تو انسان کو بھی کتاب سے مشابہ کیا جا سکتا ہے جو حروف، الفاظ اور فقروں وغیرہ سے مل کر بنی ہے۔

بدن کے ہر خلیے کو ایک حرف کہیے۔ اب یہ دیکھیے کہ ہر حرف کی ایک مخصوص

شکل ہوتی ہے جس سے وہ ایک معنی کا اظہار کرتا ہے۔حرف کوئی اٹکل پچو لکیر نہیں ہوتا۔حرف کی روح اس کی صورت گری کرتی ہے۔اس سے اگلی سطح پر،حروف مل کر لفظ بناتے ہیں اور لفظوں کی اپنی کلیت اور سالمیت ہوتی ہے جو انہیں ان کی ارواحِ متصرّفہ سے عطا ہوتی ہے۔ان الفاظ کا موازنہ ان ذیلی اکائیوں سے کیا جا سکتا ہے جو مل کر جسمانی اعضا کی تشکیل کرتی ہیں۔

بدن کا ہر عضو ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے۔جسمِ انسانی کی تحریر میں ہر عضو ایک فقرہ ہے جبکہ بدن کو ایک پیراگراف سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔یاد رہے کہ پیراگراف کا مفہوم صرف اس کے باب کے سیاق وسباق میں اجاگر ہوتا ہے۔ اگر انسان کا بدن پیراگراف ہے تو اس تحریر کا ایک باب انسانی خاندان کہا جائے گا۔ پھر پوری کتاب میں ہر باب کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔یہ کتاب نسلِ انسانی کی کتاب کہلائے گی۔حروف،الفاظ،فقرے،پیرے اور کتابیں سبھی کا مطالعہ ان کی سطح پر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا معنی ومفہوم تبھی واضح ہوتا ہے جب اسے ایک وسیع تر سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے۔اپنی سطح پر حروف صرف حروفِ تہجی کا ملغوبہ ہوتے ہیں۔جب ان سے لفظ بنائے جاتے ہیں تو ان کے معانی کھلتے ہیں۔تاہم فقرے کی حدود سے باہر لفظوں کو صحیح طور پر مفاہیم حاصل نہیں ہوتے اور فقروں کو اگر ایک وسیع تر اکائی یعنی پیرے اور ابواب میں نہ رکھا جائے تو ان کی معنویت ادھوری رہ جاتی ہے۔

اسلامی تناظر میں دیکھیے تو یہ بات مہمل نظر آئے گی کہ اجزا کو تو تسلیم کر لیا جائے اور وہ کُل رد کر دیے جائیں جو اجزا کو باہم مربوط رکھتے ہیں۔ان میں سے کسی ایک سطح تک رک جایئے تو معانی کی وسعت جاتی رہے گی۔آخرالامر،ایک

حرف کی پوری معنویت بھی تبھی کھلتی ہے جب ہم پوری کتاب پڑھنے کے قابل ہوں جائیں۔جسدِ انسانی کی یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''توحید'' ہی سے اس کتاب کی حتمی معانی کی گرہ کھلتی ہے۔مصنف کو بھلا کر ہم حروف لفظوں اور فقروں کو سمجھ تو سکتے ہیں لیکن اس طرح نہ تو کتاب کا پیغام ہاتھ آتا ہے نہ اسرارِ کتاب کا دربار ہوتا ہے۔ہماری مثال ان فرضی ماہرین کیمیا کی ہوگی جن کے خیال میں مونالیزا کے معانی کا انحصار ان رنگوں کے کیمیاوی اجزاء پر ہے جو اس تصویر میں استعمال ہوئے ہیں۔ربط و معنی کی ہر سطح (مثلاً حروف، الفاظ اور فقرے) نظامِ ہستی کی بنت میں شامل ہے۔عقلِ انسانی ہر سطح کو اپنی گرفت میں لا سکتی ہے کہ عقلِ انسانی خود اس روحِ ربانی کا پرتو ہے جو روحوں میں عظیم ترین روح ہے اور جسے خاکِ آدم میں پھونکا گیا ہے۔یہاں ایک نکتہ اور بھی بہت اہم ہے۔غور کیجیے کہ مسلمانوں کی تحریروں میں روح کے لیے جو بہت سے مترادف الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان میں سے ایک ''معنیٰ'' بھی ہے۔روح وہ چیز ہے جس سے کسی شے کو معنیٰ، وحدت، مفہوم اور شناخت حاصل ہوتی ہے۔تاہم روح کے بھی بہت سے درجات ہیں اور ان میں فرق مراتب اس اعتبار سے قائم ہوتا ہے کہ کونسی روح اپنے سے فروتر درجۂ حقیقت کے حقائق کا کس حد تک فہم رکھتی ہے اور اس کا احاطہ کرتی ہے۔خلیے کی روح ایک چیز ہے اور عضو کی روح دوسری۔اسی طرح انسان کی روح (روحِ ناطق یا روحِ ربانی) وہ اُصولِ عالی ہے جو اپنے سے کم تر تمام روحوں کی تنظیم کرتی ہے اور انھیں باہم جوڑ کر یکجا رکھتی ہے۔

بدن کا حوالہ نہ ہو تو بدن سے الگ ارواح پر بات کرنا بے معنی ہے۔روایتی اسلامی علوم میں ''جسم'' کا ذکر جب ہوا ہے ''روح'' کا مضمر حوالہ ساتھ رہتا ہے۔

اسی طرح ''روح'' کے ہر تذکرے میں 'بدن' کا تصور شامل رہتا ہے۔ جس طرح تاریکی کے بارے میں بات کرنے کے لیے نور کا حوالہ ضروری ہے اور نور کو اس وقت تک دیکھا نہیں جا سکتا جب تک تاریکی موجود نہ ہو، اسی طرح روح اور بدن ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے، حتیٰ کہ جسدِ مردہ اور بے جان اشیاء کی بھی نگران روح ہوتی ہے اور وقتِ مرگ بدن سے جو روح جدا ہوتی ہے وہ بھی ایک لطیف جسمانی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

روح کی اوّلین صفت عام طور پر حیات کو کہا جاتا ہے۔ روح کا ذکر آتے ہی اگر ذہن میں بدن کا خیال ابھرتا ہے تو ساتھ ہی روح کے تذکرے سے حیات کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔ فارسی کی مثال لیجیے تو اس میں ''روح'' اور ''زندگی/حیات'' ہر دو کے لیے ''جان'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ روح کے بغیر بدن مردہ ہو جاتا ہے یا یوں کہیے کہ روح کے بغیر تنِ خاکی محض مٹی کا ڈھیر ہے۔

مٹی میں جان پڑ نہیں سکتی جب تک اللہ تعالیٰ اسے گوندھ کر، شکل صورت دے کر اس میں اپنی روح نہ پھونکیں۔ ظاہر ہے کہ گوندھنے کا یہ کام اللہ تعالیٰ خود تو نہیں کرتے۔ ان کے کام سرانجام دینے کے لیے وسیلے واسطے ہوتے ہیں۔ جانور کا معاملہ ہو تو عام طور پر مٹی گوندھنے کا عمل رحمِ مادر میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق حمل کے چوتھے مہینے تک بچے کا بدن ابھی ایسی صورت شکل میں نہیں ہوتا کہ روح کی سہار کر سکے۔ چار ماہ کے بعد ہی اللہ تعالیٰ جنین میں اپنی روح پھونکتے ہیں۔۲۶

روح خدائی چیز ہے جیسے کہ نور اور حیات خدائی چیزیں ہیں۔ حیاتِ الٰہی کے

سوا اور کوئی حیات نہیں اور نورِ الٰہی کے علاوہ اور کوئی نور نہیں۔اسی طرح روح کے جملہ خواص اصل میں ربانی صفات سے عبارت ہیں۔وگرنہ اللہ تعالیٰ نے روحِ انسانی کو ''روحی'' (میری روح) نہ فرمایا ہوتا۔تاہم علمائے الٰہیات کی اکثریت نے روح کو مخلوق قرار دیا ہے۔یہ اگرچہ خدائی چیز ہے لیکن عین خدا نہیں ہے۔اسی طرح نورِ فرشتگان اللہ ہی کے نور کی ضوفشانی ہے مگر خدا نہیں ہے۔

روح کے خواص کو ذہن کی گرفت میں لانا اہم ہے۔جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ روح کیا ہے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ بدن کیا ہے کیونکہ روح اور بدن ایک دوسرے کے تکملے کے طور پر زیرِ غور آتے ہیں اور ایک کی تعریف معین کرتے ہوئے دوسرے کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ہم نے عرض کیا تھا کہ روح نورانی ہے اور ذی حیات نیز فرشتوں اور روشنی کی طرح غیر مرئی بھی ہے۔غور کیجیے کہ ''النور'' اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس ضمن میں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ ''النور'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے ذاتیہ میں سے ہے،اس کی ذات کا نام ہے۔خدا کیا ہے؟ نور۔ایک مرتبہ رسولِ خداؐ سے پوچھا گیا کہ حضور کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا، ''وہ ایک نور ہے۔میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں؟''۔[۲۷]

اگر روح ایک نور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہ اعتبارِ تشبیہ اس میں ذاتِ خداوندی کی ساری صفات پائی جاتی ہیں۔یعنی وہ تمام خواص جو اسمائے الٰہیہ سے ہمیں معلوم ہوتے ہیں چنانچہ روح اپنے آپ میں زندہ بھی ہے ذی علم بھی۔ارادہ و قدرت بھی رکھتی ہے اور صفتِ کلام و نطق بھی نیز عدل و کرم،رحمت اور محبت وغیرہ کی صفات سے متصف بھی۔یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ گو سبھی انسان ذی روح ہیں لیکن ان میں سے اکثر عدل و انصاف،کرم اور سخاوت جیسی صفات سے عاری

نظر آتے ہیں۔اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ انسان صرف روح نہیں ہوتا اس کے ساتھ بدن بھی لگا ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی روح اس گندھی ہوئی مٹی میں پھونکی سو انسان پیدا ہوا۔تو پھر کیا انسان روح ہے؟ جواب نفی اور اثبات دونوں میں ہے۔کیا انسان نور ہے؟ ہے بھی اور نہیں بھی۔کیا وہ بس مجموعۂ آب و گل ہے؟ ہے اور نہیں ہے۔کیا انسان ذی علم ہے؟ ہے، مگر نہیں بھی۔کیا انسان کریم النفس اور انصاف پسند ہے؟ہاں ر نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جب ہم انسانوں اور دیگر مخلوقات میں نور اور خاک کے میل کا ذکر کرتے ہیں تو صرف اسلوبِ بیان مختلف ہوتا ہے۔اصل میں بات ''تشبیہ'' اور تنزیہ'' کے انہی دو اُصولوں کی ہو رہی ہے جن کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے۔اپنی روح کے لحاظ سے انسان کو خدا سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جبکہ بدن کے اعتبار سے ان میں خدا سے کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔یہ بھی درست ہے کہ ایک اور زاویے سے اور دوسرے اعتبار سے دیکھیے تو روح بھی اللہ سے مشابہ نہیں ہے جبکہ بدن میں تشبیہ کی رمق پائی جاتی ہے۔لیکن سرِ دست ہم صرف اسی قدر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ روح اور بدن دونوں کی غالب خاصیتیں کون کون سی ہیں۔

روح پر ان خواص کا غلبہ ہے جو ''تشبیہ'' سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ قرب، رحمت، جمال و کرم، احسان، شفقت اور نرمی ان صفات سے روح کا گہرا تعلق ہے۔اس کے برعکس بدن پر صفاتِ تنزیہ کا غلبہ ہے۔چنانچہ یہ قہر، جلال، غضب، دوری اور فاصلہ اور عدل کی صفات متعلق ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جسم کا کام یہ ہے کہ وہ صفاتِ رحمت کے مقابلے میں

صفاتِ غضب کو زیادہ ظاہر کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بدن کی تحقیر کی جا رہی ہے۔ یہ تمام صفات جن کا تعلق بدن سے ہے آخر الامر صفاتِ ربانی ہی تو ہیں۔ یہ درست ہے کہ رحمت غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ روح ایک معنی میں بدن سے افضل ہے۔ لیکن روح کے پاس جب تک بدن نہ ہو وہ رحمت اور جمال کی صفات ظاہر نہیں کر سکتی۔ اگر انسانی بدن آب و گل کے بجائے نور کے بنے ہوئے ہوتے یا یوں کہیے کہ اگر بدن بھی روحانی ماہیت رکھا کرتا تو لوگ فرشتے ہو جاتے، نسلِ انسانی کے فرد نہ ہوتے۔ اور اگر وہ فرشتے ہوتے تو وہ اس عظمت اور بلند مرتبے کو چھونے سے قاصر رہتے جس کے لیے انہیں تخلیق کیا گیا ہے۔ (انسانوں کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کا مقصود کیا ہے اس کے بارے میں ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔)

## وجودِ ناری Fire

نورِ مخلوق کا الٹ ہے ظلمتِ مخلوقہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح کی صفات آب و گل کی صفات کے برعکس ہیں۔ روح کی صفات خدائی صفات ہیں۔ مخلوق کے حوالے سے جب صفاتِ ربانی پر نظر کی جائے تو عام طور پر حیات، علم، ارادہ، قدرت اور کلام کی صفات بیان کی جاتی ہیں۔ روح کے اندر یہ صفات خلقی طور پر پائی جاتی ہیں جبکہ بدن میں یہ صفات اس درجے میں نہیں پائی جاتیں کہ انہیں کسی طرح قابلِ لحاظ کہا جا سکے۔

روحانی مخلوق مثلاً فرشتے اپنی فطرت و ماہیت کے اعتبار سے ہی ذی حیات، ذی علم، صاحبِ ارادہ و قدرت اور ناطق و گویا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی سامنے رہے کہ اللہ کے مقابلے میں ارواح کی حیثیت بے جان اور بے علم اشیاء کی سی ہے اور

مذکورہ صفات مطلق نہیں ہیں۔ جب ارواح کی بات ہو رہی ہو تو ہم اپنے ذہن میں ان کا مقابلہ بدن سے کر رہے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ''روح'' اور ''بدن'' کے الفاظ مل کر ہمارے تصورات کا ایک ایسا جوڑا تشکیل دیتے ہیں کہ ایک کے بارے میں بات کیجیے تو دوسرے کا ذکر خود بخود نکل آتا ہے یا کم از کم ایک مضمر کنایہ تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

اروح کے برعکس مادی اجسام، جیسے پتھر یا جسد مردہ، بے جان، علم سے عاری، ارادہ سے محروم، کمزور اور گویائی کے بغیر ہوتے ہیں۔ جہاں تک زندہ اجسام کا تعلق ہے تو ان کو نرا جسم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان میں حیات کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس بدن کے اندر روح بھی پائی جاتی ہے۔ تاہم زندہ اجسام کی زندگی اور ان کے علم کا جب ارواح کے علمِ خالص اور حیاتِ محض سے مقابلہ کیجیے تو یہ خصوصیات ماند پڑ جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ روح اور بدن کے میل سے ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے جو نہ روح ہے نہ بدن بلکہ ان دونوں کے درمیان کی چیز ہے۔ اس تیسری چیز کی ماہیت کو جاننا ہو تو نورِ فرشتگان اور تنِ خاکی کے آب و گل کے درمیان پائے جانے والے تضاد پر دوبارہ غور کرنا مفید ہو گا۔

فرشتے نور کی تخلیق ہیں جبکہ بدن آب و گل سے اٹھایا گیا ہے۔ قرآن میں ایسی ہستیوں کا بھی ذکر ہے جو نہ تو نوری صفات ہیں نہ خاکی نہاد۔ ان کی تخلیق آگ (النار) سے ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ آگ بیک وقت روشن بھی ہے اور تاریک بھی۔ آگ آسمان کی جانب لپکتی ہے لیکن زمینی ہوتی ہے۔ آگ کو کبھی بھی آب و گل سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسے جلانے کے لیے ایندھن کی احتیاج ہوتی ہے۔ آگ اوپر اٹھتی ہے، گویا نور کی آزادی کی خواہاں ہے لیکن کبھی بھی آب و گل کے

بندھن سے نکل نہیں پاتی۔ آب و گِل سے بننے والے ایندھن کی ترکیب اگر بدل دیجیے تو آگ کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ خشک لکڑی کی آگ اور طرح کی ہوتی ہے اور ہری لکڑیوں کی آگ کسی اور طرح کی ہوتی ہے۔ پٹرول سے اٹھنے والی آگ ان دونوں سے الگ ہوتی ہے۔ زمین سے نکلنے والی مختلف چیزوں اور مختلف نمکیات کو اگر باہم آمیخت کر دیا جائے تو آگ کا رنگ بآسانی بدلا جا سکتا ہے۔

وہ مخلوق جو آگ سے بنی ہے اسے قرآن میں ''جن'' کہا گیا ہے۔ اس اصطلاح کے لفظی معنی ہیں ''چھپا ہوا۔ پوشیدہ''۔ قرآن میں جنات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور اگر صرف متعلقہ آیات پر ہی تحقیق کی جائے تو ایک پوری کتاب تیار ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جنات وہ مخلوق ہیں جن کے بارے میں ایک ابہام پایا جاتا ہے۔ ان میں کچھ باتیں انسانوں جیسی ہیں کچھ فرشتوں جیسی۔

جنات کی نسل کا سب سے مشہور فرد ابلیس ہے جسے شیطان بھی کہا جاتا ہے۔ جنات کے بارے میں جو ایک ابہام سا ہے وہ ابلیس کے ماضی اور اس کے کردار سے بخوبی آشکار ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ وہ جنات میں سب سے پہلے تخلیق ہوا تھا۔ گویا نوع انسانی میں جو حیثیت سیدنا آدم ؑ کو حاصل ہے وہی ابلیس کو جنات میں ملی تھی۔ تخلیقِ آدم سے ہزاروں سال قبل سے ابلیس ایک نہایت ہی نیک اور پارسا ہستی کے طور پر موجود تھا اور اپنا سارا وقت عبادت اور حسنِ عمل میں صرف کرتا تھا۔

قرآن کا فرمان ہے کہ فرشتوں کی زندگی سراسر اللہ کی بندگی سے عبارت ہوتی ہے، حمد اور تسبیح مسلسل۔ فرشتے اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے چنانچہ وہ ہر دم

کلماتِ تشکر ادا کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جن میں اللہ کی عظمت، جلال اور مہربانی کا ذکر ہوتا ہے۔ ابلیس جب تخلیق ہوا تو ایسا روشن سرشت تھا کہ اپنے آغازِ آفرینش ہی سے فرشتوں کی طرف مائل رہتا تھا اور انہی جیسے عمل کرتا تھا۔ اس کی کثرتِ عبادت اور یادِ خدا میں انہماک نے رفتہ رفتہ اسے خدا کی بندگی کرنے والوں کے ایک گروہِ خواص میں شامل کر دیا۔ اس کی تخلیق اگرچہ آگ سے ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل گئی تھی کہ وہ فرشتگانِ نوری نہاد سے گھل مل کر رہ سکتا ہے۔ معاملہ بخیر وخوبی چلتا رہا تا آنکہ تخلیقِ آدم کا لمحہ آن پہنچا۔ ابلیس اس سارے عمل کا شاہد تھا کہ خاکِ آدم کیونکر جمع کی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کو چالیس روز تک کیسے خمیر کیا۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ اس کی نظر سے وہ نکتہ اوجھل رہ گیا جو قصۂ آدم میں سب سے اہم تھا یعنی جب اللہ نے آدمؑ کے پُتلے میں اپنی روح پھونکی۔ روح غیر مرئی ہے، خود اللہ تعالیٰ کہیں زیادہ غیر مرئی ہے تو پھر کیا عجب کہ غور سے دیکھنے والوں کی نظر سے بھی بعض لطیف پہلو اور نازک باتیں اوجھل رہ جائیں!

تخلیقِ آدم ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں سے فرمایا:

اُسْجُدُوا لِآدَمَ (۲:۳۴، ۷:۱۱)

آدم کو سجدہ کرو۔

اس گھڑی ابلیس بھی صفِ نوریاں میں شامل تھا۔ سبھی فرشتے اسی لمحے سجدہ ریز ہو گئے کیونکہ فرشتے تو "وہی کرتے ہیں جس کا امر ہوتا ہے" "یَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ" (۱۶:۵۰) ابلیس فرشتہ نہ تھا سو اسے حکم سے سرتابی کا یارا ہو سکتا تھا اور زندگی میں پہلی بار اس نے فیصلہ کیا کہ اسے حکمِ خداوندی سے انکار کرنا ہے اور وہ ایسا کر گزرا۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا:

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ • قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ • خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۷:۱۲)

فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں۔ مجھ کو تو نے آگ سے بنایا اور اسے خاک سے پیدا کیا۔

دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ:

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَىَّ • اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ • قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۳۸:۷۵-۷۶)

فرمایا اے ابلیس تجھے اس چیز کو سجدہ کرنے میں کیا اٹکا ہوا جو میں اپنے ہاتھوں سے بنائی؟ یہ تو نے غرور کیا یا تو کوئی بڑے درجے والا تھا؟ بولا میں بہتر ہوں اس سے۔ مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو تو نے مٹی سے بنایا۔

فارسی زبان کے عظیم شاعر اور حکیمِ دانا مولانا جلال الدین رومی (م: ۱۲۷۳/۶۷۲) کا کہنا ہے کہ ابلیس یک چشم تھا۔ اس کی نظر اتنی کوتاہ تھی کہ اسے صرف خاکِ آدم ہی بجھائی دی۔ دوسری آنکھ، ایک اور طرح کی نظر میسر ہوتی تو آدمؑ کی روحِ ربانی بھی دیکھ لیتا۔

قصۂ آدمؑ کا باقی حصہ معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو مردود کر دیا اور

دھتکارا ہوا ابلیس جنت سے نکال دیا گیا۔ اس روز سے ابلیس نے اولادِ آدم کو بھٹکانے کا کسب اختیار کر لیا۔ ان واقعات کی طرف ہم بعد میں رجوع کریں گے کہ ان میں اسلام کے تصورِ انسان اور علمِ انسانیات کے فہم کی کلید مخفی ہے۔ سردست اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ ابلیس میں فرشتوں کی سی سرشتِ روحانی بھی تھی اور ایک تیرہ نہاد، فریب کار اور انحرافی پہلو بھی جو صرف نور کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ سرشتِ ظلمانی اپنی ظلمت خاک سے اخذ کرتی ہے لیکن اس میں ایک چیز اور بھی ہے جو نہادِ خاک میں نہیں پائی جاتی۔

کچھ بھی کہیے گندھی ہوئی مٹی بہر حال اپنا کوئی معین رنگ ڈھنگ نہیں رکھتی۔ مٹی میں شر کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اگر آپ ظروف ساز ہیں تو برتن ڈھالنے کے لیے مٹی ایک اچھی چیز ہے۔ اور اگر آپ خدا ہیں تو اس سے جسمانی مادی چیزوں کی صورتگری بخوبی ہو سکتی ہے۔ مٹی میں کچھ کوتاہیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ تاریک بھی ہے اور کثیف بھی سو اگر آپ جامِ سفال میں نورِ سیال انڈیل دیں تو اس کی روشنی مخفی ہو جاتی ہے اور کچھ لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید یہ ظرف کسی مظروف سے عاری ہے۔ لیکن اگر ظروف نہ ہوں تو ہمارے پاس نور کو سنبھالنے کا کوئی وسیلہ ہی نہ ہوگا۔ مٹی پرفریب اور گمراہ کن نہیں ہوتی۔ صرف ٹُھس اور رست نہاد ہوتی ہے۔

جب نورانیتِ روحانی کا امتزاج ٹُھس اور بے نفوذ مٹی سے ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں روشنی اور پرچھائیوں کا وہ کھیل جنم لیتا ہے جس پر کج روی، فریب اور انحراف کے سائے پھیلے رہتے ہیں، وہ کھیل جو ظلمت کے عالم میں اور دُور کھینچ لے جاتا ہے۔ ابلیس اس امکان کا نمائندہ ہے۔ تاہم آگ ہمیشہ خرابی کی جانب ہی نہیں لے جایا کرتی۔ قرآن میں وضاحت سے یہ بات کہی گئی ہے کہ جنات میں ایسے بھی

ہوتے ہیں جو رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلامی روایت میں عام طور پر صاحبِ ایمان جنات اور کافر جنات کے درمیان فرق تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ جن جو کفر میں مبتلا ہیں انہیں شیاطین کا نام دیا گیا ہے۔ ان کا سردار ابلیس ہے جسے عربی میں ''الشیطان'' کہا گیا ہے۔

آگ ایک مبہم چیز ہے اگر اس کی سرشت میں نور کا غلبہ ہو جائے تو یہ فرشتوں سے مشابہ ہو جاتی ہے اور اللہ کی رحمت اور مہربانی سے حصہ پاتی ہے۔ اگر اس پر ظلمت غالب آ جائے تو پھر یہ مادی اجسام کی طرح اللہ سے دور ہو جاتی ہے اور قہر و غضب کے اسماء کے آثار تلے آ جاتی ہے۔

آگ کا جھکاؤ بہر کیف قہر وجلال کی جانب زیادہ ہوتا ہے اور جمال ورحمت کی طرف کم تر۔ یہ اوپر اٹھتی ہے، اپنی قوت کو منواتی ہے اپنی طاقت جتلاتی ہے اور اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ اسی بات کو اگر ایک انسانی (یا شیطانی) صفت کے طور پر لیجیے تو آگ خود رائی تکبر اور غرورِ ذات کے دعوے کے برابر ٹھہرتی ہے۔ ابلیس کہتا ہے ''انا خیر منہ'' (میں اس سے بہتر ہوں) شیطان کا کھیل ہی انا کا کھیل ہے ''میں، میں، میں''۔ اپنی من مانی کرو، ہوا اور ہوس کی پیروی کرو اور عقلِ خداداد کو پسِ پشت ڈال دو۔

آگ کی یہ منفی سرشت قرآن کے بیان کردہ لفظ ''استکبار'' میں نہایت خوبی سے سمیٹ دی گئی ہے اس لفظ کا مطلب ہے اپنے آپ کو بزرگ، برتر، عظیم اور نمایاں بنانے کی کوشش کرنا۔ اسی سہ حرفی کلمہ (کبر) سے اکبر کا لفظ نکلا ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ''بڑا بزرگ''۔ ''اللہ اکبر'' کے الفاظ مسلمان کے لبوں پر عام طور پر جاری رہتے ہیں اور نماز کی ہر حرکت سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب

صرف اتنا ہے کہ عظمت، بڑائی اور بزرگی اگر ہے تو صرف اللہ کی۔ ہماری آپ کی نگاہ میں جو چیز بھی بڑی ہے اللہ کے سامنے بہت چھوٹی ہے۔عربی کے اسی سہ حرفی مادے سے اللہ کا نام "المتکبر" نکلا ہے۔ اس کے معنی ہیں The great in Himself Magnificent, He who is ( کبریائی کا مالک، اپنی عظمت کا اظہار کرنے والا) اگر یہ صفت انسانوں میں پائی جائے تو اس کا مطلب ہوگا تکبر کرنے والا، مغرور اور گھمنڈی کیونکہ عظمت اور کبریائی صرف اللہ ہی کو زیبا ہے دوسرے کسی کا حق نہیں۔

ابلیس اور نوعِ انسانی کے وہ افراد جن میں ناری صفات پائی جاتی ہیں اپنے آپ کو بڑا بنانے کی، اپنی عظمتِ ذات کے خواہاں رہتے ہیں۔ آگ کے مانندوہ اپنی حقیقت منوانے اور دوسروں کو ملیا میٹ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔قرآن مجید نے بڑائی جتانے اور اپنی عظمت و برتری منوانے کی اس صفت کو ابلیس، فرعون اور اس کے مشیروں سے منسوب کیا ہے اور کفار کو بھی عام طور پر اس میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ یہ سبھی دوزخ میں پھینکے جائیں گے کہ نارِ جہنم ٹھیک وہی آگ ہے جو ان کی سرشت کے عین مطابق ہے۔فرعون کو سمندر میں پانی کی قبر نصیب ہوئی۔اس جیسے آتشی دعوے کرنے والے کا اس دنیا میں ایسا ہی آبی انجام مناسب تھا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَةُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ ۞

اِلَّآ اِبْلِیْسَ ۞ اِسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (۳۸:۷۳ -۷۴)

پھر سارے فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔اس نے غرور کیا اور انکار کرنے والوں میں سے بن گیا۔

وَاسْتَکْبَرَ ھُوَ وَجُنُوْدُہٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۞ فَاَخَذْنٰہُ

وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ (۲۸:۳۹-۴۱)

اور اس (فرعون) نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا..... سو ہم نے ان کو پکڑ کر سمندر میں ڈبو دیا ..... اور انہیں آگ کی طرف بلانے والوں کا سردار بنا دیا۔

وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (۷:۳۶)

اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑیں، وہی دوزخ والے ہیں۔

قرآن میں حرفِ استکبار اور دعویٔ عظمت کو اگر ابلیس اور اس کے پیروکاروں کی صفت بتایا گیا ہے تو دوسری بہت سی آیات میں فرشتوں کو ان صفات سے بری کہا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (۷:۲۰۶)

بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے نہیں اکڑتے۔

الْمَلٰٓئِکَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۔ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶:۴۹-۵۰)

فرشتے، اور وہ بڑائی نہیں کرتے۔ اپنے اوپر اپنے رب کا ڈر رکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم پاتے ہیں۔

# نفس Soul

روح میں نوری صفات ہیں اور بدن میں آب و گل کے خواص۔ روح اور بدن دونوں ہی آگ نہیں ہیں کیونکہ آگ میں نور اور مٹی کی صفات یکجا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر نوعِ آدم کی مکمل تصویر کشی درکار ہو تو اس میں ایک آتشی عنصر کا اضافہ کرنا ہوگا۔ آدم کو جامۂ ہستی تب ملتا ہے جب گندھی ہوئی مٹی میں روح پھونکی جاتی ہے لیکن یہ آتشی عنصر نہ روح ہے نہ مٹی بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو اس وقت پیدا ہوتی جب روح اور مٹی کو یکجا کیا جاتا ہے۔ یہ چیز عام طور پر "نفس" کہلاتی ہے اس کا ترجمہ Soul (نفس/رُواں) یا Self (خودی/انا) کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ روح اور بدن کا میل ہونے سے پہلے نہ نفسِ انسانی ہوتا ہے نہ انسانی خودی۔ ان دونوں کے مل جانے کے بعد ایک شخصیت وجود میں آتی ہے۔ ایک ہستی، ایک شخص جو خود کو نہ تو بدن سمجھتا ہے اور نہ بطور روح کے اپنا ادراک کرتا ہے بلکہ خود کو محض نفسِ انسانی جانتا ہے۔

عربی میں نفس اور نَفَس ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں۔ نَفَس کا مطلب ہے "سانس"۔ (عبرانی میں بھی nephesh کا مطلب ہے سانس)۔ سانس وہ ہوا ہے جس سے بدن جاندار بنتا ہے، اس میں زندگی آتی ہے۔ اسی طرح نفس وہ غیر مرئی قوت ہے جس سے کسی شے کو نَفَس حیات (زندگی کی سانس) نصیب ہوتا ہے۔ اس اصطلاح (نفس) کا جب یہ پہلو زیر غور ہو تو اسے بالعموم روح کے مترادف لفظ کے طور پر برتا جاتا ہے کیونکہ بدن کے مقابلے میں نفس کو روح کی تمام اساسی صفات حاصل ہیں یعنی حیات، علم، ارادہ اور قدرت۔

اکثر اوقات نفس کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ اس میں اور روح میں کیا فرق ہے۔ نفس بدن میں غرق رہتا ہے اور اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ بدن اس کی حقیقت نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت کی اصل و اساس روح ہے اور خدا ہے۔ نفس کو اگر اس اعتبار سے زیر غور لایا جائے تو اس لفظ کا استعمال ایک منفی معنی میں ہوتا ہے۔ اس معنی میں نفس اس ساری ظلمت اور تاریکی کا حوالہ بن جاتا ہے جو لوگوں کے اندر پھیلی رہتی ہے اور وہ اس کے کارن اللہ سے دوری میں، لاعلمی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی علوم اور کتب میں ''نفس'' کی اصطلاح کا استعمال ابہام سے بھرپور ہے کیونکہ اس کی معنوی قربت آگ اور جن ہر دو سے موجود ہے۔ لیکن اگر نفسِ انسانی کی ایک جامع تصویر بنانا ہو اور یہ دیکھنا ہو کہ انسانی نفس کن چیزوں کا نمائندہ ہے تو ہمیں نفس کے مذکورہ بالا دونوں پہلو، دونوں طرفیں نظر میں رکھنا ہوں گی۔ نفس کو روحِ نورانی کے مقابل رکھ کر دیکھیے تو وہ تاریک، مردہ، بے علم اور کمزور نظر آئے گا۔ روح کی طرح نفس میں بھی ارادہ اور خواہش پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بگڑے ہوئے کام اور خراب ارادوں اور خواہشوں کا مجموعہ ہے۔ فرشتہ اللہ کے سوا کچھ اور نہیں سوچتا، خدا کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا سو اس کی یہ خواہش نیک خواہش ہے۔ لیکن اپنے منفی معنی میں نفس اللہ کی طرف سے غافل اور اللہ کے سوا ہر چیز کا طالب رہتا ہے۔ اس نکتۂ نظر سے نفس ایک منفی چیز نظر آتا ہے اور اس کا تعلق تجزیہ سے قائم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر نفس ایک ایسی چیز کے طور پر سامنے آتا ہے جس میں حقیقتِ ربانی کا کوئی شائبہ کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔

تاہم اگر نفس کو بدن کے مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو اسے نورانی، ذی عقل،

ذی ارادہ، طاقتور وغیرہ کہا جائے گا۔ یہ ربانی صفات نفس کے اندر موجود ہیں جبکہ بدن ان سے عاری ہے۔اس تناظر میں نفس کا رشتہ تشبیہ سے جڑ جاتا ہے۔

کسی ایک شخص کی مثال لیجیے تو صورت حال کچھ اس طرح کی نظر آئے گی۔ چند چھوٹے موٹے اختلافات کو چھوڑ کر اس کا تنِ خاکی دوسرے انسانی جسموں جیسا ہوگا۔نور سے خلق کردہ اس کی روح بھی آخرالامر دوسری تمام انسانی ارواح ہی کی طرح ایک روح ہوگی۔ یہ بھی ایک خدائی راز ہے کیونکہ انسانی ارواح وہ خدائی روح ہیں جو بدن میں پھونکی گئی اور روحِ ربانی تو بس ایک ہی ہے۔لیکن ہر انسان، ہر فرد کی روح دوسرے افراد کی روح سے مشابہ بھی اور جدا بھی، ہر انسان کی شخصیت میں جو انفرادی شان پیدا ہوتی ہے وہ اللہ کی نشانیوں کا اس شخص میں وہ نادر امتزاج ہے جو اسی سے خاص ہے۔بعض لوگوں کو اللہ کی صفتِ علم (عقل و آگہی) سے بہت کم حصہ نصیب ہوتا ہے جبکہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ بہرہ ور ہوتے ہیں۔دو آدمی کہیں بھی یکساں نہیں ہوتے۔اسی طرح ہر صفتِ الٰہی بھی ہر فرد میں جداگانہ طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر نطق و کلام اور گویائی کی صفت کو لیجیے۔کلام سب سے کامل وہ ہے جو کلامِ خداوندی ہے، وہ جس کا ادراک ہم اس کی نشانیوں میں کرتے ہیں یعنی اس کائنات کی کتابِ تکوین اور اللہ کی بھیجی ہوئی الہامی کتابیں۔لیکن انسانوں میں یہ صفتِ کلام مختلف درجے کی اور مختلف انداز کی پائی جاتی ہے کہیں زیادہ اور کہیں کم۔ کسی میں وافر کسی میں ناقص۔مزید برآں ہر مرد وزن کو اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور زمانوں میں گویائی کی یہ صفتِ الٰہی مختلف درجے میں حاصل ہوتی ہے۔ایک نوزائیدہ بچہ انسان کی قوتِ گویائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن رفتہ رفتہ سیکھ

جاتا ہے۔اس کے بارے میں یقین سے ہرگز کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نشو ونما پا کر کیا بنے گا۔اس نوزائیدہ بچے میں ایک شاعر بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے،ایک ناول نگار بھی، اپنے زمانے کا شیکسپیئر اور اقبال بھی اور ایک گنوار کندۂ ناتراش بھی۔کون جانے؟

صفتِ کلام اور صفتِ علم میں فطری طور پر ایک گہرا تعلق ہے۔بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سبھی صفاتِ خداوندی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔جیسے جیسے آپ کھوج میں آگے بڑھیں گے یہ دیکھیں گے کہ چند صفات ایسی ہیں جن کا انحصار کچھ دوسری صفات پر ہے اور مآل کار سب صفات کا دارومدار ذاتِ خداوندی پر ہے۔ یہی ''توحید'' ہے یعنی یہ دعویٰ کہ ہر حقیقت اپنی اصل میں ایک ہی ہستی سے منسلک ہے اور وہی ہستی ''الحق'' ہے۔چونکہ حقیقت واحد ہے،الحق یکتا و یگانہ ہے لہٰذا الحق کی صفات بھی ایک اعتبار سے یگانگت اور وحدت رکھتی ہیں۔

## خیال Imagination

بہت سے مسلم مفکرین نے عربی کے لفظ ''خیال'' یا ''مثال'' کا لفظ استعمال کرکے نفس یا آگ کی درمیانی اقلیم کی جانب اشارہ کیا ہے۔قرآن وحدیث سے ان الفاظ کے استعمال کرنے کا خاصا جواز فراہم ہوتا ہے۔مثال کے طور پر قرآن میں جہاں سیدہ مریمؑ کے سامنے حضرت جبرئیل کے ظاہر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں یوں کہا گیا ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹:۱۷)

پھر وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کے نمودار ہوا۔

یعنی وہ مریمؑ کے سامنے انسان کی صورتِ مثالی میں ظاہر ہوئے بلکہ لفظی

ترجمے میں یوں ہوگا کہ ''وہ ان کے سامنے ایک بے عیب بشر کی صورت متمثل ہوئے''۔ رسولِ خداؐ نے یہ لفظ ''تمثّل'' (imaginalize) بہت سی احادیث میں استعمال کیا ہے۔ ان کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ان میں سے سب سے مشہور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ''شیطان میری صورت میں متمثل نہیں ہوسکتا'' ۲۸؎ اکثر لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر خواب میں کوئی شخص رسولِ خداؐ کی شبیہ دیکھے تو وہ واقعی آپؐ کی ہی صورتِ مثالی ہے، شیطان کا دھوکہ نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ''جنت اور جہنم میرے سامنے اس دیوار میں متمثل کردیے گئے'' ۲۹؎

جب کوئی شے متمثل ہوتی ہے Imaginalized تو وہ دیکھنے والے کے سامنے ایک صورتِ مثالی، ایک شبیہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ شبیہ یا صورت ''عالمِ خیال'' کی یعنی Imaginal ہوتی ہے وہمی یا تخیلاتی Imaginary نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اس میں بھی ایک طرح کی حقیقت ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ ہم محض یہ کہہ کر اسے ٹال نہیں سکتے کہ ''آپ خیالی باتیں کرتے ہیں یا خود سے چیز گھڑ لیتے ہیں'' مراد یہ کہ تمثل کو مفروضہ یا وہم و تخیل کی کارفرمائی کہہ کر چھوڑا نہیں جاسکتا۔

عالمِ خیال کی اشیاء میں طرفین کی صفات پائی جاتی ہیں ایسے ہی جیسے نفس، روح اور بدن ہر دو کی صفات میں شریک ہوتا ہے۔ عالمِ خیال کی کسی شے (imagnial thing) کی مثال دیکھنا ہو تو اس کی سب سے عام اور حسی مثال آئینے کے عکس میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ آئینے میں آپ کا عکس بیک وقت آپ کی ذات ہے اور نہیں ہے۔ ایک لحاظ سے اور کچھ عملی ضروریات کے پیشِ نظر آپ اسے اپنا آپ کہہ سکتے ہیں مثلاً بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے۔ لیکن آئینے میں جھلکنے والا عکس خود آپ تو نہیں ہیں کیونکہ یہ عکس تو محض روشنی کی وہ شعاعیں ہیں جو

آئینے کے ایک ٹکڑے سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی ہیں۔

اب ذرا اپنے داخل پر نظر دوڑایئے۔ نفسِ انسانی کے دروں خانہ میں اگر کہیں عالمِ خیال کی اشیاء سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں تو خوابوں میں۔ خواب میں طرح طرح کے لوگوں کی اور چیزوں کی ایک کثیر تعداد ہوتی ہے جو بیک وقت اپنا آپ ہیں بھی اور نہیں بھی، جو نظر آتے ہیں وہ ہیں بھی اور نہیں بھی بلکہ خواب میں تو خود ہم بھی گاہ وہ ہوتے ہیں جو ہم ہیں اور گاہ کچھ اور۔ خواب میں جو درخت ہمیں نظر آتا ہے وہ درخت ہی ہوتا ہے، مینڈک یا غبارہ نہیں ہوتا تاہم وہ بایں معنی درخت نہیں ہوتا کہ خواب کا درخت مادی دنیا کی مٹی سے اُگنے والا درخت نہیں ہوتا۔ یا یوں دیکھیے کہ خواب میں جو درخت آپ نے دیکھا ہے وہ آپ میں ہے اور نہیں بھی۔ چونکہ یہ ایک درخت ہے اس لیے یہ آپ سے الگ ہے جبکہ دوسری طرف یہ آپ ہی میں ہے کیونکہ یہ محض ایک درخت کی وہ تصویر ہے جو آپ کے خیال میں پائی جاتی ہے۔

یاد رہے کہ خواب کی سرزمین اقلیمِ نفس کا حصہ ہے۔ اس لیے نفس کو اکثر "عالمِ خیالِ صغیر" microcosmic world of imagination کہا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ عالم جس میں جنات اور شیاطین بستے ہیں اسے "عالمِ خیالِ کبیر" کہا جاتا ہے۔ فردِ انسانی ایک چھوٹی سی کائنات، ایک عالمِ صغیر ہے جبکہ "عالمِ کبیر" یہ تمام کائنات ہے۔

جو اشیاء عالمِ خیال میں وجود رکھتی ہیں ان کی سب سے اہم خاصیت ہے مسلسل تغیر، متواتر تبدیلی۔ خیال imagination دو لمحے بھی یکساں نہیں رہتا۔ اس درمیانی دنیا میں، اس عالمِ خیال میں کوئی شے ثبات و دوام نہیں رکھتی۔ خواب

میں آنے والا ہر عکس، ہر شبیہ لحہ بہ لحہ کسی دوسرے عکس اور دوسری شبیہ میں منقلب ہوتا رہتا ہے اور یہ عمل خواب کے دوران مسلسل جاری رہتا ہے۔

نفس کے بارے میں گفتگو ہو تو یہ تغیر اور بے ثباتی کا عنصر نظر میں رکھنا بہت اہم ہوتا ہے۔لوگ باگ عام طور پر نفس کو ایک جامد اور معین شے کے طور پر لیتے ہیں اور اس کی خاصیتوں کا قیاس بھی بدن پر کرتے ہیں۔کیونکہ نفس اور بدن کا ذکر عموماً ایک جوڑے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ معین اور جامد تو بدن بھی نہیں ہوتا تاہم نفس کے مقابلے میں بدن بہر حال ٹھوس اور مستقل چیز ہے بالخصوص جب بدن کا موازنہ خواب میں ابھرنے والے کسی عکس و شبیہ سے کیا جائے۔

ایک نسبتاً پکے اور ثبات رکھنے والے جسم اور نَفَسِ رحمانی کی یکجائی سے نفسِ انسانی جنم لیتا ہے۔ نَفَسِ خداوندی خالص اور غیر متغیر نورانیت ہے۔پس نفس کے دونوں پہلو، اس کی دونوں اطراف نسبتاً مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔لیکن اپنے آپ میں نفسِ انسانی ایک سیلانِ مسلسل ہے نقوش اور اثرات کا ایک متواتر بہاؤ شعور اور آگہی کی ایک بہتی ہوئی رو۔مسلمانوں میں علمِ کائنات کے ماہرین نے اکثر نفس کو ''بحرِ ناپیدا کنار'' کا نام دیا ہے۔نفسِ انسانی سمندر کی طرح اس لیے ہے کہ سمندر کی گہرائیوں میں بھی نہ جانے کیا کیا چھپا ہوتا ہے اور سمندر بھی ہر دم حرکت میں رہتا ہے جو سطحِ سمندر پر اٹھتی لہروں سے پتہ چلتا رہتا ہے۔تاہم سمندر کے برعکس نفس کی کوئی حد نہیں، پیدا نہیں بحر کا کنارہ۔آگے چل کر جب ہم ''معاد'' اور آخرت پر بحث کریں گے تو یہ نکتہ سامنے آئے گا کہ نفس کا یہ غیر معین اور سیال ہونا اپنے دامن میں تکوینِ انسانی کے لیے اہم نتائج لیے ہوئے ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسان این و آن کا پابند نہیں ہے لہٰذا وہ کچھ بھی بن سکتا ہے اور انسان اس دنیا میں جو

بن جاتا ہے وہی صورت اگلی دنیا میں اس کے سامنے آتی ہے۔ دنیا کا کسب، عقبیٰ کی صورت گری کرتا ہے۔

## خلاصہ

ہمارا مقدمۂ فکر یہ تھا کہ ''فرشتے اللہ کے پیغام بر ہیں'' اس نقطۂ آغاز سے ہم ایک لمبی مسافت طے کر کے اپنے مبحث کے انجام تک پہنچے ہیں لیکن اس سفر میں ہم ان نظریات اور تصورات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہٹے جو مسلمانوں کے درمیان اس وقت زیر بحث آتے ہیں جب وہ فرشتوں کے بارے میں ایک سطحی ایمان و اعتقاد سے بڑھ کر کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہیں۔ ان تصورات کی پرکھ پرچول، جائزہ، تجزیہ کا موقع ابھی نہیں آیا۔ ہماری آئندہ کی بحث میں ان تصورات پر مزید گفتگو ہوگی اس لیے کہ ''توحید'' کا تقاضا یہی ہے کہ ذرے سے خورشید تک ہر شے میں ایک باہمی ربط و تعلق ہو۔ آگے بڑھنے سے قبل ذرا ان نکات پر نظر ڈال لی جائے جو ہم نے فرشتوں کے بارے میں درج کیے ہیں۔

فرشتے ایک واسطہ ہیں مادی دنیا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان۔ چونکہ فرشتے نور سے خلق کیے گئے ہیں لہٰذا ان کو اللہ سے قریب ترین چیز کا نمائندہ کہا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ النور ہے۔ نورِ فرشتگان کی بھی وہی صفات ہیں جو نورِ خداوندی کی۔ ہاں ان میں یہ فرق ہے کہ فرشتوں کا نور مخلوق اور حادث ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا نور غیر مخلوق ہے اور قدیم و ازلی ہے۔ نور کے خواص کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کا موازنہ ظلمت کے خواص سے کیا جائے۔ ظلمت کیا ہے۔ فقدانِ نور کا نام ظلمت ہے۔ نورِ مخلوق کا الٹ ظلمتِ مخلوقہ ہے۔ ظلمت مخلوقہ کی ایک قسم گندھی مٹی ہے جس سے تمام مادی اشیاء مثلاً پتھر، پودے اور جانداروں کے بدن بنے ہیں۔

فرشتے ایک طرح کی روح ہیں اور روح آخر الامر نَفَس ِ خداوندی (breath of God) ہے۔ جس طرح روشنی کو تاریکی کے حوالے سے جانا جاتا ہے اسی طرح روح کو بدن کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اشیائے ہستی کی تمام رنگا رنگی کے قطبین پر روح اور بدن واقع ہیں۔ ان میں سے ایک اللہ سے قریب ہے اور دوسرا اس سے دور۔ بدن اللہ سے دور ہی تاہم ایک اچھی چیز ہے کیونکہ بدن اللہ کی مخلوق ہوتے ہیں اور ان میں اللہ کی صفات کا ظہور ہوتا ہے خواہ صفاتِ جمال اور رحمت کے مقابلے ان میں صفاتِ جلال اور صفاتِ غضب زیادہ کھلے طور پر ظاہر ہو رہی ہوں۔ ارواح کی صفات کا تعلق ''تشبیہ'' سے زیادہ قوی ہے اگر چہ یہ تعلق صرف ''تشبیہ'' تک محدود نہیں ہے۔ اس کے برعکس بدن کی صفات کا تعلق ''تنزیہ'' سے زیادہ قوی ہے اگر چہ یہ تعلق صرف اس تک محدود نہیں ہے۔

اگر نور اور آب و گل کی متضاد صفات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ آگ میں دونوں قسم کی صفات پائی جاتی ہیں۔ ہمارے خارج کی دنیا میں ایک مخلوق ایسی بھی ہے جو نہ روح ہے نہ بدن۔ اسے جن کہتے ہیں۔ ہمارے اندر کی دنیا میں ہماری ایک سمت، ایک جہت ایسی ہے جو نہ روح ہے نہ بدن۔ اسے نفس، خودی یا خیال کہا جاتا ہے۔ ہمارے نفس ہر دم متغیر اور مبہم ہوتے ہیں جیسے آگ یا خواب میں نظر آنے والے عکس اور شبیہیں۔ ہمارے نفس کی صفات نہ تو روح کی صفات ہیں نہ بدن کی۔ بلکہ اس میں طرفین کی صفات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ جب بھی خیال اور عالمِ خیال کی بات کی جاتی ہے تو ایک ابہام در آتا ہے۔ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ نور و ظلمت مل کر ایک آمیزہ بنا رہے ہیں اور یہ کہ ''تشبیہ'' و ''تنزیہ'' ایک دوسرے میں گتھی ہوئی رہتی ہیں۔

# The Measuring Out پیمانۂ تقدیر

حدیثِ جبرئیل میں رسولِ خداؐ نے ایمان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ایمان میں یہ بھی ہے کہ "تم تقدیر پر ایمان لاؤ، اس کے خیر و شر پر"۔ "قدر" (تخمینہ، اندازہ، قیاس، ناپنا، ناپ تول کر حصہ دینا یا معین کرنا)۔ اس اصطلاح کا ترجمہ عموماً Predestination کے لفظ سے کیا جاتا ہے اور کچھ سیاق و سباق میں یہ ترجمہ ٹھیک بیٹھتا ہے لیکن اس ترجمے پر انحصار کر لیا جائے تو لفظ کی اس وسیع معنویت کا ادراک نہیں ہو سکے گا جو قرآن و حدیث میں اس کے استعمال سے خاص ہے۔ کتاب کے زیرِ نظر حصے میں ہم اس اصطلاح کے معانی کی وسعت کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے اور اس غرض سے اس اصطلاح کے ان مضمر معانی کو کھول کر بیان کریں گے جن پر عموماً مسلمانوں کے تصورِ تقدیر پر بات کرتے ہوئے توجہ نہیں کی جاتی اور ان مباحث اور موضوعات میں اس اصطلاح کی کارفرمائی کا جائزہ لیں گے جن پر شاذ و نادر ہی گفتگو کی جاتی ہے۔ اس تصور سے اگر انصاف کرنا ہو تو ضروری ہے کہ پہلے اس کا ربط "توحید" کے تصور سے واضح کیا جائے۔

## قوتِ تخلیق

"قدر" کا لفظ اسی بنیادی سہ حرفی مادے سے ہے جس سے "القدیر" بنا ہے۔ "القدیر" اللہ کے ناموں میں سے ایک ہے اور ہم اس کا ترجمہ powerful (قدرت والا، طاقتور) کے لفظ سے کرتے رہے ہیں۔ اس لفظ کا مصدر "قدرت" ہے جو اس صفتِ خداوندی کا عنوان ہے۔ قدرت کا لفظ "قَدَر" سے معنوی طور پر بھی قریب ہے اور لفظی اشتقاق میں بھی۔ قدرت رکھنے کا مطلب ہے کہ آپ کچھ کرنے

یا بنانے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں، کس عمل پر قادر ہیں، کس مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔قرآن میں بار بار آیا ہے کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔"واللّٰہ علیٰ کل شيءٍ قدیر" ۔سو اس کی قدرت اور قوت ہمارے برعکس، لامحدود ہے اور وسیع ہے۔

''قدر'' کو بعض اوقات ''قدرت'' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔سو اس کے معنی ''قوت'' اور ''قابلیت وصلاحیت'' کے بھی ہوئے۔لیکن ''قدر'' کا لفظ اس مادے کے بنیادی مفہوم پر زور دیتا ہے یعنی ناپنا، تخمینہ کرنا، کسی شے کی مقدار یا حجم کا اندازہ کرنا۔یہ کام جسمانی طور پر بھی کیا جا سکتا ہے جیسے کسی پیمانے، مسطر یا فیتے کی مدد سے اور اسے ذہنی طور پر بھی انجام دیا جا سکتا ہے، حساب، گنتی اور جمع تفریق کے ذریعے۔اس اصطلاح کا صرف اتنا ہی مفہوم نہیں ہے کہ ''کسی شے کے حجم کا تخمینہ، ناپ تول کا اندازہ کرنا'' ۔یہی لفظ ''آنکنے یا کسی شے کے کردار، صلاحیت یا اعمال کا اندازہ، اس کی وسعت کی جانچ کرنے'' کے معنی بھی دیتا ہے۔یہ مفہوم لیجیے تو مطلب ہو گا اس شے پر قابو، کنٹرول، اس کا اہتمام، اس پر قدرت پانا'' ۔بات پھر سے لوٹ کر ''قدرت'' تک آ گئی۔

وَاللّٰہُ عَلٰی كُلِّ شَيءٍ قَدِیْر ۔اللہ کی قدرت ہر شے پر محیط ہے جبکہ انسانوں کو ایک قدرے محدود قدرت حاصل ہے کیونکہ یہ قدرتِ خداوندی کا ایک عکس ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ انسانوں کو اللہ پر کوئی قدرت نہیں۔سورج کی کرن کا سورج پر بس کیونکر چل سکتا ہے۔یہی نہیں، انسان تو اللہ کی ہدایت کے بغیر صحیح معنی میں اسے سمجھ بھی نہیں سکتا کیونکہ کسی شے کا فہم، اسے جان لینا کسی حد تک ہمیں اس پر قدرت بھی دے دیتا ہے۔

وَلَا یُحِیطُوْنَ بِشَیْءٍ مِنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَآ شَآءَ (۲:۲۵۶)

اور یہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔

مَاقَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (۶:۹۱، ۲۲:۷۴، ۳۹:۶۷)

انہوں نے اللہ کو ویسے نہیں جانچا جیسے جانچنے کا حق تھا۔

قرآن میں ''قدر'' کا لفظ دس جگہ استعمال ہوا ہے۔اسی کی بنیاد پر آگے چل کر اس عقیدے کی تشکیل ہوئی جسے قضا و قدر یا جبر و قدر کا عقیدہ کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں نے ''قدر'' کے تصور کو عموماً جس طرح سمجھا ہے اس میں علمِ کلام اور الٰہیاتی انداز فکر کے اثرات کم اور قرآنی آیات کی اثر آفرینی زیادہ رہی ہے۔آیئے ان میں سے چند آیات پر نظر ڈالیں۔ان آیات سے وہ بنیادی اسلامی تصورات بہ سہولت سامنے آجاتے ہیں جو انسان اور خدا اور خدا اور کائنات کے تعلق کو بیان کرتے ہیں۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴:۴۹)

ہم نے ہر چیز بنائی پہلے ٹھہرا کر۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵:۲۱)

اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور ہم ایک ٹھہرے ہوئے اندازے ہی پر اُتارتے ہیں۔

یہ دو آیات قرآن کے اساسی تصورات کا بیان ہیں کہ اللہ تعالیٰ علیم و قدیر اور خالقِ کائنات ہے۔وہ ہر شے کا ماٰخذ و مصدر ہے پس اس کے پاس سب کچھ ہے۔ اشیاء خواہ اس کے خزانۂ غیب میں مستور ہوں یا ہمارے روبرو عالمِ شہود میں دکھائی

دے رہی ہوں وہ ان سب کا علم رکھتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

(٦:٥٩)

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے اسے وہی جانتا ہے۔کوئی پتا نہیں جھڑتا اس کے علم کے بغیر۔اور نہ کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ ہرا نہ سوکھا جو نہیں کھلی کتاب میں۔

اللہ تعالیٰ جب کسی شے کی تخلیق کرتے ہیں تو اس کو جامۂ ہستی عطا کرتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ وہ تمام خزانے اپنے پاس رکھتے ہیں جن سے کسی شے کو سامانِ ہستی نصیب ہوتا ہے۔یہ خزانے، رحمت اور حق کی نمائندگی کرتے ہیں جو صرف اللہ ہی سے خاص ہیں۔"لاحق الا الحق" (اس ذات حقیقی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں)۔مزید تفصیل میں جایئے تو یہ خزانے صفاتِ الٰہیہ کے خزانے ہیں جو اس کائنات میں ہر حقیقی اور اچھی صفت اور خاصیت کا منبع ہیں۔چنانچہ اگر کسی شے کو زندگی ملتی ہے تو اللہ کے مخزنِ حیات سے،قوت حاصل ہوتی ہے تو اس کے مخزنِ قدرت سے اور رحمت کی توفیق ہوتی ہے تو اس کے خزانہ رحمت سے۔

ان خزانوں سے اشیائے کائنات کو کیا ملے گا؟ اس بات کا فیصلہ کون کرتا ہے؟ خزانے کا مالک۔اس فیصلے کو کیا کہتے ہیں؟ تقدیر measuring out (حصہ لگانا، ناپ تول کر معین کرنا) اللہ تعالیٰ علم،قدرت، رحمت، محبت، خیر اور دیگر صفات کو

معین کر کے تقسیم کرتے ہیں۔ کسی مخلوق کا بس نہیں کہ ان صفات میں اپنا نصیب یا حصہ خود مقرر کر سکے۔ ہر شے کو ان حقیقی صفاتِ ہستی میں سے وہی ملتا ہے، اسی حد تک شریک ہونے کی اجازت ملتی ہے جس حد تک الحق کی طرف سے بارگاہِ حق سے اذن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دینے والے ہیں مخلوقات تو صرف عطیۂ صفات کے لیے دامن طلب پھیلا سکتی ہیں۔ "تنزیہ" کا تقاضا ہے کہ حقیقت صرف اللہ ہی سے خاص ہو لیکن "تشبیہ" اس بات کی مقتضی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حقیقت کا ایک پرتو مخلوق کو بھی عطا کر دے، جس طرح بھی اسے منظور ہو۔ تقدیر سازی، مقدورات کا معین کرنا، قدر کا اختیار اللہ کے پاس ہے، ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں۔

لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (۴۲:۲۷)

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی کھول دے تو وہ زمین میں اودھم مچا دیں۔ لیکن وہ ناپ کر اتارتا رہتا ہے جتنا چاہتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں سے باخبر اور ان کو دیکھنے والا ہے۔

قرآن کی اہم اصطلاحات کی طرح "عبد" (جمع۔ عباد) بھی ایک تہ دار لفظ ہے اور اس کے معانی کی متعدد سطحیں ہیں۔ وسیع ترین معنی میں اس کو "مخلوق" کے ہم معنی و مترادف کہا جا سکتا ہے۔ ہر شے اللہ کی بندگی کرتی ہے کیونکہ اللہ نے اسے اپنا کام کرنے کے لیے تخلیق کیا ہے اور وہ اپنا کام کرتی رہتی ہے خواہ اس کا علم رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو، کرنا چاہتی ہو یا نہ کرنا چاہتی ہو۔ جس طرح زمین و آسمان کی ہر شے "مسلم" ہے کیونکہ وہ اللہ کے سامنے سر افگندہ ہے، اس کی اطاعت گزار ہے اسی طرح ہر شے خدا کا عبد ہے، بندہ ہے۔

اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا (۱۹:۹۳)

کوئی نہیں آسمان وزمین میں جو نہ آئے رحمان کا بندہ ہو کر۔

''عبد'' کی اصطلاح کے قدرے محدود معنی مراد لیے جائیں تو عبد وہ شخص ہوگا جو شعوری طور پر کسی نبی کی پیروی کرتے ہوئے اللہ کی بندگی کرتا ہو۔محدود تر معنی میں عبد وہ انسان کہلائے گا جو پوری آگہی کے ساتھ اللہ کی کامل بندگی کرے اور یہ بندگی مکمل طور پر اختیاری ہو۔موخر الذکر معنی میں ''عبد'' کا لفظ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بولا جاتا ہے اور یہ آپؐ کا سب سے جلیل الشان لقب سمجھا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت (۴۲:۲۷) میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو کچھ دیتے ہیں اس کا اندازہ معین کر دیا جاتا ہے ورنہ مخلوقات اپنی حد سے تجاوز کرنے لگیں اور عالمِ خلق میں فساد پھیل جائے۔آیت کو اگر وسیع معنی میں لیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ مخلوق کو جو صفات اللہ نے دی ہیں ان پر کچھ قیود اور پابندیاں ہیں اور انہی پابندیوں سے ان مخلوقات کو شناخت ملتی ہے۔

وَ اٰتٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ (۲۰:۵۰)

اس نے ہر شے کو اس کی خلقتِ (خاص) عطا کی۔

اگر چاند کی روشنی حدِ افراط کو پہنچ جائے تو رات کی ساعتیں نایاب ہو جائیں۔

اگر بلی کو مقررہ حد سے زیادہ طاقت حاصل ہو جائے تو نہ اسے پالتو جانور بنایا جا سکے گا نہ چوہوں کو ختم کرنے کا وسیلہ رہے گا۔یہ حکمتِ خداوندی ہے جو کائنات کے پس منظر میں رہ کر اس امر کا تعین کرتی رہتی ہے کہ سب مخلوقات کے حق میں بہتر کیا ہے۔

فارسی کی ضرب المثل ہے کہ ''اللہ کو معلوم تھا جبھی اس نے گدھے کو سینگ نہیں دیئے''۔

اب اس قرآنی آیت کو ذرا انسان اور انسانی معاشرے پر لاگو کر کے دیکھیے۔ مفہوم یہ نکلے گا کہ سماجی نظام برقرار تبھی رہتا ہے جب انسانوں میں مفلسی، حاجت مندی اور دکھ تکلیف موجود ہوں۔ اگر سبھی لوگ رئیس ہو جائیں تو نانبائی کون بنے گے؟ یا پھر فصلیں اُگانے کی محنت کون کرے گا؟ لوگوں کے درمیان تفاوت معاشرے کی بہبود کے لیے از حد لازمی ہے۔ مزید براں اگر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو غنی اور مالدار بنایا ہوتا تو وہ سب سے بنیادی انسانی کام سے روگردانی کرتے یعنی ''توحید'' کا اثبات۔ اگر اللہ نے انسان کو ہر وہ چیز دے دی ہوتی جس کا تقاضا اس کی اسفل طبیعت (lower nature) میں پایا جاتا ہے تو اس کے پاس اپنی حاجت روائی کے لیے اللہ کی طرف دیکھنے اور اس سے مانگنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی؟ لوگ باگ اسی دنیا کو فردوسِ بریں سمجھا کرتے اور ''توحید'' سے غافل ہو جاتے۔ اللہ کے باغی بن جاتے کیونکہ اب ان کے پاس دوسرے خداؤں کی پرستش کا سامان ہو جاتا، ان خداؤں میں سب سے بڑا خود انسان کی ہوا و ہوس ہے۔

خلاصہ یہ کہ ''قدر'' سے متعلق آیات میں ایک یہ مفہوم بھی مضمر ہے کہ اللہ نے انسان کو جو کچھ دیا ہے اس میں اللہ کی ایک حکمت ہے اور ایسا ایک مقصد سے کیا گیا ہے۔ اس کے کاموں میں حکمت اور رحمت ہے خواہ ہم اس حکمت کا ادراک کرنے سے قاصر ہوں اور خواہ ہمیں اس بات کا دکھ ہو کہ مال و دولتِ دنیا میں سے ہمارے نصیب میں اتنا تھوڑا سا کیوں ہے۔

وَعَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا

شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲:۲۱۶)

شاید تم کو ایک چیز بری لگے اور وہ بہتر ہو تمہارے لیے۔ اور شاید تم کو خوش آئے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے لیے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مخلوقات کو جو خیر بھی، جو اچھی چیز ملتی ہے اللہ کے پیمانۂ تقدیر کے مطابق ملتی ہے۔ قرآن نے اس امر کی طرف "پانی" کی مثال سے اشارہ کیا ہے۔ بارش کا پانی جو آسمان سے زمین پر برسایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ آسمان فرشتوں کا اور ارواح کا مسکن ہے۔ آسمان ہے تو مخلوق ہی مگر ساتھ ہی نور کا ماٰخذ بھی ہے، خالص، پاکیزگی اور بالیدگی کا منبع جس سے زمین پر اگنے والی ہر شے کو نمو ملتی ہے۔ پانی کے بغیر زندگی پنپ نہیں سکتی۔ آسمان کے بغیر زمین مردہ رہتی ہے۔ لیکن اگر زمین نہ ہو تو آسمان اپنے تحفے، اپنے انعامات کیسے اور کہاں ظاہر کرے گا؟ مندرجہ ذیل آیات کا بیان یہ ہے کہ قلمرو تخلیق میں ہر نعمت، ہر برکت جو اس زمین پر ہمیں نصیب ہوتی ہے اللہ کے نظام 'قدر' کے مطابق ہوتی ہے' اس کے پیمانۂ تقدیر سے ناپ کر ملتی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۔ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ (۱۹ - ۲۳:۱۸)

اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کو ٹھہرا دیا زمین میں۔ اور ہم اس کو واپس لے لینے پر قادر ہیں۔ پس ہم نے اس سے تمہارے لیے باغ اُگائے۔

وَالَّذِىْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا

(۴۲:۱۱)

اور جس نے آسمان سے پانی اُتارا ایک اندازے کے ساتھ۔ پس ہم نے اس سے پھر ابھار دیا مردہ زمین کو۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِ ...... (۱۳:۱۷)

اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلیں۔

زمینِ مخلوق وہ خشک وادی ہے، وادی کی تلیٹی ہے جس میں نہ زندگی پائی جاتی ہے نہ علم، نہ ہی ارادہ، قدرت، رحمت اور دیگر مثبت صفات میں سے کوئی ایک، جب تک کہ آسمان سے اترنے والے پانی کا بہاؤ اسے سیراب نہ کرے۔ پھر ہر وادی، ہر طاس، بقدرِ وسعت پُر آب ہو جاتی ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں زور اس بات پر نہیں کہ اللہ تعالی نے ایک معین اندازے کے مطابق پانی عطا کیا۔ لفظ وہی ''قدر'' کا استعمال ہوا ہے لیکن نکتہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب کسی شے کی شناخت معین ہو جاتی ہے، پیمانہ تقدیر طے ہو جاتا ہے تو پھر اس میں اسی ''قدر'' پانی کی سمائی ہو سکتی ہے جو اس کے لیے ''مقدر'' ہے۔

اَعْطٰی کُلَّ شَيءٍ خَلقه

اس نے ہر شے کو اس کی خلقتِ خاص عطا کی۔

لَاتَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰:۳۰)

اللہ کے بنائے میں تبدیلی نہیں۔

ہاتھی کبھی مکھی نہیں بنتا لیکن اولادِ آدم ذرا پیچیدہ مخلوق ہے۔ ابھی ہم نے تقدیر کے بارے میں جتنی باتیں کہیں اس سے بظاہر تو یہ واضح لگتا ہے کہ نوعِ انسانی کے

پاس اپنا کچھ بھی نہیں ۔لیکن صورت حال اتنی سیدھی سادی نہیں ہے پہلی بات تو یہی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے بقدرِ ظرفِ انسانی اسے آزادی واختیار بھی دے رکھا ہے بلکہ انسانوں کے حصے میں جتنا اختیار دے دیا گیا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

## خیروشر

ایمان بالقدر میں کوئی استثناء نہیں ۔حدیثِ جبرئیل میں یوں آیا ہے کہ تم ایمان لاؤ ''قدر پر، اس کے خیر پر اور اس کے شر پر''۔ خیر ہو یا شر جو بھی اس پیمانہ تقدیر سے ناپ کر دیا جا رہا ہے اللہ ہی کا معین کردہ ہے ۔آج کے جدید طرزِ احساس کو یہ نکتہ خاص طور پر ناگوار گزرتا ہے ۔بھلا ایک رحمان ورحیم خدا شر کس طرح تقسیم کر سکتا ہے ۔یہ ردِ عمل قابلِ فہم تو ہے لیکن اُدھوری معلومات پر مبنی ہے ۔اس طرح کا کوئی فیصلہ دینے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ قدر کے اس تصور کو قرآن میں بیان کردہ اس کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مسئلہ زیر بحث یعنی خیروشر کی ماہیت کو گرفت میں لانا ضروری ہے ۔

انگریزی میں خیر اور شر کا مترادف Good-Evil کے الفاظ ہیں ۔یہ دونوں اصطلاحات انگریزی میں بہت پھیلے ہوئے مفاہیم پر محیط ہیں ۔لیکن عام طور پر ان میں اچھے برے کا ایک فیصلہ ضرور مضمر ہوتا ہے ۔اس کے برعکس قرآنی سیاق وسباق میں خیر اور شر عام طور پر صحیح اور غلط کا بیان کرنے کے لیے نہیں ہوا بلکہ اس سے اشارہ کسی شے کے فائدے یا نقصان کی طرف ہوا کرتا ہے ۔

لَا يَسْـئَـمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۰ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (٤١:٤٩)

انسان اپنا بھلا مانگتے ہوئے تھکتا نہیں اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو

مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ (۱۰:۱۱)

اگر اللہ لوگوں کو شتابی سے شر دے دیا کرتا ایسے ہی جیسے انہیں خیر مانگنے کی جلدی ہوتی ہے تو ان کی مدت تمام کر دی گئی ہوتی۔

یہ خیر و شر جس کو بقدر اندازہ معین کرنے کا ذکر ہو رہا ہے اس کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو یا تو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے یا ان سے بچنا چاہتا ہے۔ یہاں مسئلہ زیر بحث اخلاقی معنوں میں خیر اور شر کا نہیں بلکہ اس چیز کے ملنے یا نہ ملنے سے متعلقہ فرد کو اضافی طور پر جس بھلائی یا برائی کا سامنا کرنا ہوتا ہے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حدیثِ جبرئیل میں جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے "قدر" کے خیر اور شر کی طرف اشارہ فرمایا تو آپ کو ایک انسانی صورتحال کے بارے میں فیصلہ دینا تھا۔ ہمیں ضرر و زیاں کا سامنا ہو جائے تو یہ ہمارے لیے شر ہے۔ ہمیں ایک فائدہ پہنچتا ہے یہ ہمارے لیے خیر ہے۔

عام طور پر آپ کا نقصان میرا فائدہ ہوتا ہے۔ جو چیز آپ کے لیے شر ہے وہ کسی اور شخص کے لیے خیر ہے۔ اور اس کے برعکس۔ اسی طرح آج جو چیز شر لگتی ہے وہ آگے چل کر خیر بن کر سامنے آ سکتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ایسے تجربوں سے گزرنا ہوتا ہے جو آج دشوار اور صبر آزما لگتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے بعد جب ہم لوٹ کر ان پر نظر دوڑاتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہاں واقعی یہ ہمارے لیے خیر کی بات تھی۔ یہی نہیں موت جو ایک فرد کے لیے بظاہر شر لگتی ہے دراصل انسان کے لیے باعث خیر ثابت ہوتی ہے۔ ذرا غور کیجیے تو یہ جاننا بھی کچھ مشکل نہ ہوگا کہ موت

اس دنیا کی عمومی بھلائی کے لیے کتنی ضروری ہے۔

قرآن نے بارہا متنبہ کیا ہے کہ خیر و شر کے بارے میں انسان کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ ممکن ہے آپ سٹہ کھیل کر کوئی بڑی رقم جیتنے کو بھلا کام جانیں جبکہ اصل میں یہ آپ کے لیے باعثِ شر ثابت ہو۔ انسان جب اپنے معیار اور اپنے پیمانے سے خیر و شر کا فیصلہ کرنے چلتا ہے تو اکثر ٹھوکر کھاتا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۔ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ (۳ : ۱۸۰)

اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے، یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ بلکہ یہ برا ہے ان کے لیے۔

انسان یوں سوچتا ہے کہ جو اس نے چاہا وہ اچھا ہے اور جو اسے ناپسند ہے وہ برا ہے۔ اکثر لوگ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس دنیا کے مزے، اس دنیا کے فائدے اچھی چیز ہیں۔ لیکن قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لیے یہ چیزیں لازماً خیر کا سبب نہیں ہوتیں، خاص طور پر جب ان میں الجھ کر انسان اپنی انسانی ذمہ داری سے غافل ہو جائے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ (۳ : ۱٤)

لوگ ریجھے ہوئے ہیں مزے کی چیزوں کی محبت پر۔ عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے جوڑے ہوئے ڈھیر، اصیل گھوڑے، مویشی اور کھیتیاں۔

رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر آج تک اس فہرستِ مرغوبات میں بہت کم تبدیلی آئی ہے۔ اگر اسے آج کے اسلوب میں دوبارہ درج کرنا ہو تو پہلی شق کو مذکر مؤنث سے آزاد کر کے "lovers" (چاہنے والے) کر دیجیے اور آخری تین کو ''گاڑیاں، الیکٹرونک آلات اور املاک'' سے بدل دیجیے۔ انسان کی نظر میں یہ سب خیر کے اسباب ہیں اور اگر اللہ تعالی میں دانا والدین کی صفاتِ حکیمانہ نہ ہوتیں تو وہ اس دنیا کے ناسمجھ بچوں کے لیے ان کی من پسند چیزوں کی بھرمار کر دیتا۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔ ان آیات میں رحمتِ خداوندی کا تذکرہ ہے اور رحمت کی اصطلاح کئی اعتبار سے خیر کے مترادف ہے۔ پس انسانوں کے مابین رحمت کی تقسیم اصل میں خیر کو بقدرِ ظرف و بقدرِ اندازہ معین کرنے کے برابر ہے۔ یہی پیمانہ تقدیر ہے۔

اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۰ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَّعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَھُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُھُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا ۰ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۰ وَلَوْلَآ اَنْ یَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِھِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَیْھَا یَظْھَرُوْنَ ۰ وَلِبُیُوْتِھِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَیْھَا یَتَّكِئُوْنَ ۰ وَزُخْرُفًا وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ (۴۳:۳۲-۳۵)

کیا تیرے رب کی رحمت کو یہی بانٹتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی روزی ان میں بانٹی ہے اور بعض کو بعض سے اونچے درجے پر رکھا تا کہ وہ ایک

دوسرے سے کام لے سکیں۔اور تیرے رب کی رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جو یہ سمیٹتے ہیں۔اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ (ناشکری اور حق کو چھپانے کی وجہ سے) ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو ہم ان لوگوں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے جو رحمان کے منکر ہیں اور زینے بھی (چاندی کے) جن پر وہ چڑھتے اور ان کے گھروں کے دروازے ان کے تخت بھی (چاندی کے) جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے، بلکہ یہ (چیزیں) سونے کی کر دیتے اور یہ سب کچھ نہیں، بس جیتے جی ان کو برتنا ہے اور اگلی دنیا کا گھر تیرے رب کے ہاں انہی کا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

یہاں یہ اہم نکتہ ذہن میں رہے کہ قرآن مجید نے کئی مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں جن کا ترجمہ بالعموم ''خیر'' اور ''شر'' کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ان میں ''حسن'' اور ''سوء'' کے الفاظ کا جوڑا خاص طور پر نمایاں ہے کہ ان الفاظ میں ایک قوی کنایہ اخلاقی فیصلے کا پایا جاتا ہے۔ہم نے ان الفاظ کو خیر اور شر سے الگ رکھنے کے لیے ان کا ترجمہ beautiful (خوب) اور ugly (ناخوب) سے کیا ہے۔ قرآن جب ''حُسن'' اور ''سُوء'' کے الفاظ لاتا ہے تو ان میں انسان کے عمل کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں ایک فیصلہ جھلکتا ہے۔یہاں انسان کے فہم میں آنے والے فائدے نقصان کا ذکر نہیں ہوتا۔خیر اور شر کی اصطلاحات بسا اوقات ''حُسن و سُوء''، خوب اور ناخوب، کی اصطلاحات کے ہم معنی ہو جاتی ہیں کیونکہ بلآخر فائدے اور نقصان کا دارومدار صحیح یا غلط اعمال ہی پر ہوتا ہے۔

خیر و شر کی ماہیت کو سمجھنا ہو تو بات کو کلمۂ شہادت (لا الٰہ الا اللہ) کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھنا ہوگا۔ہم نے عرض کیا تھا کہ ہر خیر کی چیز، ہر نوع کا خیر الحق

ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناحق، غیر حقیقی، مساوی ہے شر کے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خیر روشنی ہے اور شر ظلمت ہے۔جیسے ظلمت اصل میں فقدانِ نور کے سوا اور کچھ نہیں اسی طرح شر بھی خیر کے فقدان کے سوا اور کچھ نہیں۔لا الٰہ الا اللہ کا مطلب ہے کہ ''اللہ کے سوا اور کچھ خیر نہیں''۔ہم کلمۂ شہادت میں ''شر'' کا لفظ نہیں داخل کر سکتے کیونکہ شر لاشئی ہے۔

رسولِ خدا نے اپنی مختصر دعائیہ حمد میں اللہ تعالیٰ سے خیر و شر کی نسبت کو یوں واضح فرمایا ہے ''الخیر کلہ بیدیک والشر لیس الیک'' (خیر تو سب کا سب آپ ہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن شر لوٹ کر آپ کی جانب نہیں جاتا) تو پھر شر کا مرجع کیا ہے؟ فقدانِ خیر، خیر نہ ہو تو شر، فقدانِ نور، فقدانِ حقیقت، صفاتِ خداوندی کی ناموجودگی۔بالفاظ دیگر، شر کا تعلق ماسوی اللہ سے ہے جبکہ خیر صرف اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے۔لاخیر الا اللہ۔سیدنا مسیح علیہ السلام نے انجیل میں یہی فرمایا تھا '' Why do you call me good? No one is good but God alone (Mark 10:18) (تم مجھے خیر کیوں کہتے ہو؟ خیر تو بس وہی ایک ہے، اللہ)

تنزیہ کے لحاظ سے دیکھیے تو کائنات کی خلقت ہی میں شر داخل ہے۔اللہ تعالیٰ جس حد تک اس کائنات سے کاملاً وراء اور سوا ہے اسی حد تک کائنات میں کوئی خیر نہیں پائی جاتی کیونکہ خیر تو صرف اللہ ہی ہے۔لیکن اس کائنات میں جہاں تک اللہ کے آثار، افعال اور نشانیاں پائی جاتی ہیں اسی حد تک کائنات میں خیر پائی جاتی ہے اور یہ خیر اللہ کی خیر ہی کی وجہ سے ہے۔

یاد رہے کہ جس سطح پر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہاں خیر و شر کا اخلاقی معاملات سے

کوئی تعلق نہیں اور جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا، خیر اور شر کی اصطلاحات اپنے بنیادی مفہوم میں اخلاقی معنوں میں اچھائی برائی سے الگ ہیں۔ کسی شے کو خیر کہنے کا مطلب ہے کہ اس چیز پر کسی درجے میں صفاتِ خداوندی کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ اور کسی چیز کو شر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی حد تک صفاتِ الٰہیہ کا فقدان ہے۔ اس لحاظ سے ہر شر خیر بھی ہے اور شر بھی۔ خیر تو صرف اللہ ہی، سو اس کے سوا ہر چیز شر ہے۔ لیکن ''تشبیہ'' سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کائنات کی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مطلقاً الگ نہیں ہیں، اس کی غیر نہیں ہیں۔ اشیائے کائنات میں اللہ سے غیریت جتنی کم ہوں گی اتنا ہی ان میں خیر ہوگی۔ ہر شے میں خیر اور شر ملا جلا رہتا ہے، نور اور ظلمت، اعلیٰ و اسفل، علم اور جہل، قوت اور ضعف کا امتزاج ہوتا ہے۔

جب بعض مسلم مفکرین یہ کہتے ہیں کہ ساری کائنات عالمِ خیال ہے، تو ان کے پیشِ نظر اشیاء کی ماہیت میں پایا جانے والا ایک ابہام ہوتا ہے۔ اس ابہام کی علت یہ ہے کہ خلق میں الحق نہ تو مکمل طور پر موجود ہے نہ اس میں سے مکمل طور پر مفقود ہے۔ کائنات کی ہر شے ہمارے سمیت عکسِ آئینہ کے مانند ہے۔ وہ چیز جو آئینے میں اپنا عکس ڈال رہی ہے حقیقتِ الٰہی ہے، جو ہر مثبت صفت کا ماٗخذ اور منبع ہے، وہ جو اپنی نشانیاں ظاہر کرتی ہے۔ یہ آئینہ عدم کا آئینہ ہے اور آئینۂ عدم کی کوئی ہستی نہیں، یہ تو صرف ایک تصور ہے جو ہماری سوچ کو ایک سہارا فراہم کرتا ہے۔ آئینے میں نظر آنے والا عکس اس لحاظ سے الحق کا عین ہے، الحق ہی ہے کہ اس میں الحق کی صفات منعکس ہو رہی ہیں لیکن یہ الحق سے جدا اور سوا بھی ہے کیونکہ یہ عدم کے سہارے سے قائم ہے۔

آئینے میں انسانی عکس کی مثال پر غور کیجیے تو الحق اور عکسِ حق کا معاملہ بخوبی

واضح ہو جاتا ہے۔ آئینے میں دکھائی دینے والا آپ کا عکس کس حد تک حقیقی ہے؟ اگر آئینہ چُور ہو جائے اور عکس غائب ہو جائے تو کیا آپ کو تشویش ہو گی؟ کیا عکس کا مٹ جانا آپ کے لیے افسوسناک ہو گا؟ یہ ''تنزیہ'' کا نقطۂ نظر ہے جو یہ بیان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح حقیقی ہے۔ کاملاً حقیقی ہے اور ہم نرے غیر حقیقی، بے حقیقت۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی کیونکہ ''تشبیہ'' کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ایک بہت بڑا فرق واقع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے عکسِ جمال کی پرداخت کرتا ہے، شکستِ آئینہ اسے گوارا نہیں ہے۔ قرآن ہی کا فرمان ہے کہ وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحمان و رحیم ہے۔ (وھوارحم الرحمین) یہاں ہم اس نکتے پر زور دینا چاہیں گے کہ قرآن میں خیر اور رحمت کے تصورات ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزی کے لفظ Good کی طرح خیر کا لفظ مصدر بھی ہے اور صفت بھی، لیکن اس میں ایک تقابل کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ

وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۴۳:۳۲)

اور تیرے رب کی رحمت بہتر ہے ان چیزوں سے جو یہ سمیٹتے ہیں۔

تو اس میں اس امر کا اثبات پایا جاتا ہے کہ خیر اللہ کی رحمت ہے لیکن ساتھ ہی قرآن ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ خیر صرف خیرِ الٰہی ہے۔ لوگ باگ اس دنیا میں حصول مسرت کے لیے جو کچھ جمع کرتے ہیں، دوستیاں، مال، اسباب یہ سب خیر کی عارضی، فانی اور موہوم شکلیں ہیں۔ ذرا مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمائیے۔ اس میں ایک اور آیت کو ذرا کھول کر بیان کیا گیا۔ ہم اس آیت کا حوالہ خیر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے پہلے بھی دے چکے ہیں۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ (۹:۱۱)

اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازیں اور پھر اس سے یہ چھین لیں تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔

انسان کو رحمت کا ”ذائقہ چکھنے“ کو ملتا ہے۔ اس کا مالک بننے، اس کا ذخیرہ کرنے کی اسے اجازت نہیں۔ بالفاظِ دیگر، رحمت اللہ کی دین ہے، یہ ان کی ملکیت نہیں ہے، رحمتِ خداوندی، اللہ کی صفت ہے اور وہ جس پر چاہتا ہے اپنی رحمت کرتا ہے۔

## آزمائش Trial

قرآن مجید میں بارہا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیمانۂ تقدیر کے مطابق خیر و رحمت انسانوں میں اس لیے بقدرِ تعین تقسیم کرتا ہے کہ ان کے ایمان کی آزمائش کی جاسکے، انہیں اپنی فطرت کا ثبوت مل جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اسے جاننے کی ضرورت نہیں کہ وہ تو اس فطرتِ انسانی سے پہلے ہی آگاہ ہے۔ انسان اپنی فطرت خود اپنے لیے آشکار کرتا ہے تاکہ جب اگلے جہان میں اپنی منزلِ آخر پر پہنچ کر اسے خدا کا سامنا کرنا ہو تو اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے، وہ لوگ جن کا تقدیر پر، اس کے خیر و شر پر ایمان ہے یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو کرتے ہیں ٹھیک کرتے ہیں، خواہ انسان کی ذاتی خواہشات اور امیدوں کا مسلسل خون ہوتا رہے۔ اللہ کی عطا ہو تو اہلِ ایمان شکر بجا لاتے ہیں اور اگر بندش ہو جائے، سلسلۂ عنایات رک جائے تو صبر کرتے ہیں۔ یہی اہلِ ایمان کا شیوہ ہے، اسی سے ایمان کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کا ردِعمل اس انداز کا ہو جسے قرآن نے بار بار بدترین رویہ کہہ کر

ہدفِ تنقید بنایا ہے (اور اس کے لیے خیر وشر اور رحمت وغضب کے الفاظ استعمال کیے ہیں) تو پھر اس کے ایمان میں کسر رہ گئی۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَا بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤُسًا (۱۷:۸۳)

اور انسان پر جب ہم اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے اور پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو آس توڑ بیٹھتا ہے۔

رحمت، خیر و برکت نصیب ہو تو انسان کو شکر گذار ہونا چاہیے اور اگر شر، تکلیف اور قہر کا سامنا ہو انسان کو چاہیے کہ صبر کرے اور ناامید نہ ہو۔ یہی صحیح انسانی رویہ ہے۔

خیر و شر کے فائدے نقصان کا میزان کرنا ہو تو قرآن میں بعض مقامات پر ''بلاء'' (امتحان، ابتلاء) کا لفظ یا ''فتنہ'' (آزمائش) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۱:۳۵)

اور ہم تمہیں پرکھنے کے لیے دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں اور تم ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے۔

قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے طور پر بھیجا گیا ہے کہ اس پر اپنا جوہر آشکار ہو سکے، اپنا خوب اور ناخوب واضح ہو سکے۔ اس امتحان سے گزر کر ہی سب لوگوں پر یہ کھلے گا کہ ان کا آخری ٹھکانہ کیا ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ

يَرْجِعُوْنَ (۷:۱۶۸)

اورہم نے ان کو زمین میں گروہ گروہ کر کے پھیلا دیا۔بعض ان میں نیک ہیں اور بعض اورطرح کے۔اورہم نے ان کو خوشحالی اور بدحالی سے آزمایا شاید وہ لوٹ آئیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ

بے شک ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال، جان اور پھلوں کی کمی سے۔

وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ(۲:۱۵۵-۱۵۶)

اوران ثابت قدموں کو خوشخبری سنادو جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

انسان کا امتحان اور آزمائش صرف شر، دکھ اور مصیبت ہی میں نہیں ہے لذتیں، فائدے اور آسائشیں بھی انسان کی آزمائش کرتی ہیں۔ دکھ تکلیف کے کارن یا عیش وطرب میں پڑ کر یادِ خدا نہ رہے تو انسان اس امتحان میں ناکام رہتا ہے۔یہی نہیں،یادِ خدا بھی صحیح صورت میں ہونا ضروری ہے۔اللہ کی طرف سے ملنے والے انعامات کی فہرست گنوانا کفایت نہیں کرتا۔احساسِ تشکر کا ایمان سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایمان کا تقاضا ہے شریعت کی پابندی، حکمِ خداوندی کی اطاعت۔آیاتِ ذیل میں قرآن نے ان لوگوں پر نکیر کی ہے جو آڑے وقت میں،

کسی مصیبت میں پڑ کر یا انعاماتِ خداوندی پر اترانے کی وجہ سے اس امتحان کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکے۔ اس نکتے پر بھی غور کیجیے گا کہ اس آزمائش میں ناکام رہنے والوں کی خرابی کی طرف اشارہ کرنے کے فوراً بعد ان آیات میں ایسے اعمال صالحہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ایمان کے ثبوت کے طور پر انجام دینا لازم ہیں۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۔ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹:۱۵-۲۰)

لیکن یہ انسان، اس کا رب جب اسے آزماتا ہے، اور عزت بخشتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے۔ اور جب وہ اسے آزماتا ہے اور اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔ (نہیں یہ اس لیے نہیں ہوتا) ہرگز نہیں بلکہ (تمہیں آزمانے کے لیے ہوتا ہے اور تم اسے آزمائش سے بے پروا اس طرح زندگی بسر کرتے ہو کہ) یتیم کو عزت

نہیں دیتے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کے لیے ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو اور مال کی محبت میں متوالے ہوئے رہتے ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کرتے ہیں کہ ان میں سے کون ایمان رکھتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے اور کون لوگ ایسے ہیں جو حق کو چھپاتے ہیں اور فساد

پھیلاتے ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (۱۸:۷)

جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے زمین کی رونق بنایا ہے تا کہ لوگوں کو جانچیں کہ کون ان میں سے اچھا کام کرتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ نِ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (۶۷: ۱۲)

بہت بزرگ بہت فیض رساں ہے وہ (پروردگار) جس کے ہاتھ میں عالم کی بادشاہی ہے۔ (وہی) جس نے موت وحیات کو پیدا کیا تا کہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں جونکتہ بیان ہوا ہے وہ قرآن میں بہت سے مقامات پر دہرایا گیا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ انسان اکثر اپنی حیثیت اور اپنے اعمال کے مطابق اپنے درجے کوشناخت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔اگر کوئی خیر نصیب ہوتو یوں سوچتا ہے کہ یہ اس کا حق تھا لیکن اگر کوئی برائی آن پڑے تو کہتا ہے کہ میرے ساتھ ظلم ہو گیا۔ یہ ''کفر'' ہے (یعنی ناشکری اور حق کو ڈھانپنا، کتمانِ حق)۔ یہ رویہ ایمان اور شکرگذاری دونوں کے خلاف پڑتا ہے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ

پس جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اسے اپنی

طرف سے کوئی نعمت

هِيَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹:۴۹)

بخشیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میری تدبیر سے حاصل ہوئی۔ کوئی نہیں! یہ ایک آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔

توحید کا مطلب ہے کہ انسان کی کوئی مثبت چیز ایسی نہیں جو صحیح معنی میں اس کی اپنی ہو۔ معاملہ برعکس ہے۔ ہر خیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لوگوں کو اگر خیر سے سابقہ پڑتا ہے تو یہ سراسر خدا کی دین ہے، انسان کا اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔ اگر خرابی کا سامنا ہوتا ہے تو اس لیے کہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔ اللہ کی رحمت اور اس کی برکت نہ ہو تو انسان ناچیز اور نابود ہو جائے۔ انسان کو اپنے اندر کے خیر اور نیکی کا جو زعم ہے اس کی تصویر کشی قرآن نے اسی طور کی ہے کہ یہ ماہیتِ اشیاء کو غلط معنی دینے کا عمل ہے۔ انسان کے زعمِ باطل سے کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ ہاں جھوٹے دعوے کرنے والے لوگ ضرور نقصان اٹھاتے ہیں۔ ''عدل'' اللہ کی ایک صفت ہے اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ''کسی شے کو اس کا صحیح مقام دینا، اس کی درست جگہ پر رکھنا''۔ ''عدل'' کا الٹ ہے ''ظلم''۔ قرآنی استعمال کے مطابق ہم اس کا ترجمہ ''غلط کاری'' wrongdoing کر سکتے ہیں۔ غلط کاری انسان کا خاصہ ہے۔ اس کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ ظلم کا مطلب ہے کسی شے کو غلط جگہ پر رکھنا، بے جگہ کرنا۔ انسان کی غلط کاریوں کو قرآن نے جا بجا ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ان لوگوں کا ذکر ہے جنہیں اس غلط کاری سے نقصان پہنچا ہے تو ان کے لیے قرآن مجید نے تقریباً ہر جگہ ''نفس'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انسان خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سورج کو پھر کیا کاٹے گا۔ ہاں انسان جب کبھی بھی

کسی شے کو بے جگہ کرے گا، بے جا کام کرے گا اسے نقصان ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔اس سے انسان کی اپنی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ خود کو گمراہ کر لیتا ہے۔

مندرجہ ذیل آیت ان آیات کی ایک مثال ہے جن میں ''ظلم'' کا تذکرہ ہے، یہ آیت ان اقوامِ کہن کی تباہی کے قصے میں وارد ہوئی ہے جنھوں نے اپنے رسولوں کا انکار کیا تھا۔یاد رہے کہ اللہ کے سوا جس شے کی پرستش کی جائے، جس کی بندگی کی جائے وہ خدا بن جاتی ہے۔سب سے بڑا ''ظلم'' شرک ہے، ان اشیاء کی بندگی کرنا جو اطاعت کے لائق نہیں، اللہ کی جگہ ماسوی اللہ کو دے دینا، اللہ کی جگہ جھوٹے خداؤں کو خدا بنا لینا۔

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۔ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۱:۱۰۱)

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جان پر ظلم کر گئے اور پھر جب تیرے رب کا حکم آ گیا تو ان کے وہ دیوتا جن کو ہو اللہ کے سوا پکارتے تھے ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور انہوں نے ان کی بربادی کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ جب رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا کہ ''قدر، خیرہ وشرہ'' تو ان کے پیشِ نظر یہی بات ہوگی جو لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں جو کچھ دیکھنا پڑتا ہے، جو بھی پیش آتا ہے اس میں کچھ خیر ہوتا ہے اور کچھ شر۔انسان کا اس بات پر ایمان ہونا چاہیے کہ اسے جو بھی درپیش ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔اس میں انسان کو اپنا بھلا دکھائی دے یا برا، فائدہ نظر آئے یا نقصان اسے صبر اور شکر سے قبول کرنا چاہیے اور

ہر آن یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کی رحمت اسکے غضب پر بھاری ہے، اس کی مہربانی اس کے غصے سے بڑھی ہوئی ہے۔انسان کو جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ اس کے ایمان کی آزمائش ہوتا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ

(۲۹:۲)

کیا لوگ اس گمان میں ہیں کہ وہ اتنا کہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔

## آزادی و اختیار Freedom

تقدیر پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ ہر خیر اللہ ہی کی طرف سے ہے۔اللہ کے سوا ہر شے میں کسی نہ کسی لحاظ سے خیر کا فقدان ہے۔وہ لوگ جنہیں یہ ایمان میسر ہے وہ خیر کی ہر بات پر اللہ کا شکر بجالاتے ہیں اور اگر کسی اعتبار سے کوئی محرومی رہ جائے تو اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں۔انہیں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ ''الحق'' جو ''الرحمٰن'' بھی ہے وہ ہر شے کو ایک قدر و انداز سے معین کرتا ہے، اس کا پیمانہ تقدیر حکمت پر مبنی ہے اور اس میں ہر شے کی حتمی اور آخری بھلائی اور بہتری مقصود ہوتی ہے:

وَاِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَئُوْسًا (۱۷:۸۳)

جب اس پر مصیبت آتی ہے تو مایوس ہوجاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲۹:۲۳)

اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات اور اس کے ملنے سے انکار کیا وہی لوگ

میری رحمت سے نا اُمید ہوئے اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اَوَلَمْ یَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ۔ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ۔ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ(۳۹:۵۲-۵۳)

کیا یہ لوگ نہیں جان سکے کہ اللہ ہی ہے جو رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور تنگ بھی کر دیتا ہے۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔ کہہ دو، اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے آس نہ توڑو۔ بے شک اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے۔ وہ جو ہے، وہی ہے معاف کرنے والا، مہربان۔

تقدیر کے بارے میں مختصر الفاظ میں جب بھی کچھ کہا جائے گا اس میں ایک منطقی تضاد کی جھلک پائی جائے گی۔ کیا خیر اور کیا شر اگر ہر شے بقدر اندازہ معین ہے تو پھر کیا اس کا صریحاً یہ مطلب نہیں کہ ہمارا اس میں اب کوئی عمل دخل نہیں، جو ہونا ہے وہ طے ہو چکا ہے؟ آخر رسولِ خداؐ ہی کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کی منزلِ آخرین، اس کا آخری ٹھکانا اس کے لیے اسی وقت لکھ دیا جاتا ہے جب وہ ابھی رحمِ مادر میں ہوتا ہے۔[۳۵] اس صورت میں مذہب کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے؟ ہر بات تو پہلے سے مقرر ہو چکی، ہر امر کا فیصلہ کر دیا گیا۔

یہ مسئلہ جبر و قدر کا ہے Free will and predestination اس سوال نے مختلف مذاہب کے علماء اور مفکرین کو صدیوں سے چکرا رکھا ہے۔ فکرِ اسلامی نے اس کلامی اور فلسفیانہ مسئلے کے جو حل تلاش کیے ہیں وہ ہم ان صفحات میں پیش نہیں کر رہے۔ اس ضمن میں مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ہم اپنی تحریر میں صرف قرآن مجید میں بیان کردہ نکات تک محدود رہیں گے اور صرف اتنا عرض کریں گے کہ تمام اہم مسائل کی طرح اس مسئلے کا بھی کوئی سادہ صاف اور واضح حل نہیں ہے۔ قرآن نے جس طرح اکثر مقامات پر اس بات کا اثبات کیا ہے کہ ہر شے اللہ کے پیمانہ تقدیر کے مطابق ظاہر ہوتی ہے نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے وقوع میں آنے سے قبل اسے جانتا ہے اسی طرح یہ بات بھی اکثر جگہ کہی گئی ہے کہ انسان کا عمل، اس کی کوشش بے معنی اور بے مصرف نہیں ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۷:۱۹)

اور جو آخرت کا طالب بنتا ہے اور اس کی شایانِ شان کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی مقبول ہوگی۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى

(۵۳:۳۹-۴۰)

اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو کمایا اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب دکھائی جائے گی۔

قرآن کیا ہے، وہ کتاب جو انسان کو اللہ کی راہ میں جدوجہد پر ابھارتی ہے اور سعی و عمل کی تلقین کرتی ہے۔ قرآن جس طرح ''اسلام'' کا ثناتی اور ''اسلام''

اضطراری کے علاوہ اختیاری ''اسلام'' کا تقاضا کرتا ہے اسی طرح وہ انسان سے جہاد اور مجاہدے کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔اگر نوعِ انسانی محض کٹھ پتلیوں کی طرح ہوتی، اسے اپنے اوپر کوئی اختیار نہ ہوتا تو قرآن جیسی کتاب کے کوئی معنی نہ رہتے کہ کیونکہ وہ پتھروں سے یہ کہہ رہا ہے کہ پرواز کر کے دکھاؤ۔

جبر اور اختیار کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ گویا انسان کی صورتِ حال بیان کرنے میں یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔کسی ایک پر اکتفا کرنے سے پوری بات واضح نہیں ہوتی۔ان دونوں تصورات کا باہمی ربط سمجھنے کا ایک مفید طریقہ یہ ہے کہ معاملے کو ''تشبیہ'' اور ''تنزیہ'' کی اصطلاحات کے حوالے سے دیکھا جائے۔

''تنزیہ'' کے نقطۂ نظر سے انسان کی حقیقت محض بے حقیقت ہے کہ حقیقت اگر ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔انسان کے پاس نہ تو علم ہے، نہ قدرت، ارادہ اور آزادی کہ یہ صفات اللہ کی صفات ہیں اور اللہ ہی ان صفات کا مالک ہے۔''تشبیہ'' کے لحاظ سے دیکھیے تو انسان میں ان صفاتِ خداوندی کا عکس پایا جاتا ہے۔صفات اللہ کی ہیں لیکن ان کا اثر اور تاثیر انسانوں میں ظاہر ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ ''فعالٌ لما یرید'' ہے (جو چاہتا ہے کرتا ہے) سو انسان بھی اپنے ارادے پر عمل کر سکتا ہے۔

لیکن انسان کی آزادی اور اختیار پر پابندیاں کس قدر ہیں، یہ سبھی جانتے ہیں۔انسان کو نہ اپنی جائے ولادت منتخب کرنے کا اختیار ہے نہ اپنے والدین، اپنی نسل، تہذیب وثقافت، مادری زبان اور اپنے بنیادی جسمانی خواص کے چناؤ کی آزادی۔اور بھی کئی چیزوں کا اختیار اسے میسر نہیں۔یہ سب اسے دے دی جاتی ہیں لیکن ان سب دی ہوئی چیزوں کے اندر رہتے ہوئے اختیار اور چناؤ کی آزادی باقی رہتی ہے۔یہ اختیار جس حد تک حقیقی ہے اسی حد تک انسان آزاد ہے۔

غور کیجیے کہ جبر Predestination کا تعلق ''تنزیہ'' سے ہے اور صفاتِ جلال کی جانب۔ الٰہیات کے مباحث میں جو اہم ترین اصطلاحیں اس تصور کے لیے استعمال ہوتی ہے ان میں سے ایک ''جبر'' ہے اور قرآن مجید میں اللہ کا ایک نام ''الجبار'' (The Irresistible,The (All-Overpowering یہ نام اسمائے جلال اور اسمائے غضب کی صف میں شامل ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسمائے جمال اور اسمائے رحمت کو اسمائے جلال اور اسمائے قہر پر غلبہ پانا ہے۔ محبت اور رحمت، جبر کو زیر کر لیں گی۔ اسمائے حسنیٰ اللہ کے قرب کا موجب ہوتے ہیں اور انسان اللہ سے جتنا نزدیک ہوگا اسی قدر اللہ کے اختیار میں سے اسے حصہ ملتا جائے گا۔

آج کے جدید معاشرے میں ہم آزادی کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور اسے زندگی کا ایک قابلِ قدر مقصد قرار دیتے ہیں۔ سامنے کی بات ہے کہ آزادی کے دو بنیادی اسلوب ہیں ''کسی چیز کی آزادی'' اور ''کسی چیز سے آزادی''۔ ہم سختی اور جبر و ستم سے آزادی چاہتے ہیں اور ہم اظہارِ رائے کی، اپنی بات کہنے کی آزادی مانگتے ہیں، اپنی مرغوب چیزوں سے لطف اٹھانے کی آزادی چاہتے ہیں۔ انسانوں کے معاملات میں آزادی کے یہ دو اسلوب ایک دوسرے سے اکثر ٹکرا جاتے ہیں مثلاً اشیائے صرف کی بھرپور رنگارنگی سے لطف اندوز ہونے کی آزادی حاصل کرنے کی قیمت دنیا کے دوسرے خطوں میں بسنے والی اقوام کوئی طرح چکانا پڑتی ہے۔ یہ اقوام ماحولیاتی تباہی اور قدرتی وسائل کے استحصال کی صورت میں اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں۔ آزادی کے سکے کی دوسری طرف غلامی کا پیغام بھی کندہ ہوسکتا ہے۔ آپ کے لیے جو چیز اچھی ہے خیر کا باعث ہے وہی شے

کسی دوسرے کے لیے کئی قباحتیں پیدا کرسکتی ہے، باعثِ شر ہوسکتی ہے۔ آپ کی آزادی دوسرے کی غلامی ہوسکتی ہے بلکہ خود آپ ہی کو غلام اور پابند بنا سکتی ہے۔ ذرا ان لوگوں کے بارے میں سوچیے جو صرف آزادی کی خواہش میں اور مزے اڑانے کی خاطر اپنے آپ کو اتنا گرا لیتے ہیں کہ گھٹیا اور ذلیل نوکریوں اور کاموں کے غلام بن جاتے ہیں۔

مسلمان مفکرین نے دونوں طرح کی آزادی پر غور و فکر کیا ہے۔ ان کا تصورِ آزادی جدید تصور سے اس لحاظ سے الگ ہے کہ ان کے تصور کی بنیاد شہادۃ پر رکھی گئی ہے۔ "لَامُختارَ اِلَّا اللّٰہ" (اختیار اگر کسی کو ہے تو اللہ ہی کو) اللہ ہر طرح کی خارجی پابندی اور مجبوری سے آزاد اور بری ہے۔ "فعّالٌ لِمَا یُرِید" (۱۱:۱۰۷) (جو چاہے کر گزرنے والا ہے "a sovereign doer of what he desires") کسی مخلوق میں یہ صفت موجود نہیں ہوسکتی۔ اللہ کے سامنے ہر مخلوق سراسر غلامی اور بندگی کی اسیر ہے۔ نوعِ انسانی کو آزادی و اختیار حاصل کرنا ہو تو اسے اللہ کے اختیار و آزادی میں حصہ لینا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے آپ کے سوا ہر شے سے آزاد ہے۔ وہ سب عالموں سے بے نیاز ہے "غَنِیٌّ عَنِ العَالَمِین" (۳:۹۷) انسان کبھی بھی اللہ سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

یَاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (۳۵:۱۵)

لوگو! تم ہو اللہ کے محتاج اور اللہ وہی ہے بے پروا، سب خوبیوں سے سراہا ہوا۔ ہر طاقت، حقیقت اور حمد و ستائش صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔

انسان کبھی بھی اللہ تعالیٰ سے بھاگ نہیں سکتا کہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ''مسلم'' اور ''بندہ'' ہے۔ سو اسے یہ نکتہ جان لینا چاہیے اور اپنے اختیار سے اللہ کی بندگی کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ حقیقت کے سامنے گستاخانہ مقابل ہونے سے بچ جائے گا۔ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے ہی انسان اللہ کے سوا ہر شے سے آزاد ہوتا ہے۔ اللہ ''کے لیے'' آزاد ہو کر ہی انسان کو ماسوی اللہ سے آزادی میسر آتی ہے اور ماسوی اللہ سے آزاد ہونے کا مطلب ہے ہر غیر حقیقی شے سے آزاد اور ''الحق'' کے لیے آزاد۔ اس کا مطلب ہے ہر نوع کے شرک سے بری ہونا اور ''توحید'' کا اثبات کرنا۔

پس اسلام کے نقطۂ نظر سے ''کسی شے سے آزادی'' کا مفہوم ہے ان پابندیوں اور قید و بند سے آزادی جو مخلوقات نے ہم پر عائد کر رکھی ہیں اور اس آزادی کے ساتھ اللہ کی بندگی۔ ''کسی شے کے لیے آزاد'' کا مطلب ہے ہر معاملے میں ''الحق'' The Real کو غیر حق، بے حقیقت اشیاء پر ترجیح دینا۔ غیر حق کے لیے آزاد ہونا ایک بے معنی بات ہے کہ غیر حق تو معدوم ہے۔ لوگوں کی خواہش یہ ہونا چاہیے کہ وہ علم، ارادے، قدرت، خیر اور ہر مثبت شے کے لیے آزاد ہوں۔ الحق کے سوا کوئی اور حقیقت نہیں۔ پس غیرِ حق سے آزادی کا مآل کار مطلب ہے ''الحق'' کے لیے آزادی۔ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ ہر دو توحید ہی کے مظاہر ہیں۔

کیا ہم آزاد و با اختیار ہیں؟ جواب اثبات میں بھی ہے اور نفی میں بھی۔ ہم اس حد تک آزاد ہیں جس حد تک ہم خدا سے مشابہ ہیں لیکن ہماری تشبیہ میں تنزیہ ملی ہوئی رہتی ہے۔ توحید، ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' ہر دو کا تقاضا کرتی ہے۔ آزادی و اختیار وہ حقیقت ہے جس کے کئی درجات ہیں۔ انسان جس قدر اللہ کے قریب ہوگا اسی

قدر آزاد ہوگا۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایسی توحید کی راہ دکھائی جائے جس میں ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' صحیح توازن کے ساتھ پائی جائیں۔ انسان ہونے کا مطلب ہے نسبتاً آزاد و با اختیار ہونا۔ لیکن انسان کو جتنی آزادی میسر آ سکتی ہے اس حد تک آزاد ہونے کے لیے ضروری ہے انسان میں پوری فرمانبرداری اور مکمل تسلیم و اطاعت پیدا ہو جائے۔

جبر و اختیار کے مبحث پر ہم ایک آخری نکتہ مزید عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو قادرِ مطلق قرار دینے پر جب لوگوں کی طرف سے اعتراض اٹھایا جاتا ہے اور اس کے تضادات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تو یہ غور کرنا ضروری ٹھہرتا ہے کہ ان اعتراضات کے پسِ پشت کیا نیت کارفرما ہے؟ دوسرے لفظوں میں ہم یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں کہ لوگ اعتراض کیوں کرتے ہیں؟ عام طور پر اس اعتراض کے پیچھے یہ نیت پوشیدہ ہوتی ہے کہ مخاطب پر اس کی حماقت ظاہر کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اللہ کے تصور یا انبیاء کی ہدایت کا تصور رکھنا سادہ لوحی کی بات ہے۔ اس میں کوئی معنی نہیں ہیں۔

آج کی اصطلاح میں بات کیجیے تو یہ کہنا ہوگا کہ جب لوگ باگ تقدیر کے تصور کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو عموماً ہوتا یہ ہے کہ کچھ باتیں، کچھ منفی تعبیرات انہوں نے پہلے سے طے کر رکھی ہوتی ہیں اور انہی کے تحت عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ احتجاج کرنے والے اپنے تئیں اس مسئلے کی بدترین صورت فرض کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس تصویر کے پسِ پشت اصل مسئلہ اور اصل محرک حصولِ اقتدار وقوت ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اصل میں معاملہ کچھ یوں ہے کہ چند لوگوں نے مذہبی تعلیمات کو آلۂ کار بنا کر انہیں اپنے اقتدار اور قوت کے لیے استعمال کیا ہے تاکہ

دوسروں کو اپنا غلام بنا کر رکھ سکیں۔

ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اس طرح کے لوگ اور مذہب کا غلط استعمال کرنے والے پائے جاتے ہیں لیکن بایں ہمہ ہمیں اس امر کا اثبات کرنا چاہیے کہ معاملے کو دیکھنے کا صرف یہی ایک ڈھنگ نہیں ہے۔ دوسرے انداز سے دیکھیے تو معاملہ کچھ اور نظر آئے گا۔ اسلام نے اس مسئلے کو ہمیشہ توکل اور اعتماد کی بنیاد پر دیکھا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ توکل اور بھروسا کسی انسان پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر کیا جاتا ہے۔ توکل (Trust) کا ذکر قرآن میں ۴۰ آیات میں کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر جگہ اللہ ہی پر توکل کا ذکر ہے۔

وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳:۱۲۲)

اللہ ان کا مددگار ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہلِ ایمان بھروسا کریں۔

اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ ۰ مَامِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَا صِیَتِھَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱:۵۶)

میں نے بھروسہ کیا اللہ پر جو رب ہے میرا اور تمہارا۔ جتنے بھی جاندار ہیں ان کی پیشانی اسی کی گرفت میں ہے۔ بے شک میرا رب نہایت سیدھی راہ پر ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ (۱۲:۶۷)

حکم تو بس اللہ ہی کا ہے۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (۶۵:۳)

اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ

(١٦:٩٩)

اس کا ان لوگوں پر کچھ زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

ایک مشہور حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اس کے بارے میں اچھا گمان رکھے، اللہ کے کیے پر کبھی شک وشبہ نہ کرے۔ ''انا عند ظن عبدی بی'' [۱۴] (میں ویسا ہوں جیسا میرا بندہ میرے بارے میں رائے رکھتا ہے) انسان اگر اللہ سے خوش گمانی اور اچھی امید رکھے گا تو وہ بھی انسان سے اپنی رحمت، محبت اور کرم وشفقت کا معاملہ کرے گا۔

مسلمان اگر اللہ تعالی سے اچھی امید رکھتے ہیں، اس سے خوش گمان رہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ ''الحق'' ہے، اصلی حقیقت ہے اور حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ رحمت کو غضب پر غلبہ حاصل ہو۔ مسلمانوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ قرآن نازل کرنے سے اللہ کا جو مقصد ہے وہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ قرآن کے وسیلے اللہ تعالی انسان کو حتمی سعادت اور فلاح ومسرت تک لے جانا چاہتے ہیں، اسے اس کے مقدر کی تکمیل اور حصول تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ جب قرآن یہ دعوی کرتا ہے کہ ہر شے بہ اندازۂ تقدیر ہے تو اس کا سیدھا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر شے اللہ کے اختیار میں ہے یعنی یہ کہ ''حقیقت'' جو اٹل ہے۔ اسے بدلنے کے لیے انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں۔

آزادی و اختیار اور ہدایت بھی پیمانہ تقدیر کے مطابق ملا کرتی ہیں۔چنانچہ انسان اللہ کی دی ہوئی ہدایت کو قبول کرنے یا رد کرنے کے لیے آزاد ہے۔اس پر ذمہ داری کا ایک بوجھ ہے اور اسے اس بات کی جوابدہی کرنا ہوگی کہ اسے جو آزادی ملی تھی اس کو انسان نے کیسے استعمال کیا اور اللہ کی ہدایت ملی تو اس کے سامنے اس کا رویہ کیا تھا۔یہی انسان کی ذمہ داری کی آخری حد ہے۔جن امور میں وہ آزاد نہیں تھا یا اس تک ہدایت نہیں پہنچی ان کے لیے اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔[۳۲]

## مخلوقات کا اصولِ تنوع

ہر شے اللہ کے پیمانہ تقدیر کے مطابق ہوتی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۱:۱۵)

اور کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اس کو ایک معین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔

تقدیر صرف اس مسئلے سے متعلق نہیں ہے کہ انسان کو آزادیٔ اختیار حاصل ہے یا نہیں۔معاملہ اس سے کہیں وسیع ہے، اس کے مضمرات دور تک پھیلے ہوئے ہیں کیونکہ یہ تو تخلیق کی اُصولی بنیاد ہے۔عرصۂ ہستی میں کوئی چیز بھی ہوا سے اللہ تعالیٰ نے بِقدرِ معلوم بنایا ہے اور اس کی سرشت مقرر کی ہے۔

اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ (۲۰:۵۰)

اس نے ہر شے کو اس کی خلقتِ خاص عطا کی۔

اس پیمانہ تقدیر سے ناپ کر تخلیق کرنے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک

ایسا وسیع وعریض اور عظیم الشان کارخانہ کائنات پیدا کیا ہے اور اس میں مخلوقات کی ایسی رنگا رنگی رکھی ہے کہ انسان کے وہم وگمان سے باہر ہے۔ اللہ کی تخلیق کردہ چیزوں کو ایک ایک کرکے شمار کرنے بیٹھیے تو گنتی کبھی ختم نہ ہو پائے گی۔ تاہم عمومی انداز میں بات کی جائے تو کسی حد تک ممکن ہوگا کہ مخلوقات کو مختلف اصناف اور اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ یہ تقسیم ساری مخلوقات کا احاطہ تو نہیں کر سکتی لیکن ایک عمومی اندازہ اس بات کا فراہم کر سکتی ہے کہ چشمِ بصیرت ہو تو انسان بہت کچھ دیکھتا ہے اور دیکھ سکتا ہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ کائنات کی بنیادی تقسیم دو طرح کی ہو سکتی ہے، دیکھی اور اندیکھی دنیا، عالمِ غیب اور عالمِ شہود۔ اسی کو بعض اوقات ''ارض وسما'' (زمین وآسمان) کہہ دیا جاتا ہے یا عالمِ روحانی اور عالمِ جسمانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ذکر آیا تھا کہ ایک تیسری دنیا بھی ہوتی ہے جو ان دونوں دنیاؤں سے مشابہ بھی ہے اور مختلف بھی۔ اسے ''عالمِ خیال'' کہتے ہیں۔ اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ اگر ان تین دنیاؤں کو ملا کر اس کائنات کے عمومی ڈھانچے کی تشکیل کی جا سکتی ہے اور اسے عالمِ کبیر کہا جاتا ہے تو پھر انسان کو ایک چھوٹی سی دنیا، ایک عالمِ صغیر کہا جا سکتا ہے کیونکہ ہر فرد میں یہ تینوں متوازی اقالیم یا وجود کی سطحیں پائی جاتی ہیں ہر انسان روح، نفس اور بدن کا مرکب ہے۔

اب ہم ذرا ان مادی اشیاء کا جائزہ لینا چاہتے جو اس کائنات میں بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ مسلم مفکرین نے اس ضمن میں یونانی فکر کی معروف درجہ بندی کو اختیار کیا ہے جس میں تمام مرئی اشیاء کو تین بڑی اقسام میں بانٹ کر دیکھا گیا ہے یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات۔ ہمارے مبحث سے متعلق جو بات قابلِ غور ہے وہ

یہ ہے کہ ان تینوں اقسام کی مخلوقات میں اللہ کی نشانیاں کیونکر ظاہر ہوئی ہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر غور وفکر کیا جائے جو ان مخلوقات میں آشکارا ہو رہی ہیں۔ جمادات میں اللہ کی کونسی صفت ظاہر ہوتی ہے؟ اس سوال کا شاید سب سے بہتر جواب تو یہ ہوگا کہ جمادات میں اللہ کی صفات ظاہر ہونے کے بجائے مخفی ہو جاتی ہیں۔ بے جان اشیاء ان صفات کا پردہ بن جاتی ہیں۔ ان سے ہمیں یہ سراغ نہیں ملتا کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا نہیں ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ کائنات کی ہر شے، ایک شے ہونے کے کارن، ماسوی اللہ ہے، سو ہم ہر شے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یوں نہیں ہیں۔ یہ ہوا ''تنزیہ'' کا نقطۂ نظر۔

''تشبیہ'' کے پہلو سے بھی ہر شے ہم سے کچھ نہ کچھ کہتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو بے جان اشیاء میں، جمادات میں تشبیہ کی جہت سب سے مدہم اور کمزور ہوتی ہے۔ پتھر میں صفاتِ خداوندی کی جھلک پانا بہت ہی دشوار ہے اگرچہ سنگِ گراں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے ابدی، غیر متغیر اور باقی ہونے کا خیال ضرور ابھرتا ہے۔ لیکن زیادہ تر پتھروں سے پیغام ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بے انتہا دور اور سراسر الگ ہے۔ پھر بھی پتھروں، بالخصوص بہت حجم والے پتھروں، ستاروں وغیرہ کو دیکھ کر یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، ''القوی''، ''الجلیل'' اور ''الملک'' ہے جس نے یہ کوہِ گراں اور کتنے ہی سورج اور کہکشاں ریت کے ذروں کی طرح بکھیر رکھے ہیں۔

جمادات کے برعکس پودوں میں بہت سی صفاتِ خداوندی کی واضح اور صریح جھلک پائی جاتی ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ پودوں میں جان پائی جاتی ہے اور زندگی یا حیات ''ائمہ سبعہ'' (the seven leaders) میں سب سے پہلی

صفت ہے۔ یہ سات صفاتِ خداوندی کائنات میں دوسری سب صفات پر غالب ہیں۔ پودوں میں ایک طرح کا علم بھی ہوتا ہے۔انہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غذا کہاں سے ملے گی اور سورج کی روشنی کیسے حاصل ہوگی۔ان میں خواہش و ارادہ بھی یقیناً ہوتا ہے۔ وہ پانی مانگتے ہیں،سورج کی روشنی مانگتے ہیں، کھاد اور غذائی عناصر تلاش کرتے ہیں اگر آپ ان سے اچھا برتاؤ کریں گے، جو وہ چاہتے ہیں وہی ان کو فراہم کریں گے، مثلاً اچھی طاقت ور کھاد، تو وہ شکر گزار بھی ہوتے ہیں اور بھرپور فصل کے ذریعے اپنی ممنونیت ظاہر کرتے ہیں۔پودے ناشکرے نہیں ہوتے، انکارِ حق نہیں کرتے، کفر میں نہیں پڑتے۔پودوں میں قوت بھی ہوتی ہے اور وہ سنگ وخشت کو شکست دے سکتے ہیں لیکن اس کے لیے انہیں وقت درکار ہوتا ہے۔ یہ سب صفاتِ خداوندی نباتات میں پائی تو جاتی ہیں مگر ذرا کمزور دھندلے انداز میں۔سو ''تشبیہ'' پر ''تنزیہ'' غالب رہتی ہے۔

اس کے برعکس حیوانات میں صفاتِ خداوندی کہیں زیادہ شدت سے ظاہر ہوئی ہیں۔مزید براں یہ کہ حیوانات کی دنیا میں کچھ اور صفات کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ جو عالمِ جمادات میں مشکل ہی سے نظر آتی ہیں۔حیوانات کو علم میسر ہے اور وہ غیر معمولی ہوسکتا ہے لیکن یہ علم ہمیشہ ایک خاص نوعیت کا رہتا ہے۔شہد کی مکھی اپنے چھتے کی سب مکھیوں کو یہ بتاسکتی ہے کہ بہترین شہد کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن شہد کی مکھی کو سرکے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔شاہ تتلی کو میکسیکو میں واقع اپنی وادی کا راستہ اور محل وقوع ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے لیکن نیویارک شہر کا راستہ بتانے کے لیے اسے راہبر نہیں بنایا جاسکتا۔جانوروں کی دنیا میں علم اور ہنر مندی کی ایک حیرت انگیز رنگا رنگی اور ناقابل یقین تنوع نظر آتا ہے جو خاص نامیاتی اجسام کی ایک بڑی تعداد میں

پایا جاتا ہے۔ جانوروں میں خواہش اور ارادہ پایا جانا بھی واضح ہے لیکن حیوانات کی تمام انواع میں یہ تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں چنانچہ اس سے ایک بڑا طبعی اور قدرتی توازن جنم لیتا جس میں، مولانا روم کے الفاظ میں ''ہر شے کھاتی بھی ہے اور کھائی بھی جاتی ہے''۔۳۴

نباتات اور حیوانات دونوں میں خاص خاص نشانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد گونا گوں انداز میں ظاہر ہوئی ہے۔ ہر پودا اور حیوانات کی تمام انواع صفاتِ خداوندی کا ایک خاص مجموعہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے پودے یا کسی دوسرے جانوروں میں اسی طرح دوبارہ ہویدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ شاہ بلوط کے درخت پر اسی کا پھل لگتا ہے اور شاہ بلوط سے سیب نہ اتریں تو کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ اگر شاہ بلوط پر سیب لٹکنے لگیں تو ہم ضرور سوچیں گے کہ یہ تو انہونی بات ہوئی۔

جانوروں کی ہر نوع میں علم، ارادہ و خواہش، قوت اور دیگر صفاتِ خداوندی جدا جدا انداز میں پائی جاتی ہیں۔ یہ انداز اسی نوعِ حیوانات سے خاص ہوتا ہے اور اسی سے اس نسل کو دیگر جانوروں سے الگ پہنچانا جاتا ہے۔ چونکہ یہ صفات اسی نوعِ حیوانات سے مخصوص ہیں لہٰذا ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مور، ہاتھی یا بلی سے کیا سامنے آئے گا۔ اس معاملے میں کسی حد تک ایک اچنبھے اور حیرت کا عنصر بھی شامل رہتا ہے لیکن اس ضمن میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ یا تو ہم جانوروں کی اس نسل سے بے خبر ہیں یا بعض خارجی عوامل کا ہمیں علم نہیں ہے۔ مثلاً کوئی بیماری وغیرہ جس سے معاملے کو سمجھنے میں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

انسان بھی جاندار ہے۔ اس کا تعلق نوعِ حیوانات سے ہے اور اس میں اور حیوانات میں بہت سے خواص مشترک ہیں۔ لیکن اس میں ایک عجیب خاصیت ایسی

ہے جو اسے دوسرے ہر جاندار سے الگ اور ممتاز کر دیتی ہے۔ ہر جانور جیسا ہے ویسا ہی ہے اس میں گڑ بڑ یا تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہو بھی تو معمولی سی۔ ہمیں کبھی ایک بھوزے پر عقاب کا شبہ نہیں ہوتا نہ بلی کو کتا سمجھنے کی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ لیکن اولادِ آدم کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ انسان میں نہ جانے کیا کیا دبا ہوا ہوتا ہے کہ ٹھیک پتا ہی نہیں چلتا کہ آدمی ہے کیا۔ عملی طور پر انسان کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

کتا تو بس کتا ہی ہوتا ہے لیکن آدمی میں سے کتا بھی برآمد ہو سکتا ہے اور سور بھی۔ یہ الفاظ ہم عموماً گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے پیچھے ایک گہری دانش بول رہی ہے۔ ہر تہذیب نے اس حکیمانہ نکتے کا اثبات کیا ہے۔ جانوروں کی ہر نسل کے کچھ خواص ہوتے ہیں۔ اس پر کسی ایک یا کئی خصلتوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ جانوروں کے لیے یہ تمام خصلتیں اچھی ہیں کہ ان سے اس کی سرشت و نہاد کا تعین ہوتا ہے لیکن یہی خصلتیں اگر انسان میں نمایاں اور غالب ہو جائیں تو اسکے لیے اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔

کتے میں کئی اوصاف ہوتے ہیں۔ کتا وفادار جانور ہے۔ یہی صفت اگر انسانوں میں ہو تو وفا شعار ہونا اچھی بات شمار ہوگی۔ لیکن کتوں میں حرص، غارت گری اور خباثت بھی بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ جب لوگ باگ کسی کو کتا کہہ کر گالی دیتے ہیں تو اس لمحے ان کے ذہن میں یہی بد طینتی گھوم رہی ہوتی ہے۔ انسانی شخصیت بہت تہ دار ہوتی ہے۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہو تو یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ کیسے کیسے انسان سے سامنا کرنا ہوگا۔ ان میں خدا دوست بھی ہو سکتے ہیں اور انسانی خون کے پیاسے بھی۔ ان میں امتیاز کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کتے کا، شیر کا یا گھونگے کا سامنا ہو تو ہمیں پتا ہوتا ہے کہ اب کیا ہوگا اور کیا کرنا چاہیے۔ معاملہ اولادِ آدم کا ہو تو یقینی طور

پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

## نوعِ انسانی

تو پھر انسان کیا ہے؟ انسانوں اور دیگر حیوانات میں یہ بنیادی فرق کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟ مسلمانوں نے ان سوالات کے جواب کئی انداز میں پیش کیے ہیں۔ ہماری موجودہ بحث کے حوالے سے سب سے سہل بات یہ ہوگی کہ ہم انسان اور صفاتِ خداوندی کے مابین ربط و تعلق کی ماہیت جاننے کی کوشش کریں۔ انسان کے علاوہ ہر مخلوق اللہ کی ایک نشانی ہے جس میں اللہ کی صفات ایک خاص روپ اور ایک محدود اور معین وضع و شکل میں منعکس ہوتی ہیں۔ انسان میں خدا کی طرف ظہور کرتا ہے۔ دوسری مخلوقات میں اللہ کی کچھ صفات ہمیشہ ظاہر ہوتی ہیں اور کچھ صفات مستقل طور پر مخفی رہتی ہیں۔ انسانوں میں سبھی صفاتِ الٰہی موجود ہوتی ہیں اور اگر حالات و مواقع سازگاری کریں تو اپنا ظہور کرتی ہیں۔

رسولِ خداؐ نے انسانوں کی اس انوکھی خصوصیت کا تذکرہ ایک حدیث میں فرمایا ہے۔ یہی موضوع انجیل کے ایک قول کا بھی ہے اور اس قول نے مسیحی اور یہودی فکر میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انسان کیا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے مسیحی اور یہودی حضرات نے کتابِ مقدس کے اس ارشاد کو بنیاد بنایا ہے۔ (God created Adam in His own image) دوسری جانب حدیث کے الفاظ یہ ہیں "خَلَقَ اللہُ آدَمَ عَلٰی صُورَتِہٖ" [۴۴] (اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر خلق فرمایا)۔ بہت سے علماء نے قرآن مجید کی آیت "وَعَلَّمَ آدَمَ الاَسمَآءَ کُلَّھا" (۲:۳۱) (اور سکھائے آدم کو نام سارے) سے بھی یہی معنی مراد لیے ہیں۔

یہاں یہ اہم نکتہ ذہن میں رہے کہ ''آدم'' پہلے انسان کا نام بھی ہے اور اسی لفظ کی توسیع کرتے جایئے تو نوعِ انسانی کے کسی بھی فرد بلکہ ہر انسان کو آدم کہا جا سکتا ہے۔قرآن مجید اور اسلامی روایت میں عام طور پر آدم کا لفظ ''انسان'' کے مترادف اور ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس کا اطلاق مرد زن دونوں پر ہوتا ہے۔مذکر بمقابلہ مونث یا مرد بمقابلہ عورت کے لیے اس کا استعمال خاص نہیں ہے۔ہاں اگر سیاق وسباق میں حوا کا لفظ آ جائے اور فقرے سے واضح ہو کہ آدم کی خصوصیات سے الگ کچھ صفات کا ذکر مقصود ہے تو اور بات ہے۔ورنہ ''آدم وحوا'' کا مطلب ہوتا ہے ''نوعِ انسانی کے سبھی افراد،مرد اور عورتیں''۔آدم وحوا کے تعلق کے بارے میں ہم آگے چل کر وہاں گفتگو کریں گے جہاں باغِ بہشت سے انسان کے نکلنے کا مبحث شروع ہوگا۔

تخلیقِ آدم کا قصہ قرآن میں جس طرح بیان ہوا ہے اس سے فطرتِ انسانی کا پتا چلتا ہے۔انسان کی سرشت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے اس قصے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔قرآن کے دیگر قصوں کی طرح یہ قصہ بھی کسی ایک جگہ یکجا بیان نہیں ہوا ہے۔مختلف سورتوں سے اس کے ٹکڑے جوڑ کر کہانی مکمل کرنا لازمی ٹھہرتا ہے۔قصۂ آدم کے اہم واقعات مختصراً درج ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ زمین پر اپنا نمائندہ یا خلیفہ مقرر کریں۔خلیفہ عربی کا لفظ ہے جس کا مفہوم ہے ''نائب،مختار،قائم مقام،تفویض کردہ اختیارات رکھنے والا''۔اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔عام طور پر تو فرشتے اللہ کا ہر فرمان مکمل تسلیم ورضا سے قبول کرتے ہیں لیکن اس معاملے میں فرشتے قدرے پریشانی کا شکار ہو گئے۔ان کا علم دوسروں سے زیادہ تھا۔اس خلیفہ کے خصائص پر نظر گئی تو

ان میں سے کچھ چیزیں انہیں ناپسند ہوئیں۔فرشتوں نے عرض کیا:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲:۳۰)

کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے؟

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ

مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

فرشتے خواہ کیسی ہی نظر رکھتے ہوں ان کا علم اللہ کی حکمتِ بے نہایت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سنوارا، شکل دی اور اس کے تنِ خاکی میں اپنی روح پھونکی۔ اس کو سب اسماء کا علم دیا گیا۔ پھر آدم کو فرشتوں کے سامنے لایا گیا۔ اللہ کی صناعی کے اس نمونے کو فرشتوں کے سامنے رکھا گیا تو یہ تودۂ خاک ان کو کچھ متاثر نہ کر سکا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرشتوں کا ردِ عمل کیا ہوگا، یہ سب کچھ اللہ کی حکمت اور تدبیر کا حصہ تھا۔ سو اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ساری مخلوق فرشتوں کو دکھائی۔ اس انبوہِ خلق کو دیکھ کر فرشتے دنگ رہ گئے۔ یہاں آ کر فرشتوں کو اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کچھ مستور کر رکھا ہے۔ تب پھر دامِ خداوندی حرکت میں آیا۔ اللہ نے فرشتوں سے فرمایا:

اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲:۳۱)

مجھ کو ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو

فرشتے سراسیمہ رہ گئے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۲:۳۲)

بولے تو سب سے نرالا ہے، ہمیں تو بس اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے سکھا دیا۔

بالفاظِ دیگر ''آپ جانتے ہیں کہ آپ نے ہمیں صرف چند اشیاء کے نام عطا کیے ہیں۔ کائنات کی ساری مخلوقات کے ناموں کا علم ہمیں بھلا کیونکر حاصل ہوگا؟

اللہ تعالیٰ آدم کی طرف متوجہ ہوئے۔ آدم ایک کنارے کھڑے تھے۔ فرمایا:

یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (۲:۳۳)

اے آدم ان کو ان کے نام بتاؤ۔

تب آدم نے ایک ایک کرکے ہر مخلوق کا نام گنوا دیا۔ (مفسرین نے اس پر یوں خامہ فرسائی کی ہے کہ آدم کو کائنات کی ہر شے کا نام رہتی دنیا تک کے لیے، اولادِ آدم کی ہر زبان میں معلوم تھا)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے گویا تنبیہ کے لیے فرمایا:

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲:۳۳)

کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں۔

فرشتے اپنی حیثیت جان چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ سبھی فرشتے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر حکم بجالائے۔ آدم کے

علمِ برتر کو تسلیم کرنا ان کے لیے باعثِ مسرت تھا۔ صرف ابلیس تھا کہ جس نے اللہ کے حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔

اس نوع کے تمام بیانات کے مانند قصۂ آدم کو بھی کئی طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی کی کئی سطحیں ہیں اور اس کا اطلاق انسان کی صورتحال پر کئی طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ مختلف حوالوں سے اس کے کتنے ہی مفاہیم بنتے ہیں۔ ۳۵ ہم چاہیں بھی، کوشش بھی کریں تو بھی اس قصے کی معنی و مفہوم کی تہ کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ مسئلہ زیر بحث کے لحاظ سے قصۂ آدم سے چند سبق ایسے ملتے ہیں جو خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

آدم کو جملہ مخلوقات کے نام عطا ہوئے جبکہ فرشتوں اور دوسرے مخلوقات کو صرف کچھ مخلوقات کے ناموں کا علم دیا گیا تھا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ''اسم'' کا لفظ قرآن مجید کے اہم اصطلاحی الفاظ میں سے ہے کہ قرآن کے سب سے بنیادی موضوعات میں سے ایک یہ ہے کہ 'وَلِلّٰـهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی' (۷:۱۸۰)۔ اللہ کا ہر نام اس کی حقیقت کا عنوان ہے، اس کی حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اللہ کے نام جان لینے کا مطلب ہے اس کی صفات اور اوصاف کا علم حاصل کرنا۔ پس کسی شے کے نام سے اس شے کی حقیقت اور اس کی نہاد و سرشت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بالخصوص جب یہ نام خود اللہ تعالیٰ نے تعلیم کیا ہو۔

یہ بات واضح رہے کہ آدم کو صرف اشیاء کے نام ہی نہیں سکھائے گئے تھے ان کی معنویت بھی بتائی گئی تھی۔ اشیاء کے اسم جان کر آدم نے یہ بھی جان لیا کہ وہ شے کیا ہے اور اس میں کیا خوبی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کہا ''یہ بادام کا درخت ہے'' تو آدم نے یقین سے یہ جان لیا کہ اس درخت کو بادام کا پھل لگتا ہے، بادام کھانے

میں مزیدار ہوتے ہیں اوران سے روغن بادام نکلتا ہے جو بہت سے صحت بخش خواص رکھتا ہے۔جب اللہ تعالی نے کہا ''مگر مچھ''تو آدم مگر مچھ کی ماہیت تک پہنچ گیا (اور کبھی مگر مچھ کے ساتھ پانی میں اترنے کی غلطی نہیں کرنے کا)

آدم کو اسمائے اشیاء کا علم دیکر اللہ تعالی نے اسے موسوم کی جانے والی اشیاء پر قدرت عطا کردی۔آج بھی نسل بانسل کے بعد جب لفظ ومعنی پر کتنے پردے پڑ چکے ہیں اور سبھی کچھ دھندلا ہو چکا ہے،علمِ اسماء کے ذریعے قدرت وغلبہ کسی حد تک ہنوز باقی ہے۔ذہن میں یا زبان سے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''یہ ایک درخت ہے''تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم اسے کاٹ سکتے ہیں اوراس کا ایندھن بنا سکتے ہیں۔اسم کو جاننا ،اسم کی حقیقت کا،ماہیت کا جاننا ہے اوراس علم کے بغیر ہم نہ صرف اشیاء کو تصرف میں لاسکتے ہیں نہ ان پر قابو پا سکتے ہیں۔علم قوت ہے،قدرت دیتا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

قصۂ آدم اس بات کا کنایہ ہے کہ خلقِ خدا پر آدم کو جو قدرت ملنا تھی وہ شروع ہی سے ایک نزاع کی صورت لیے ہوئے تھی۔اللہ تعالی نے فرمایا تھا کہ وہ زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کریں گے۔خلیفہ وہ ہے جسے اختیار دیا گیا ہو اور جو کسی کے قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کرنے کے وسائل رکھتا ہو۔اللہ تعالی نے جب آدم کو اشیاء کے نام سکھائے تو گویا اسے اپنی قدرت میں سے ایک حصہ عطا کردیا۔

اللہ تعالی کے علم اوراس کی قدرت میں جو تعلق ہے وہ اہم ہے۔اس کا براہ راست تعلق اللہ تعالی کی صفات سے ہے اوران کے بارے میں ہمارے علم سے۔وہ ہر شئے کو جانتا ہے،ان کو بھی جو ابھی خلق نہیں کی گئیں۔اپنے علم سے وہ اشیاء کو تقدیر کے پیمانے کے مطابق مقرر کرتا ہے۔ائمہ سبعہ (سات اماموں) کی فہرست یعنی

سات بنیادی صفاتِ خداوندی میں علم دوسرے درجے پر آتا ہے۔ سب سے پہلے حیات یا زندگی۔ مردہ چیز صاحبِ علم نہیں ہو سکتی۔ پھر ہر شے کا علم رکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ صاحبِ ارادہ بھی ہیں اور اس شے کو عالمِ ہستی میں ایک خاص وقت اور خاص جگہ پر وجود دینے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اپنے ارادے کے مطابق وہ اپنی قدرت کو عمل میں لاتے ہیں۔ قدرت کو کارفرما کرنا بلا ارادہ نہیں ہوتا۔ اس کا ایک محرک ہوتا ہے۔ یہ ہو تو اللہ تعالیٰ امر فرماتے ہیں۔ وہ شے سے کہتے ہیں مثلاً ''کن'' (ہو جا) اور وہ موجود ہو جاتی ہے۔ انسان بھی اس انداز میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں بھی زندگی پائی جاتی ہے لہٰذا وہ علم رکھتا ہے۔ جب وہ ایک شے کو جان لیتا ہے تو پھر وہ اپنا اور اس شے کا تعلق کسی ڈھب سے تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اس شے کو دور کرنا چاہتا ہے یا نزدیک لانا چاہتا ہے۔ اس ارادے کی بنیاد پر وہ اپنی قوت کو استعمال کرتا ہے۔

دوسری ذی حیات مخلوقات بھی علم رکھتی ہیں اور اس علم کی بنیاد پر عمل کرتی ہیں۔ لیکن ان مخلوقات کو صرف چند اسماء کا علم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا علم خلقی طور پر ان کے گرد و پیش کی چند چیزوں تک محدود ہوتا ہے۔ وہ لگے بندھے انداز میں چند مخصوص اور محدود اغراض کے لیے کام کرتی ہیں۔ فرشتے جو کائنات کی سب سے نورانی مخلوق اور اللہ سے سب سے زیادہ قرب رکھنے والے ہیں انہیں بھی چند مخصوص اشیا کے ناموں کا علم حاصل ہے۔ اسی لیے جب انہوں نے دیکھ لیا کہ آدم سب اشیاء کے نام جانتا ہے تو انہوں نے بخوشی اس کی فضیلت کو تسلیم کر لیا۔

انسان کو مخلوقات پر جو قدرت حاصل ہے اس کا قرآن میں کئی جگہ ذکر آیا ہے اور ان مقامات کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے یہ معاملہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ آخر یہ

انسان ہی تو تھا جسے سب مخلوقات میں اللہ کے نائب اور خلیفہ بننے کے لیے خلق کیا گیا تھا۔ سب مخلوقات میں سے صرف اسی کو تمام اسمائے الٰہی سکھائے گئے اور صرف انسان ہی صورتِ خداوندی پر تخلیق کیا گیا۔ پس کائنات کی ہر شے اسی لیے ہے کہ انسان اس پر حکمرانی کرے۔ انسان کی اس قدرت کی طرف قرآن نے بسا اوقات دیگر مخلوقات کی محکومی کی طرف اشارہ کرکے بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور یہ محکومی اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے:

اَلَم تَرَوا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُم مَّا فِی الاَرضِ (۲۲:۶۵)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے زمین کا سب کچھ تمہارے بس میں کر دیا ہے۔

اَلَم تَرَوا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُم مَّا فِی السَّمٰوٰت وَمَا فِی الاَرضِ (۳۱:۲۰)

تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ والاَرضَ وَاَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزقًا لَّکُم وَسَخَّرَ لَکُمُ الفُلکَ لِتَجرِیَ فِی البَحرِ بِاَمرِہٖ وَسَخَّرَ لَکُمُ الاَنہٰرَ ۔ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمسَ وَالقَمَرَ دَآئِبَینِ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیلَ وَ النَّھَارَ ۔ وَاٰتٰکُم مِّن کُلِّ مَا سَاَلتُمُوہُ وَ اِن تَعُدُّوا نِعمَتَ اللّٰہِ لَا تُحصُوھَا اِنَّ الاِنسَانَ لَظَلُومٌ کَفَّارٌ (۱۴:۳۲-۳۴)

اللہ ہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور بادلوں سے پانی اتارا، پھر

اس سے مختلف طرح کے پھل تمہارے رزق کے لیے پیدا کیے اور کشتی تمہارے کام میں لگائی کہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو بھی تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا۔ اور سورج چاند تمہارے کام میں لگائے ایک دستور لیے ہوئے۔ اور دن اور رات کو بھی تمہارے کام میں لگا دیا اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگی۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو شمار نہ کر پاؤ گے۔ بے شک آدمی بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

مسلمانوں میں جب یونانی فکریات اور فلسفیانہ تحریریں متعارف ہوئیں تو انہوں نے عالمِ صغیر microcosm اور عالمِ کبیر macrocosm کی اصطلاحات وہاں سے مستعار لے لیں۔ ان سے مقصود یہ تھا کہ انسان اور باقی کائنات کے باہمی تعلق کو ایک طرح بیان کیا جا سکے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سبھی کچھ موجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر شے کے نام کا یا اس کی حقیقت کا علم عطا کیا ہے۔ ایک شے کا مکمل، پورا اور جامع فہم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نفسِ انسانی میں اس شے کی حقیقت موجود ہو۔ افلاطون کے ذہن میں کچھ ایسی ہی بات رہی ہوگی جب اس نے کہا تھا کہ حصولِ فہم یا علم حاصل کرنے کا سارا عمل اس چیز کی یاد آوری سے واقع ہوتا ہے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ ہم اشیاء کو تبھی جان سکتے ہیں جب ہمیں ان سے ایک طرح کی عینیت میسر ہو۔ روزمرہ گفتگو کا چلتا ہوا فقرہ It takes one to know one اپنے دامن میں ایک گہری حکمت اور پتے کی بات سمیٹے ہوئے ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سبھی کچھ موجود ہے تو اس کو لفظی معنی میں نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس میں جو اصول کارفرما ہے اس کا سمجھنا آسان ہو جائے گا اگر

ہم اسمائے الٰہی کی بحث پر دوبارہ نظر ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنی نشانیوں کے مجموعے کے طور پر تخلیق کیا ہے۔ ان نشانیوں اور آیات سے فطرتِ خداوندی میں اسی حد تک علم ہوتا ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ اسے کھولنا چاہتے ہیں۔ اس کا انکشاف کس حد تک ہوتا ہے؟ وہ اپنی صفات ظاہر کرتے ہیں جیسے، حیات، علم، قدرت اور کلام۔ ان سب صفات کے مل کر عمل کرنے سے خلق کردہ اشیاء کی ایک لامحدود رنگا رنگی اور کثرت جنم لیتی ہے لیکن تمام اشیاء انہی صفات کے آثار اور نشانیاں ہیں جو اصل میں "الحق" کی صفات ہیں۔ کائنات اپنے سارے زمانی اور مکانی پھیلاؤ میں، یعنی غیرِ خدا ہر شے میں اللہ کی صفات کا ظہور ہے۔ کائنات اللہ کی ظاہر صفات کی صورت گری ہے۔ اسی لیے کائنات اللہ کا پرتو ہے، تمثال ہے، اسی کا عکس اور شبیہ ہے۔

انسان کو بھی صورت خداوندی پر خلق کیا گیا، اس میں بھی سبھی صفاتِ خداوندی سمٹ آئی ہیں۔ انسان اور اس تمام کائنات میں فرق یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کی نشانیاں اور آثار بے تحاشا بکھرے ہوئے ہیں جبکہ ہر فردِ انسانی میں اللہ کی نشانیاں ایک نکتۂ واحد پر پوری شدت سے مرکوز ہوگئی ہیں۔

انسان میں صفاتِ خداوندی کا ارتکاز ہی اسے خلیفۃ اللہ بناتا ہے یعنی وہ مخلوق جو وہی کرسکتی ہے جو کارِ خدائی ہے۔ "تنزیہ" کا فرق البتہ ہمیشہ ملحوظ رہے گا۔ انسان میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات جلوہ فرما ہیں لیکن ایک کمزور اور مدھم انداز میں۔ یہ دھندلاہٹ اور ضعف اس لیے ہے کہ اگرچہ انسان میں یہ صفاتِ خدا سے مشابہ ہیں اور صورتِ خداوندی پر خلق ہوئی ہیں تاہم زمان و مکان کی قید میں آ کر محدود ہوگئی ہیں۔ خدا خدا ہے، انسانِ خاکی سے ماوراء، بے نہایت و بے پایاں۔

خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے انسان کو اپنی رعایا پر ایک قدرت حاصل ہے کہ اللہ کے نائب کے طور پر ان پر حکومت کر سکے۔ کائنات کی مخلوقات انسان کی رعایا ہے۔ اسی سے یہ سراغ ملتا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسان اس دھرتی کی حفاظت بھی کر سکتا ہے اور اسے تاخت و تاراج بھی کر سکتا ہے۔ عہدِ جدید میں جتنے سماجی اور ماحولیاتی بحران نمودار ہوئے ہیں وہ اسی اختیار، اللہ کی خلافت اور قائم مقامی کے بے محابا غلط استعمال نے پیدا کیے ہیں۔

## عبد اور خلیفۃ اللہ

ہم نے ذکر کیا تھا کہ بنیادی طور پر اسلام دو قسم کا ہے: وہ بندگی اور تسلیم و حوالگی (اسلام) جو عالمِ خلق کی ہر شے کو کرنا پڑتی ہے اور وہ اختیاری بندگی جو ان لوگوں کا خاصہ ہے جنہوں نے انبیاء کی پیروی کا راستہ اپنایا۔ اسی طرح خلافت کی بھی دو بنیادی اقسام ہیں، ایک وہ جو ہر انسان کی حاصل ہے اور دوسری وہ جو صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جنہوں نے اپنی مرضی سے اللہ کی بندگی اختیار کی۔

انسان میں ایک تو وہ فطری اور خَلقی خلافت ہے جو اللہ کی قوتِ تخلیق کے سامنے جھک جانے اور اسے قبول کر کے عالمِ ہست و بود میں موجود ہو جانے سے میسر آتی ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا ہے اور انسان دنیا میں اس کی صفات کا مظہر ہے۔ اس کو تمام اسماء سکھائے گئے سوا سے تمام اشیاء پر قدرت حاصل ہے۔ موٗخر الذکر نوع کی خلافت صرف انہی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنی مرضی سے اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔

چونکہ انسان آزادیٔ اختیار رکھتا ہے لہٰذا وہ اپنی خَلقی خلافت کا آسانی سے غلط

اور بے محل استعمال کر گزرتا ہے۔ یہ آزادیٔ اختیار اگر راہِ خدا کے انتخاب میں صرف ہو، انبیاء کی لائی ہوئی ہدایت پر عمل کر کے منشائے خداوندی کو مان لینے میں ظاہر ہو تو انسان فی الواقع اس دنیا میں اللہ کا سچا خلیفہ بنتا ہے۔ کسی کی نمائندگی کرنا ہو تو اس کے احکامات اور ہدایات کے مطابق چلنا تو ہوگا۔

محض احکامِ خداوندی پر عمل کرنا خلیفۃ اللہ بننے کے لیے کافی نہیں۔ ''اسلام'' کے کائناتی مفہوم میں تو ہر مخلوق اللہ کے فرمان پر چل رہی ہے۔ پھوے، بھنتے، بچھو اور چوہے تک اللہ کے اتنے ہی فرمانبردار ہیں جتنا کوئی اور۔ وہ بھی اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن خلافت ایک ایسا وصف ہے جو انسان سے خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس دنیا میں اسی لیے رکھا ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ بنے۔ (قرآن ۲:۳۰) سو خلافت کا تعلق ان ہدایات و احکام سے ہوا جو صرف انسان کو دیئے گئے ہیں (جنات کا معاملہ جداگانہ ہو سکتا ہے لیکن سر دست ہم انہیں دائرۂ بحث سے الگ رکھیں گے) یہ احکام و ہدایات وہ ہیں جو انبیاء اور رسولوں کے لائے ہوئے پیغام میں موجود ہیں۔ انبیاء کے پیغام کے روبرو انسان کے کرنے کا اصلی کام یہ ہے کہ ''اسلام'' لائے بایں معنیٰ کہ نبی کے پیامِ ہدایت کو قبول کر کے اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے یا اسلام لائے بہ ایں معنیٰ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغامِ ہدایت کا اتباع اور پیروی کرے۔

صاف اور سیدھی بات ہے کہ اللہ کے فرمان اور اس کی ہدایات پر چلنا خاصا جوکھم کا کام ہے۔ اگر یہ ایسا ہی آسان ہوتا تو نہ سیدنا آدمؑ سے لغزش سرزد ہوتی نہ اولادِ آدم ان سب مسائل کا سامنا کرتی جس سے آج نسلِ آدم دوچار ہے۔ اس کارِ دشوار میں کامیاب رہنے والوں کو سرخرو ہونے پر اسلام نے بہت اعلیٰ درجات

دیئے ہیں۔عموماً ایسے شخص کو"عبد"(بندۂ خدا) کا نام دیا گیا ہے اور بندگی یا عبدیت کو انسان کا اعلیٰ ترین اور سب سے زیادہ قابلِ تحسین مرتبہ قرار دیا گیا ہے۔ایک اعتبار سے یہ مرتبہ خلافت اور نبوت سے بھی بلند تر ہے کیونکہ اللہ کا نمائندہ ہو یا اللہ کا نبی وہ بندۂ خدا پہلے ہوگا تبھی خلافت یا نبوت پائے گا۔مسلمانوں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ کثرت سے جس لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے ہر فرض نماز میں بھی پڑھا جاتا ہے وہ ہے "عبدہ ورسولہ"(اس کا بندہ،اس کا رسول) یہ محض اتفاقی ترتیب نہیں ہے کہ"عبد"پہلے ہے اور"رسول"بعد میں۔

"عبد" کا لفظ اسلام کی اہم ترین اصطلاحات میں سے ایک ہے سو اس کے معنی ومفہوم اور اس کے مدلولات پر غور کرنا لازم ہے۔اس لفظ سے عام طور پر مراد ہوتی ہے غلام یا خدمتگار۔ بہت سے لوگ یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے سے جس نوع کی مطلق اطاعت اور فرمانبرداری کا مطالبہ کیا ہے اس کے پیش نظر اس اصطلاح کا ترجمہ غلام (slave) کے لفظ سے کرنا بہتر ہے بہ نسبت servant کے۔تاہم آزادی سچے بندگانِ خدا کا ایک اہم وصف ہے۔اگر یہ لفظ صرف اسی معنی میں برتا گیا ہوتا جو قرآن کے قبل ازیں مذکور آیت میں مراد تھے تب تو "غلام slave" ایک موزوں ترجمہ ہوسکتا تھا۔آیت یہ تھی:

اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا(۹۳:۱۹)

کوئی نہیں آسمان وزمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہوکر۔

معنی مذکور کے مطابق "عبد" ہونا ایک اضطراری بات ہے،اس میں انسان کے اختیار کی کوئی چیز نہیں۔یہ کائناتی مفہوم میں "مسلم" ہونے کے ہم معنی ہے۔پس

وسیع ترین مفہوم میں ہر شے اللہ کا ''عبد'' ہے اس کا ''غلام'' ہے جو اللہ کے کارِ تخلیق کو سر انجام دے رہا ہے۔ لیکن ہم اس وقت جس نکتے پر غور کر رہے ہیں وہ اس لفظ کے محدود معنی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس معنی میں انسان اللہ کا ''بندہ'' (عبد) بننے کو قبول بھی کر سکتا ہے اور اس سے انکار بھی کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کا بندہ بننے کا مطلب ہے اس کا حکم بجالانا۔ اس کا حکم کیا ہے۔ وہ جو اللہ کے صحیفوں اور انبیاء کی کہی ہوئی باتوں میں موجود ہے۔ سو اللہ کا بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی مرضی و اختیار سے حکمِ خداوندی کو مان کر سر تسلیم خم کر دے، ''مسلم'' ہو جائے۔ ''اسلام'' لے آئے۔

بندۂ خدا، خدا کی بندگی کرتا ہے۔ عربی میں اس کے لیے لفظ ہے ''عبادت''۔ لغات میں اس کے معانی ہیں ''پرستش کرنا، خدمت و چاکری کرنا، فرمانبرداری کرنا، عقیدت و محبت، سرافگندگی، اطاعت، جوانگی''۔ اسلام کی اصطلاحی زبان میں ''عبادت'' کے لفظ سے مراد ہوتا ہے وہ تمام فرض، واجب یا مندوب مراسمِ مذہبی اور معمولات جو مسلمان انجام دیتے ہیں۔ پس اسلام کے پانچ ارکان سب عبادات ہیں۔ ان کا ترجمہ ''اعمالِ عبودیت'' کے لفظ سے کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کا ''عبد'' ہونے کا مطلب ہے ارکانِ خمسہ اور شریعت کے دیگر احکام کی پابندی، نیز سنتِ رسول کی پیروی جس میں بہت سی مندوب عبادات شامل ہیں۔

اور ہر شخص سے بڑھ کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے (عبداللہ) ہیں۔ قرآن مجید نے خود یہ لقب آپ کو دیا ہے:

وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا

(۷۲:۱۹)

اور جب اللہ کا بندہ صرف اللہ ہی کو کھڑا پکار رہا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پر پل پڑیں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن میں حضرت عیسٰی ؑ کا قول یوں آیا ہے:

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (۱۹:۳۰)

میں بندہ ہوں اللہ کا، اس نے مجھ کو کتاب دی اور مجھ کو نبی کیا۔

اس لیے مسلمانوں کی نظر میں سیدنا عیسیٰ بھی اللہ کے کامل بندے ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن میں مذکور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عیسی ؑ کا لقب ''عبداللہ'' وہ نام ہے جو اسلامی دنیا میں مردانہ ناموں میں سب سے زیادہ رکھا جاتا ہے۔ ہر شخص کے حلقۂ شناسائی میں کوئی نہ کوئی آدمی عبداللہ (بندۂ خدا) کے نام کا ضرور ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اسمائے معرفہ کے عمومی چلن کے مطابق اس نام سے بھی والدین کی بڑی اُمیدیں اور عظیم تمنائیں جھلکتی ہیں۔ بچے اپنے نام کے مطابق زندگی بسر کریں، اسم بامسمّی ہوں۔ اس امید میں سب سے زیادہ جو نام رکھے جاتے ہیں وہ انبیاء کے نام ہوتے ہیں بالخصوص سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر۔ بچوں کا نام رکھنے کا ایک اور انداز یہ بھی ہے کہ ''عبداللہ'' کے نمونے پر نام رکھے جاتے ہیں لیکن اس میں ''اللہ'' کی جگہ دیگر اسمائے الٰہی شامل کر دیئے جاتے ہیں مثلا ''عبدالحی'' (الحیّ کا بندہ) ''عبدالعلیم'' (العلیم کا بندہ) ''عبدالقدیر'' (القدیر کا بندہ) ''عبدالخالق'' (الخالق کا بندہ) وغیرہ۔ اس میں امید یہ وابستہ ہوتی ہے کہ شخصِ موسوم اس اسمِ الٰہی سے برکت حاصل کرے گا۔

عبادت کا تصور اسلام کی تیسری جہت میں ایک کلیدی تصور کی حیثیت رکھتا ہے، اس جہت کی تعریف رسولِ خدا نے یوں فرمائی تھی کہ "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو"۔ لہٰذا ہم اس لفظ کے مضمرات اور مفاہیم پر گفتگو کتاب کے تیسرے حصے تک کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آدمؑ کو اللہ نے خلیفہ بنانے کے لیے تخلیق کیا۔ لیکن خلیفۃ اللہ بننے کے لیے آدم کو پہلے بندۂ خدا بننا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کو روئے ارض پر اللہ کی نمائندگی کرنے کی غرض سے خلق کیا گیا۔ اس منصب کو نبھانے کے لیے، اس کا حق ادا کرنے کے لیے انسان کو لازم ہے کہ انبیاء کے وسیلے سے معلوم ہونے والی منشائے ایزدی کے سامنے سرِ خم کر دے۔ انسان پہلے بندۂ خدا بنے گا تو اسے خدا کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہوگا۔ اللہ کا بندہ بننے سے پہلے انسان صرف اپنی اغراض اور خواہشات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ حکمتِ ایزدی کی رہنمائی کے بغیر انسان کی نظر ساری کائنات کے مفاد تک وسیع نہیں ہو سکتی اور اس کے نتیجے میں جو وہ کرتا ہے اس کا ضرر ان سب مخلوقات تک پھیلتا ہے جو اس کے زیرِ تسلط ہوتی ہیں اور جن پر اسے خلافتِ ارضی کا اختیار نافذ کرنا ہوتا ہے۔ نیز اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان صرف اپنی جودتِ طبع اور اپنے نورِ بصیرت کے سہارے سماجی اور ماحولیاتی مسائل کیوں حل نہیں کر سکتا۔ انسان کی نگاہ ماہیتِ اشیاء پر نہیں ہوتی، اس کی نظر اتنی وسعت نہیں رکھتی کہ حقیقت تک پہنچے۔ وہ حقیقت سے کٹی رہتی ہے اور "الحق" سے منقطع۔

خلافت سے پہلے عبودیت (بندگی) ہونا چاہیے۔ آپ کسی ایسے شخص کی نمائندگی نہیں کر سکتے جس کے احکامات پر آپ خود عمل پیرا و کاربند نہ ہوں۔ بادشاہ کسی اجنبی کو اپنا سفیر بنا کر روانہ نہیں کرتے۔ سفیر کا منصب وہی پاتا ہے جسے شاہِ

وقت نے آزما کر دیکھ لیا ہو اور جس کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

## شہنشاہِ مہربان

عبد اور خلیفہ کے درمیان تعلق کے مضمرات کیا ہیں۔ انہیں سمجھنا ہو تو ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' پر پھر غور کرنا مفید ہوگا۔ صفاتِ تنزیہ کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے مشابہ نہ ہو، دور اور ماوراء ہو، کسی کی رسائی میں نہ ہو۔ ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ اسمائے الٰہیہ میں سے ''المَلِک'' (بادشاہ) کا نام ایسا ہے جس میں ''تنزیہ'' پر زور دینے والے اسمائے خداوندی کے مضمرات و مفاہیم کا ایک نسبتاً زیادہ محسوس concrete نقشہ یکجا ہو کر ابھرتا ہے۔ بادشاہ اپنی رعایا پر مکمل اقتدار رکھتا ہے۔ فی الواقع اس کی رعایا اس کے غلاموں کی حیثیت رکھتی ہے۔ بادشاہ زورآور اور طاقتور ہے، اس کا رعب اور دبدبہ، جلالِ شاہی کی ہیبت دور دور تک ہے۔ شکوہِ سلطانی سے لوگ سہمے رہتے ہیں۔ اس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ رہی اس کی رعایا، سو رعیت بے چاری از حد خوار و زبوں حال۔

اب فرض کیجیے کہ یہ بادشاہ سچا بادشاہ ہے اور اپنے منصب کا اہل ہے۔ اس صورت میں بادشاہت پر جو ایک تہمت لگی ہوئی ہے وہ قدرے کم ہو جائے گی۔ مزید یہ فرض کیجیے کہ یہ شاہِ زمان خدائے رحمان و رحیم ہے کہ جس کے سوا اور کوئی حق ہے ہی نہیں۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں لوگ باگ اصل میں اللہ کے بندے اور غلام ہیں کہ حکمراں ہے اک وہی باقی سب موہوم۔ نوعِ انسان اصل میں ''مسلم'' ہے خواہ اسے یہ گوارا ہو یا ناپسند۔ تو پھر وہ اس صورتِ واقعہ کو قبول کر کے، سرِ تسلیم خم کر کے اپنے جوہرِ طبع کو اس طرف مائل کیوں نہ کریں کہ اپنی جائز حدود سے تجاوز نہ کریں؟

یہ اسلامِ اختیاری ہے، انبیاء کے پیام پر لبیک کہنا اور ان کی ہدایت پر عمل کرنا۔ لوگ خوشی سے، اپنی مرضی سے اللہ کا بندہ بننا قبول کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عبودیت سے متعلق صفات کی قریبی نسبت ''تنزیہ'' سے ہے یا دوسرے لفظوں میں اللہ کی صفاتِ جلال قہر اور بُعد سے۔ اس کے برعکس خلافت کی بحث انسان اور خدا کے تعلق پر ''تشبیہ'' کے حوالے سے نظر کرتی ہے اور اسی پہلو سے جائزہ لیتی ہے۔

اللہ کا خلیفہ اس کا نمائندہ ہوتا ہے۔ چونکہ اسے اللہ کی نمائندگی کرنا ہوتی ہے لہٰذا اسے اس کام کے لیے اللہ کے طرف سے منتخب کیا جاتا ہے۔ بادشاہ کو سفیر بنانا ہو تو وہ کوچہ و بازار میں سرگرداں انبوہِ مردم میں سے گرے پڑے لوگوں کو اٹھا کر سفارت کی ذمہ داری نہیں سونپ دیتا۔ سفیر کے منصب کے لیے وہی منتخب ہوتے ہیں جو خود کو سالہا سال تک دربار میں خدمت کے لیے وقف کیے رہے ہوں اور اپنی اہلیت کا لوہا منوا چکے ہوں۔

بندہ یا عبد ہونا کوئی ایک بار کی چیز نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا کہ انسان آج سرکش اور خدا کا منکر، حق چھپانے والا ہو اور کل ایک بندۂ اخلاص اور عبدِ خالص۔ غلط کاری اور باطل کی گم راہی سے حق کی پیروی تک کا سفر، یہ تبدیلی ایک طویل اور درجہ بدرجہ طے ہونے والا عمل ہے۔ یہاں ہم پھر دربارِ شاہی کی تمثیل کے ذریعے بات واضح کرنے کی کوشش کریں گے (اگرچہ واشنگٹن کی بیوروکریسی کی مثال بھی بامعنی ہو سکتی ہے) لوگ بادشاہ کی ملازمت کا آغاز نچلے درجے کے کسی شاہی منصب دار کے عملے میں شامل ہو کر کرتے ہیں۔ خود اس منصب دار نے عمر بھر میں بادشاہ کو ایک بار بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ روابط اور دربار میں رسوخ کی ڈوریاں کیسے ہلائی جاتی ہیں یہ سمجھنے

میں وقت لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ انہیں یہ فن آ جاتا ہے کہ ملازمت، خدمت اور سیاست میں آگے بڑھنے کی راہیں کیسے طے کی جاتی ہیں۔ بہت کم لوگ شاہی ملازمت کے نظام میں ترقی کرتے کرتے اپنی محنت سے دربار کے مقبول لوگوں میں شامل ہو پاتے ہیں۔ وزیرِاعظم ہی وہ واحد شخص ہوتا ہے جو بادشاہ تک ہمہ وقت رسائی رکھتا ہے۔ یہی نظامِ اشیاء کی اس تمثیل میں بھی مضمر ہے جو ''تنزیہ'' کو ظاہر کرنے کے لیے عموماً استعمال کی جاتی ہے۔ بندے سے مکمل خلیفۃ اللہ بننے کی تبدیلی ایک طویل عمل ہوتا ہے۔ ہر مقررہ مرحلے پر اس راہ کے مسافر کو کچھ حقوق اور اختیارات میسر آتے ہیں جو اس کی عبدیت اور بندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہ سب سے مشکل کام انہی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں جو اللہ کے سب سے اچھے بندے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ بندگی کے ابتدائی مراحل نسبتاً آسان ہوتے ہیں اور خلافت کی ذمہ داریوں میں سے بھی بہت کم حصہ ان مراحل میں سامنے آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر ''مسلم'' کسی نہ کسی درجے میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ رسولِ خدا نے فرمایا تھا:[۳۶]

تم میں سے ہر شخص گلہ بان ہے اور تم میں سے ہر ایک پر اس گلّے کی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کی رہنمائی کرنے والا (امام) بھی گلہ بان ہوتا ہے اور اسے اپنے گلّے کے لیے جوابدہ ہونا ہوگا۔ فرد اپنے اہل خانہ کے لیے گڈریے کی طرح ہے اور اس کا گلہ اس کی ذمہ داری ہے۔ خاتون خانہ اپنے شوہر کے گھر در اور اولاد کی گلہ بان ہے اور اس کے لیے جوابدہ ہے۔ خادم اپنے مالک کے مال کا رکھوالا ہے اور اس کے لیے جوابدہ ہے۔ بے شک تم میں سے ہر ایک گلہ بان ہے اور تم میں سے ہر ایک پر اس کے گلّے کی ذمہ داری ہے۔

راہِ عبدیت میں انسان جتنا سفر کرتا ہے اس کی ذمہ داری بڑھتی جاتی ہے۔ جب رسولِ خدا نے فرمایا کہ ''نکاح آدھے دین کے برابر ہے'' تو آپ کا اشارہ ان ذمہ داریوں کی جانب تھا جو اس نئے رشتے کے قائم ہونے سے شوہر اور بیوی پر عائد ہوتی ہیں۔ اس وقت تک وہ اللہ کے بندے تھے۔ نکاح کے ساتھ سماجی معاملات سے متعلق فرائض کا ایک پورا سلسلہ ان کی بندگی اور منصبِ عبودیت کے جزو کے طور پر بڑھا دیا جاتا ہے۔ شادی سے قبل ان کو صرف اپنی ذات پر نظر رکھنا ہوتی تھی یا اپنے والدین کی ذمہ داری ادا کرنا مطلوب تھی۔ اب ان کو شریکِ حیات، اس کے خاندان، کنبے کے لوگ اور اولاد وغیرہ سبھی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا درکار ہوگا۔ خلافت کا سب سے اونچا درجہ جس میں اللہ کے قائم مقام کے طور پر ساری کائنات پر حکمرانی کی ذمہ داری شامل ہوتی ہے، صرف ان بندگانِ خدا سے مخصوص ہے جو اس کے کامل ترین بندے ہوتے ہیں۔ اسی لیے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانِ کامل کہا جاتا ہے، اللہ کا سب اعلیٰ و برتر خلیفہ اور اس کا سب سے عظیم بندہ۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کے بارے میں دو نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں: قرب کا اور بُعد کا، غیاب کا اور حضور کا، ''تنزیہ'' کا اور ''تشبیہ'' کا۔ انسان کی اللہ تعالیٰ سے جو دوہری نسبت ہے اس منصب کے حوالے سے انسان کے دو بنیادی کردار ہیں، اللہ کا بندہ اور خلیفۃ اللہ۔ قرب کا تعلق خلافت سے ہے۔ خلیفہ ہونے کے لیے ضروری ہے پہلے انسان اپنی بندگی کو تسلیم کرے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرے۔ اللہ رحمان ہے۔ اس صاحبِ رحمت کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ انسان اس سے دوری میں نہ پڑا رہے، اس کا قرب حاصل کرے لیکن یہ اس قرب کا انتخاب اسے اپنے ارادے اور مرضی سے کرنا ہوگا۔ اس آزادیٔ اختیار کا راستہ یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کی

جائے، وہ کھلا اور صاف راستہ جو آبِ حیات تک لے جاتا ہے۔

## مراتبِ تخلیق

''تنزیہ'' کے لحاظ دیکھیے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی حقیقی اور دائمی ہے، اس کے سوا ہر شے بے حقیقت اور مٹ جانے والی۔ ''تشبیہ'' کے نقطہ نظر سے تمام اشیاء میں بھی کسی حد تک حقیقت ہے تاہم کچھ اشیاء زیادہ حقیقی ہیں کچھ کم تر۔ حقیقی ہونے کا مطلب ہے خدا کی حقیقت سے بہرہ یاب ہونا یا اس سے قریب تر ہونا۔ یہاں قرب اور بُعد، نزدیک و دور کو فاصلے اور مکانیت کے معنی میں نہ لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ مکانی in space نہیں ہے۔ اسی طرح فرشتے اور انسانی ارواح بھی کسی ''جگہ'' نہیں ہیں، مکانی نہیں ہیں۔ ہماری مراد کیفیت اور نوعیت میں نزدیک ہونا ہے۔ کیفیاتی قرب کے لحاظ سے ہی ہم نے کہا تھا کہ آسمان زمین کے مقابلے میں اللہ سے نزدیک تر ہے کیونکہ آسمان نورانی ہے اور زمین خاکدانِ تیرہ۔ اسی طرح آب و گِل کے مقابلے میں فرشتے اللہ سے نزدیک تر ہیں اور روح بدن کے مقابلے میں اللہ سے قریب ہے۔ آگ اور نفسِ انسانی کے قبیل کے حقائق چونکہ ایک گونہ مبہم سرشت رکھتے ہیں لہٰذا ان کا احتیاط سے جائزہ لینا ہوگا قبل ازیں کہ ان کے مقام کے بارے میں کوئی رائے دی جائے۔

ہم یہ بھی عرض کر چکے کہ انسان ایک نظامِ مراتب کی چوٹی پر موجود ہے۔ اس نظام میں بے جان جمادات سے لے کر درجہ بہ درجہ سبھی مخلوقات موجود ہیں۔ جمادات، نباتات اور حیوانات کے مقابلے میں انسان کے اندر صفاتِ خداوندی زیادہ قوت سے ظاہر ہوتی ہیں، ان میں صرف شدت ہی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان میں سبھی صفاتِ خداوندی موجود ہیں جبکہ دیگر مخلوقات میں اکثر صفات

مفقود ہوتی ہیں۔

فرشتے نورانی ہیں اور انسان، بہ نظر ظاہر، تاریک۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ فرشتے نوعِ انسانی سے افضل ہیں۔ مسلمان علماء نے اس نکتے سے بہت بحث کی ہے اور اختلافِ رائے بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ عموماً اس سلسلے میں ہوا یہ ہے کہ جس معیار اور پیمانے پر مدارِ فضیلت رکھا جارہا ہوتا ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔ انسان اور فرشتے کی فضیلت کو اگر دو جدا جدا پیمانوں سے طے کریں تو جواب لامحالہ مختلف ہو گا۔ مسئلے میں ایک اور پیچیدگی بھی ہے، انسان کتنی ہی طرح کے ہوتے ہیں اور فرشتوں کی بھی بہت سی مختلف اقسام ہیں۔ دراصل ہر انسان صفاتِ خداوندی کے ایک نرالے امتزاج کا نمائندہ ہوتا ہے، چنانچہ اس کی مشابہت حیوانات کی نوع میں سے کسی ایک سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ یہ جانور بھی صفاتِ خداوندی کے ایک خاص امتزاج کا نمائندہ ہوتا ہے۔

فرشتوں کی طرح انسان کو بھی کئی اصناف اور اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔ عام طور پر انسانوں کی پانچ بڑی اقسام بتائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہونے کے اعتبار سے بالترتیب ان کی فہرست یوں ہے: منکرینِ حق Truth conealers، مومنین، خدا دوست (اولیاء اللہ) انبیاء اور رسول۔

منکرینِ حق خدا کے بندے تو ہیں مگر اضطراری طور پر جبکہ مومنین اپنی خوشی اور رضا سے اللہ کی بندگی کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن مومن کو سچا خلیفۃ اللہ بننے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کے خلفاء کا تعلق موخرالذکر تین درجات سے ہوتا ہے یعنی خدا دوست، انبیاء اور رسول۔ جب مسلمان علماء میں سے کچھ حضرات یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے تو ان کے ذہن

میں انسان کی یہی تین قسمیں ہوتی ہیں بلکہ شاید صرف آخری مرتبۂ انسانی۔ان کے پیش نظر عام انسان نہیں ہوتے جو اوّل الذکر دو قسموں سے تعلق رکھتے ہیں۔

انسان کے افضل ہونے پر قرآن وحدیث سے بہت سے دلائل دیئے جاتے ہیں۔آدم کے سامنے فرشتوں کے سجدہ ریز ہونے ہم کا پہلے ذکر کر چکے ہیں۔رسولِ خداؐ کی ایک حدیث بیان کی گئی ہے ''قیامت کے دن اولادِ آدم سے برتر اور کوئی نہ ہوگا'' ۳۷ لوگ یہ سن کر حیران ہوئے اور کسی نے سوال کیا ''یا رسول اللہ، کیا فرشتے بھی اس سے بالاتر نہ ہوں گے''؟ آپؐ نے فرمایا، ''نہیں فرشتے بھی نہیں۔وہ تو مہرو ماہ کی طرح مجبور ہیں''۔جیسا کہ پہلے بیان ہوا، فرشتوں کو کوئی آزادیٔ عمل حاصل نہیں ہے۔وہ چاہیں بھی تو اللہ کے حکم سے باہر نہیں ہو سکتے۔پس انہیں ویسا ہی رہنا ہے جیسے کہ وہ ہیں۔لیکن انسان اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر غالب آتا ہے اور دوری، بُعد (تنزیہ) سے قرب اور نزدیکی (تشبیہ) تک کا سفر طے کرتا ہے۔ ایک اور حدیث میں بھی یہی بات مذکور ہوئی ہے: ۳۸

اللہ تعالٰی نے فرشتوں کو عقل وہوش سے تخلیق کیا اور جانوروں کی میل وشہوت سے۔ انسان کی تخلیق عقل اور شہوت دونوں سے ہوئی ہے۔جب انسان کی عقل اس کی شہوات پر غالب آتی ہے ہے وہ فرشتوں سے بڑھ جاتا ہے لیکن جب اس کی شہوت اس کی عقل کو مغلوب کر لیتی ہے تو وہیمیت میں جانور سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

اولادِ آدم اپنے مرتبے سے گر کر جانوروں سے بھی پست ہو سکتی ہے، یہ ہم سب کا تجربہ ہے۔بلّی چوہے کو ہڑپ کر جائے یا کتا بلّی پر جھپٹ پڑے تو کسی جانب سے ملامت کی آواز نہیں اٹھتی (بلّی کا مالک البتہ جزبز ہوگا)۔یہ کتے کی سرشت میں شامل ہے اور کتا بہر حال کتا ہے۔لیکن انسان کتے کی سی حرکتیں کرنے لگے تو یہ بری

بات ہوگی اور جب انسان اس سطح تک گر جائے تو وہ کتے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ اخلاقی ابتری اور بدچلنی صرف انسان کا خاصہ ہے۔

انسان فرشتے سے برتر ہو سکتا ہے۔اس امر کا تجربہ ہر ایک کو نہیں ہوتا بالخصوص ہمارے دور میں تو یہ نایاب چیز ہے۔اس سے یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ بہت سے لوگ آج کل یہ ماننے لگے ہیں کہ بدکرداری اور خباثت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ظاہر ہے کہ ہر بدکار اور اخلاق باختہ انسان اس فیصلے کا خیر مقدم کرے گا کیونکہ اس کے بعد وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ اس کی ساری حرکتیں درست ہیں کہ یہی انسانی سرشت ہے اور یہی دنیا کا دستور۔

انسان کی فرشتوں پر فضیلت کے سلسلے میں قرآن کی جن آیات کو پیش کیا جاتا ہے ان میں سے ایک ہاروت و ماروت نام کے دو فرشتوں کا قصہ بھی ہے۔ہم اس کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔مفسرین نے لکھا ہے کہ تخلیقِ آدم کے بعد بھی زائیدگانِ نور یعنی آسمان کے فرشتوں کی بے اطمینانی رفع نہ ہو سکی۔بین السطور شاید یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے قول کا ذکر کرتے رہے:

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِكُ الدِّمَآءَ (۲:۳۰)

کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے۔

گویا وہ کہہ رہے تھے "بارِ الٰہ، تو نے دیکھا، ہم نے کیا کہا تھا۔ یہ انسان کیسا بدطینت اور فسادی ہے، ہر دم لڑائی جھگڑا اور خون ریزی۔

فطرتِ الٰہیہ کا تقاضا یہی تھا کہ فرشتوں کی باتیں سن کر صبر کر لیا جائے (آخر

اللہ تعالیٰ ''الصبور'' بھی تو ہے )۔آ خرالامر اللہ تعالیٰ نے سوچا کہ شکایات بہت بڑھتی جارہی ہیں بہتر ہوگا کہ فرشتے خود دیکھ لیں کہ اللہ نے جو کیا وہ ٹھیک تھا اور اسے خوب معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔اللہ نے فرشتوں کو جتلایا کہ اگر وہ روئے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہوتے تو جو انسانوں سے ہوسکا اتنا بھی نہ کر پاتے۔فرشتوں کا اضطراب یہ سن کر اور بڑھ گیا۔ان کی صدائے احتجاج اٹھی کہ وہ ہوتے تو کبھی حکمِ خداوندی سے سرتابی نہ کرتے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں اس کا ثبوت دینا ہوگا۔ فرشتوں نے اپنے ساتھیوں میں سے دو سب سے زیادہ عبادت گذار اور عجز والے ساتھیوں کا انتخاب کیا۔ان کا نام ہاروت اور ماروت تھا۔ان کو زمین پر بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات سے آگاہ کیا۔انھیں شراب نوشی نہیں کرنا تھی، زنا، خون بہانے اور شرک سے بچنا تھا۔

قصے کو مختصر کیا جائے تو یوں ہوگا کہ دونوں فرشتوں کو زمین پر بسنے کے لیے انسانی بدن کا قالب دیا گیا۔وہ دونوں ایک بہت خوبرو لیکن مکار اور چالباز عورت کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہوگئے۔شروع میں تو وہ اللہ کے سب احکامات کی پابندی کرتے رہے لیکن اس عورت نے انھیں باور کروا دیا کہ ایک جرعۂ مے میں مضائقہ نہیں۔اس کے بعد کیا ہوا ہوگا، یہ سامنے کی بات ہے۔اس عورت کی خاطر انہوں نے انسانی خون سے ہاتھ رنگے اور مآل کار اسی عورت کے دیوتا کی پرستش کرنے لگے۔

جب اللہ تعالیٰ نے معاملات کو اس حد بگڑتے دیکھا تو ان فرشتوں کو سرزنش کی۔ہوش وحواس درست ہوتے ہی فرشتے مغفرت طلب کرنے لگے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں اختیار ہے، اپنی سزا اسی دنیا میں بھگتو یا اگلے جہان میں سزا پاؤ۔

فرشتے احمق نہیں تھے انہوں نے اسی دنیا میں سزا پانے کو ترجیح دی۔ سو آج دن تک وہ بابل کے ایک کنویں میں الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ ادھر نوریانِ آسمان پرواز اپنے ساتھیوں کے انجام سے عبرت حاصل کر چکے تھے۔ اس واقعے نے انسان کی افراط و تفریط کی سب شکایات کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ از سرِ نو، پوری سرگرمی سے اپنے فرائض انجام دینے میں مشغول ہو گئے۔ ان کے بنیادی کام ہیں اللہ کی تمام مخلوقات کی بہبود کا خیال رکھنا اور گناہگاروں کو بھی فراموش نہ کرنا۔

وَالْمَلٰئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ (۴۲:۵)

اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

یہاں اس نکتے پر غور فرمائیے کہ انسان کی فضیلت اس امر سے وابستہ ہے کہ اس کا بدن مشتِ خاک سے تخلیق ہوا لہٰذا صفاتِ خاک اور نہادِ آب و گل اس کے نفس میں تاثیر کرتی ہیں۔ ہاروت و ماروت سے اس وقت تک گناہ سرزد نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا جب تک ان کو تنِ خاکی نہ مل گیا۔ جب خاصیتِ خاک کو نور سے آمیخت کر دیا جائے تو ظلمت و تاریکی، بُعد اور دوری اور قہر و غضب بھی میزانیے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مٹی پر غضبِ الٰہی اس لیے ہوتا ہے کہ اس کا شیوۂ وجود ہی یہی ہے، فقدانِ نور سے دبتے چلے جانا۔ اللہ سے دور ہونے کا مطلب ہے ''تنزیہ'' سے نسبت پیدا کرنا اور اسی لیے جلالِ خداوندی کے روبرو رہنا، قہرِ الٰہی اور غضبِ خداوندی کا سامنا کرنا۔ اس کے برعکس فرشتوں کے عناصرِ تخلیق میں خاک کا دخل نہیں، وہ صرف نور سے خلق کیے گئے پس وہ اللہ تعالیٰ سے اس قدر دور نہیں ہو سکتے۔

یہ درست ہے کہ بعض فرشتے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال وغضب کا مظہر ہوتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان مخلوقات سے بہت دور اور ماوراء ہوتے ہیں جن سے انہیں معاملہ کرنے پر مامور کیا گیا ہوتا ہے۔مثال کے طور پر دوزخ کے نگران فرشتے ایسے فرشتے ہیں جو غضب کا مظہر ہیں لیکن ان میں جس غضب کی جلوہ گری ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت غضب ہے۔آگے چل کر ہم معاد وآخرت کے حصے میں گفتگو کریں گے کہ غضب اور اللہ سے دوری ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

سرسری دیکھیے تو بدن ایک منفی شے محسوس ہوگا کیونکہ یہ اپنے اندر ظلمت وتیرگی کو اور اس کے نتیجے میں نافرمانی اور گناہ کو جگہ دیتا ہے۔بدن ہی کے راستے انسان کے عناصرِ تعمیر میں معصیت کو راستہ ملتا ہے۔لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی تاریکی اور ظلمت تو ہے جس کی وجہ سے نور کی پوری تابانی اور چمک دمک دیکھنا ممکن ہوتا ہے۔جس طرح روشنی کو تاریکی کے بغیر لاتعداد رنگوں میں منعطف نہیں کیا جا سکتا (یعنی تاوقتیکہ ہر رنگ کے لیے کچھ طول موج کی لہریں ہٹا نہ دی جائیں) اسی طرح خاکِ آدم میں پھونکی گئی روحِ ربانی کو ظلمتِ بدن کے بغیر اولادِ آدم کے بے شمار افراد کی خوبیوں اور اوصاف میں منعطف نہیں کیا جا سکتا۔بدن اگر نہ ہو تو انسان فرشتہ ہو جائے اور اگر انسان فرشتہ ہو جائے تو پھر وہ نہ تو اللہ تعالیٰ سے دور ہو سکتا ہے نہ اس کا مزید قرب حاصل کر سکتا ہے۔وہ اپنے مقام پر جما رہ جائے گا جیسے آسمان پر فرشتے اور زمین پر مینڈک، انجیر اور پتھر۔قرآن میں فرشتے اپنے بارے میں کہتے ہیں:

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (۳۷: ۱۶۴)

اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک مقام معین ہے۔

فرشتے اور انسان کے سوا تمام مخلوقات ایک ''مقام معلوم'' رکھتے ہیں، ان کا مقام مقرر ہے اور ہستی غیر مبدّل ۔ لے دے کے صرف انسان ایک ایسی مقدارِ نامعلوم ہے جسے یہ آزادی ملی ہے کہ اپنے مقدر کی صورت گری کر سکے۔

ہم نے پہلے بھی ایک آیت کا ذکر کیا تھا، اس میں انسان کی سب سے الگ اس صورتحال کا بیان کیا گیا ہے جب ابلیس نے حکمِ خداوندی سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا:

مَامَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (۳۸:۷۵)

اس چیز کو سجدہ کرنے سے تجھے کیا مانع ہو گیا جسے میں اپنے دو ہاتھوں سے بنایا تھا۔

بہت سے مفسرین کا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ کے ''دو ہاتھوں'' کا جو ذکر ہے ان سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی صفات کی دو بنیادی اقسام، جلال و جمال، رحمت وغضب، تنزیہ وتشبیہ۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ کہ آدم کو صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا۔ اسی میں یہ اشارہ بھی ہے کہ دیگر تمام مخلوقات ''ایک ہاتھ'' سے خلق کی گئیں یا ہاتھ کے بجائے صرف ''کن'' سے تخلیق ہوئیں۔ ایک حدیث سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ [۳۹]

فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا 'یا رب آپ نے اولادِ آدم کی تخلیق کی اور اس کے لیے یہ دنیا بنائی، سو ہمارے لیے اگلا جہان مقرر کر دیجیے''۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا، ''میں اپنے نیک بندے کو جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، اس کی طرح نہیں کروں گا جس کو میں نے کہا ''ہو جا اور وہ ہو گیا۔

پس فرشتے اللہ کے حرفِ ''کن'' سے پیدا ہوئے جیسا کہ دوسری اشیاء وجود میں آئیں۔بعض مفسرین کی رائے ہے کہ رحمت کے فرشتے اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ اور غضب کے فرشتے اللہ کے بائیں ہاتھ سے تخلیق کیے گئے۔اسی طرح ابلیس اور شیطانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بائیں ہاتھ سے تخلیق کیا۔معاملہ جو بھی رہا ہو، اس طرح کے مباحث سے ایک ہی بات نکھر کر سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کا جو مرتبہ ہے اور تمام مخلوقات میں جو حیثیت ہے اس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔اس کی یہ انوکھی اور بے نظیر حیثیت اس لیے ہے کہ انسان کو تمام اسماء کا علم دیا گیا۔اسی انوکھے پن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے انبیاء بھیجتے ہیں۔فرشتوں یا حیوانات میں نبی نہیں بھیجے جاتے۔(جن چونکہ ایک مبہم مخلوق ہے لہٰذا وہ انسانی نبیوں کی پیروی کر لیتے ہیں)۔نبوت کی بحث کتاب کے اگلے حصے میں کی جائے گی،نبوت کا بیان اصل میں سرشتِ انسانی کی بنیادی ذمہ داریوں اور حقوق کا بیان ہے۔اس میں جو بنیادی سوال اٹھایا جاتا ہے اور جس کا جواب دینا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ انسان صحیح معنی میں ''انسان'' کیسے بنتا ہے؟ بالفاظِ دیگر انسان خدا کا بندہ اور خلیفۃ اللہ کیسے بنتا ہے؟

# باب چہارم

## نبوّت Prophecy

### انبیاء کا پیغام

#### شہادتِ ثانی

حدیثِ جبرئیل کا بیان ہے کہ مسلمان کو ''اس کی کتابوں اور رسولوں پر'' ایمان لانا چاہیے۔ اسلام کا رکنِ اوّل شہادت ہے۔ کلمۂ شہادت میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان زبان سے اس بات کی شہادت دے کہ ''محمد اللہ کے رسول ہیں''۔ پس حدیث جبرئیل ہم سے تمام انبیاء کو ماننے کا تقاضا کرتی ہے اور کلمۂ شہادت کا دوسرا حصہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو لازم کرتا ہے۔ اس میں بظاہر جو ایک تضاد نظر آتا ہے وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام سے دور ہو جاتا ہے۔ جب مسلمان یہ مان جاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو مسلمان قرآن کی صداقت کو بھی تسلیم کر لیتا ہے اور قرآن بار بار اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اللہ کی سب کتابیں اور اس کے تمام رسول سچے ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں کلمۂ شہادت کے پہلے حصے (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه) کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کلمے میں ایک کائناتی صداقت بیان ہوئی ہے۔ ایک ایسی صداقت جو ہر انسان اپنے وجدان میں جاگزیں پاتا ہے کیونکہ انسان کو صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا تھا اور اسے تمام اسماء کا علم دیا گیا تھا۔ لیکن شہادتِ ثانی مختلف ہے۔ اس کا تعلق مسلمانوں سے خاص ہے کیونکہ اس میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعلان ہے اور قرآن کی صداقت کا اثبات۔ تمام سچے دین اس شہادتِ اوّل کا

اثبات کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ہر سچے دین میں اس کی مخصوص تعلیمات متعین کی جاتی ہے جو اس کے پیروکاروں کو اس دین کے لانے والے یا انبیاء کے وسیلے سے عطا ہوتی ہیں۔

ہر نبی اس زبان میں کلام کرتا ہے جو ان لوگوں کے لیے موزوں ہوتی ہے جن میں اسے بھیجا گیا ہوتا ہے۔یہ زبانِ خطاب اس کی قوم اور سامعین کے ذہنی پس منظر اور تصورِ کائنات سے مناسبت رکھتی ہے۔قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (۱۴:۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔

اسی لیے ہر پیغمبر کے لائے ہوئے پیامِ ہدایت کی تفصیلات جداگانہ ہوتی ہیں۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۵:۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور ایک راستہ ٹھہرایا اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔

لیکن اللہ کی منشاء یہ نہیں ہے۔اس نے یہ کائنات رنگا رنگی اور تنوع کے لیے بنائی ہے۔پس اس میں بہت سی قومیں،متعدد امتیں خلق کی گئیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۱۱:۱۱۸)

اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔

کلمۂ شہادت چونکہ تمام انبیاء کا پیغام ہے اس لیے فرق و اختلاف دوسرے کلمۂ شہادت کی اقلیم میں نمودار ہوتا ہے۔سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص

تعلیمات ان کی ''شرع ومنہاج'' اس راہ ورسم اورشرع ومنہاج سے مختلف ہیں جو موسیٰ ؑ وعیسیٰ ؑ ،کنفیوشس اورمہاتما بدھ کے ہاں پائی جاتی ہے۔فی الواقع روایتی مسلمان اسی خیال کے حامل ہیں کہ ہر نبی یہی پہلا کلمۂ شہادت لے کرآتا ہے جبکہ دوسرا کلمہ ہر نبی کے پیامِ نبوت سے خاص ہوتا ہے۔

## نبی اوررسول

ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ''اسلام'' کے ایک معنی ہیں انبیاء کے ذریعے نازل ہونے والی منشائے خداوندی کو مان کرقبول کرلینا۔پس انبیاء کے لائے ہوئے دین کو ماننے والے''مسلم''ٹھہرے۔بعض مسلمان اس بات پر اعتراض کریں گے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دیگر انبیاء کے لائے ہوئے دین بگڑکرخراب ہو چکے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ درست ہے تو پھر وہ لوگ جو اس بگڑے ہوئے دین پرعمل پیرا ہیں وہ کسی نبی کے لائے ہوئے دین کی پیروی نہیں کررہے بلکہ اس کی ایک بگڑی ہوئی شکل پرعمل کررہے ہیں۔یہاں اتنا مزید کہنا ضروری ہے کہ اسلام کے سوا اورتمام ادیان میں فساد کا تصورکوئی عالمگیر اسلامی عقیدہ نہیں ہے اگرچہ بہت سے مسلمان کچھ اسی انداز میں سوچتے ہیں۔اس نکتے پرقرآن کی اصل تعلیمات اتنی سادہ نہیں ہیں کہ ان سے سفیدوسیاہ کے فیصلے صادرکیے جاسکیں۔ان میں معانی کی لطیف سطحیں ہیں۔اس نکتے پر گفتگو آگے چل کرہوگی۔

نبوت کی بحث کا مدار نبی کے تصورپر ہے۔یہ لفظ''نبی'' جس سہ حرفی مادے سے نکلا ہے اس کے دوبنیادی مفہوم ہیں''آوازنکالنا جیسے کتے کا بھونکنا،اورکسی شے کا بلند ہونا،اوپراٹھنا''۔اکثر علماء نے اس لفظ کے معانی کو اس کے اوّل الذکرمفہوم کے حوالے سے متعین کیا ہے۔کتا جب بھونکتا ہے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ کوئی غیر

معمولی بات ہوتی ہے۔اسی مادے سے جو افعال بنتے ہیں ان کا مطلب ہے ''خبر دینا، اطلاع پہنچانا''۔پس نبی وہ شخص ہے جو لوگوں کو اللہ کے بارے میں بتاتا ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ نبی کے لفظ کے معنی اس سہ حرفی مادے کے دوسرے مفہوم سے متعین ہوئے ہیں۔ نبی وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بلند درجہ دیا ہو، رفعت عطا کی ہو۔بہر کیف یہ دونوں مفاہیم اسلام کے تصورِ نبوت میں موجود ہیں۔وہ شخص جو نبی بنتا ہے کوئی عام آدمی نہیں ہوتا۔اس کے برعکس، انبیاء بہت غیر معمولی انسان ہوتے ہیں، ان کا چناؤ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ اللہ کا پیام لاتے ہیں۔عام طور پر نبی کا منصب یہ ہوتا ہے کہ پیغامِ الٰہی لوگوں تک پہنچائے تاہم کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ پیغام شخصی نوعیت کا ہو۔

انگریزی میں نبوت کے لیے جو لفظ ہے Prophecy اس میں مستقبل کے واقعات کی پیش بینی اور پیش گوئی کا مفہوم بھی شامل ہے۔عربی کے لفظ نبی میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بعض پیغامات اور اعلاناتِ نبوت مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اسلام کے تصورِ نبوت میں اور تاریخی واقعات کی پیش گوئی کرنے کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔قرآن کی بہت کم آیات کو اس طرح کی تاریخی پیش گوئی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ہاں بہت سی آیات ایسی ہیں جو ان واقعات کا بیان کرتی ہیں جو آخرِ زمان میں پیش آئیں گی اور پھر جب آخری وقت آن لگے گا تو زمانے کے اختتام پر قیامت آجائے گی۔

احادیث میں آیا ہے کہ آدمؑ سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ۱۲۴۰۰۰ انبیاء آئے (بعض جگہ ۲۲۴۰۰۰ کی تعداد بھی آئی ہے) ان میں سے ہر نبی نے اپنی ملت کی تشکیل نہیں کی تاہم انبیاء کی تعداد اتنی ہے کہ وہ سارے ادیان جو جدید ماہرین

تاریخ کو معلوم ہیں ان کے بانی کے طور پر ایک ایک نبی مان کر بھی بہت سے نبی بچ رہتے ہیں۔

قرآن نے انبیاء کے لیے چار کلیدی لفظ استعمال کیے ہیں: نبی، رسول، مرسل، اولوالعزم (صاحبِ عزم)۔ بعض علماء کے نزدیک رسول اور مرسل ایک دوسرے کے ہم معنی ومترادف ہیں۔ قرآن میں ان اصطلاحات کا استعمال یہ بتلاتا ہے کہ نبی کا لفظ رسول کے مقابلے میں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے ۳۱۳ یا ۳۱۵ رسول بھیجے۔

قدرے اختلاف رائے کے باوجود مندرجہ ذیل امتیازی نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے پیغامبر کے طور پر چن لیا جائے وہ نبی ہوتا ہے۔ انبیاء میں نسبتاً کم تعداد میں حضرات کو نئے دین کے قیام کے لیے منتخب کیا جاتا ہے اور ان کو رسول کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول وہ نبی ہوتا جس کو دیا جانے والا پیغام اتنا مفصل تھا کہ اسے تحریری یا زبانی صحائف کی صورت محفوظ کیا جاسکتا تھا۔ انبیاء کے ذریعے ان ادیان میں ترمیم واصلاح کی جاتی ہے جو رسولوں نے قائم کیے تھے۔ یا پھر انبیاء ان ادیان کے صحیفوں کے معنی ومفہوم کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ رسول تھے جبکہ یعقوبؑ اور یوسفؑ نبی تو تھے مگر رسول نہیں تھے۔ پہلے نبی اور رسول سیدنا آدمؑ تھے اور آخری نبی رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ پہلے اور آخری نبی کا ایک ہونا بہت اہم نکتہ ہے کہ اس سے ماہیتِ اشیاء اور کائنات کے اسلامی تصور پر روشنی پڑتی ہے۔ اس پر آگے چل کر گفتگو ہوگی۔

اولوالعزم انبیاء کے بارے میں کئی آراء ہیں۔ سب سے عام رائے یہ ہے کہ اولوالعزم انبیاء سے مراد وہ پانچ رسول ہیں جن کے ذریعے تاریخ انسانی کے بڑے

مذاہب صورت پذیر ہوئے یعنی سیدنا نوحؑ، سیدنا ابراہیمؑ، سیدنا موسیٰؑ، سیدنا عیسیٰؑ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۔ یہ البتہ ذہن میں رہے کہ یہاں تاریخ صرف یہودیت ۔مسیحیت ۔اسلام کی دنیا کی تاریخ تک محدود ہے۔

## امانتِ الٰہی The Trust

اسلام کا تصورِ نبوت جاننا ہو تو اس کے لیے اسلام کے تصورِ انسان پر نظر کرنا ضروری ہے۔دونوں تصورات کا فہم ایک دوسرے پر موقوف ہے۔اسی طرح انسان کو سمجھنا اس وقت ممکن نہیں جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ تاریخ میں انبیاء کا کیا منصب اور کردار رہا ہے۔

مسیحیت اور یہودیت کی طرح اس قصے کا آغاز بھی سیدنا آدمؑ سے ہوتا ہے لیکن قرآن میں قصہٴ آدمؑ کی تفصیلات اس قصے سے کافی مختلف ہیں جو عہد نامہٴ قدیم میں بیان ہوا ہے۔فرق خاصا اہم ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرشتِ انسانی کی جو شرح وتعبیر سامنے آتی ہے وہ ان لوگوں کے لیے خاصی تعجب انگیز بلکہ بسا اوقات ہلا دینے والی ہوتی ہے جن کی معلومات کا دائرہ ہبوطِ آدم کے بارے میں صرف چند عیسوی تعبیرات تک محدود ہوتا ہے۔

تخلیقِ آدمؑ کا واقعہ قرآن میں جس طرح بیان ہوا ہے اس کی کچھ تفصیلات ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں۔اب ہم ان تفاصیل میں کچھ اور نکات کا اضافہ کریں گے۔اس طرح اسلام کے تصورِ انسان کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔یاد رہے کہ سیدنا آدمؑ پہلے انسان تھے اور نسلِ انسانی کے مورثِ اعلیٰ۔آدمؑ کے بارے میں جو بھی کہا جائے گا وہ ایک حد تک نوعِ انسانی کے ہر فرد کا بیان ہوگا۔

یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ انسان کے چند مخصوص اوصاف ہیں جو اسے دوسری مخلوقات سے الگ کرتے ہیں۔ ایک مشہور آیت قرآنی میں ان تمام اوصاف کے مجموعے کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس مجموعۂ اوصاف کو ''الامانۃ'' The Trust کا نام دیا گیا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۰ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳:۷۲)

ہم نے اپنی امانت دکھائی آسمان کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو۔ پھر سب نے اسے اٹھانا قبول نہ کیا اور اس سے ڈر گئے۔ انسان نے اسے اٹھالیا۔ یہ ہے بڑا بے ترس، نادان۔

اس آیت کا مفہوم جاننے کے عمل کا آغاز کرنے ہی میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ امانت وہ قیمتی چیز ہوتی جو کوئی شخص کسی دوسرے کو بحفاظت رکھنے کے لیے سپرد کرتا ہے۔ معاملۂ مذکور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک چیز انسان کے سپرد کی ہے اور اسے اس چیز کا امین بنایا ہے۔ مناسب موقع پر یہ چیز انسان کو واپس کرنا ہوگی کہ امانت کے لفظ میں اس کے لوٹانے کا عندیہ بھی موجود ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (۴:۵۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے امانت کے طور پر کیا سپرد کیا ہے؟ دوسری تمام مخلوقات کی طرح انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ خیر کی ہر شے اس کی اپنی نہیں کہ اَلْخَيْرُ كُلُّهٗ بِيَدِكَ'' (خیر، سب کا سب، تیرے ہی ہاتھ میں ہے) جلد یا

بدیر ہر وہ شے جو ان کے پاس ہے وہ انسان کو لوٹانا پڑے گی۔ یہی زمانے کا دستور ہے، یہی انسان کی تقدیر۔ تاہم اس نوعیت کی ''امانت'' کا لوٹانا تو ہر شے مخلوق کی مجبوری ہے۔ اس معاملے میں انسان دوسری مخلوقات سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ ''عبد'' اور ''مسلم'' کے عمومی مفہوم کے مطابق تو ہر مخلوق عبد بھی اور مسلم بھی۔ سو یہ جبری یا اضطراری امانت کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے کہ اس میں انسان کے اختیار کو سرے سے دخل نہیں۔ آیتِ امانت میں بظاہر ایک طرح کی آزادیٔ اختیار کا ذکر ہو رہا ہے اور اس سے ایک بات بالکل واضح ہے کہ اس میں جس کا چیز کا تذکرہ ہے وہ انسانوں سے خاص ہے۔

زمین نے، آسمانوں نے اور پہاڑوں نے اس بارِ امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ''آسمان'' استعارہ ہے کائنات کی ارفع و نورانی اشیاء کا اور زمین اشارہ ہے ظلمانی اور اسفل اشیاء کا۔ پہاڑوں سے وہ چیزیں مراد ہوں گی جو نہ ارفع ہیں نہ اسفل۔ ان تین اصطلاحات سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں انسان کے سوا تمام اشیاء کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ نوعِ انسانی نہ فرشتوں کی طرح ارفع و آسمان پرواز ہے نہ معدنیات کی طرح پست اور زمین گیر، نہ پودوں اور جانوروں کے مانند درمیانی حیثیت والی۔ یا یوں کہیے کہ ان میں تینوں اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اپنی روح میں وہ بلند و ارفع ہے، بدن میں پست اور نفس کے لحاظ سے بین بین۔ ایک چھوٹی سی دنیا، عالمِ صغیر جس میں آسمانوں، زمین اور پہاڑوں، سبھی کی سمائی ہے۔

مختصر یہ کہ اکثر علماء کے نزدیک امانت سے مراد ہے اللہ کی خلافت۔ صرف انسان ہی اس امانت کا متحمل ہو سکتا تھا کیونکہ خلافت منحصر ہے اسماء کے علم پر اور وہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس بارِ امانت کو اٹھانے کے لیے صرف انسان ہونا کافی

نہیں۔ انسان کو اپنے اختیار سے اللہ کا بندہ بننا ہوگا، خلیفہ بننے کی نوبت تبھی آ سکے گی۔ پس بارِ امانت کا تعلق انسان کی آزادیٔ اختیار سے ہے۔ جبری ''مسلم'' نیز زمین و آسمان اور پہاڑ اسے اٹھانے سے قاصر ہیں۔ اللہ کی ہدایت کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اختیاری ''مسلم'' ہو۔

آیتِ امانت کا آخری حصہ یہ بتاتا ہے کہ انسان ''ظلوم جہول'' (بہت ظالم، بڑا نادان) ہے۔ ان منفی اوصاف کی شرح میں جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان سے اشارہ اولادِ آدم کے ان افراد کی طرف ہے جو اس ''امانت'' کا حق ادا نہیں کرتے۔ اولادِ آدم کے ہر فرد کو اس امانت کا امین بنایا گیا ہے، گو ان میں سے اکثریت یوں رہتی ہے گویا اسے اپنی صورتحال کا سرے سے علم ہی نہ ہو، انہیں اس بات کی خبر ہی نہ ہو کہ وہ، دراصل، اللہ کے خلیفہ ہیں۔ انسان ''ظلوم'' اس لیے ہے کہ وہ چیزوں کو ان کی جگہ سے بے جگہ کر دیتا ہے، غلط جگہ دیتا ہے اور صحیح اور غلط کی حدیں پھلانگ جاتا ہے۔ وہ خلافت کے اختیارات و حقوق کو اپنے ذاتی حقوق و مراعات کے طور پر برتنے لگتا ہے اور جو صفاتِ خداوندی اس کو بطور امانت دی گئی ہیں ان کو امانت کی طرح سنبھال نہیں پاتا۔ اس کے برعکس وہ یوں عمل کرتا ہے گویا یہ صفات اس کی ذاتی ہیں اور ان صفات کو جس ڈھب سے بھی استعمال کیا جائے روا ہے۔

مسلمان مفکرین نے قرآن کی بیان کردہ اس صورتِ احوال کے جواز و تشریح کے لیے کئی انداز اپنائے ہیں لیکن ہم اپنے آپ کو صرف ایک آیت تک محدود رکھیں گے۔ یہ بات اس بحث میں اکثر بطور دلیل پیش کی جاتی ہے۔ تخلیقِ آدم ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آدم اور اولادِ آدم پر یہ امر کھول دیا جائے کہ ان کا مقصدِ تخلیق کیا

ہے۔سو اللہ تعالی نے تمام اولادِ آدم کو یکجا کیا اور ان سے خطاب کیا۔اس موقع پر قرآن کا بیان یوں ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى ج شَهِدْنَا (۷:۱۷۲)

اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے، انکی پیٹھوں سے، ان کی اولاد، اوران کو گواہ ٹھہرایا خودان کے اوپر۔پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟بولے:ہاں!ہم اس کے گواہ ہیں۔

یہ آیت ایک اسطوری انداز میں یہ بتلاتی ہے کہ اپنے نفس کی گہرائیوں میں کہیں، ہر انسان اپنے خدا کی ربانیت کی گواہی لیے ہوئے ہے۔یہاں عربی کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے ’’شَھِدَ‘‘ (گواہی دینا) اسی سے شہادت کا لفظ نکلا ہے۔ اس آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے وہ عام طور پر ’’عہدِ الست‘‘ کہلاتا ہے۔’’الست‘‘ کا مطلب ہے ’’کیا میں نہیں ہوں؟ (تمہارا رب)‘‘۔اس ساعت میں تمام نوعِ انسانی نے اللہ تعالی سے ایک عہد کیا،توحید کا اقرار کیا اور تسلیم کیا کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کریں گے۔

یہاں اس بات پر زور دینا درکار ہے کہ انسان کا یہ وجدانی علم اصل میں توحید کا علم ہے۔’’راہِ صواب اور کھلے راستے‘‘ کا علم نہیں۔موخر الذکر راستہ انبیاء کی تعلیم سے میسر آتا ہے۔بالفاظِ دیگر اس کا تعلق پہلے کلمۂ شہادت سے ہے، دوسرے سے نہیں۔دوسرا کلمۂ شہادت ان خاص ہدایات و احکامات پر محیط ہوتا ہے جو انبیاء لیکر آتے ہیں۔پہلا کلمہ شہادت ہر ایک کو معلوم ہے اگرچہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ اس کے یاد

دلانے اور دھیان میں لانے کی ضرورت رہتی ہے۔اس کے برعکس دوسرا کلمۂ شہادت جن حقائق پر مشتمل ہے انہیں کسی پیغامِ ربانی سے اخذ کرنا اور سیکھنا پڑتا ہے۔

آیتِ ''الست'' آگے چل کر وہ غرض وغایت بھی بیان کرتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو شہادت دینے کے لیے روبرو کیا تھا۔

اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ اَوْتَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (۷: ۱۷۲-۷۳)

مبادا قیامت کے دن تم یہ کہو کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔یا یہ عذر کرو کہ شرک تو ہمارے باپ دادا نے پہلے کیا تھا ہم تو ان کی اولاد میں بعد میں ہوئے ہیں۔کیا تو ہم کو ایسے کام پر ہلاک کر دے گا جو خطا کرنے والوں نے کیا تھا؟

اس آیت کی تفاسیر مختلف ہیں تاہم بہت سے علما کا کہنا ہے کہ روزِ حساب انسان کو توحید کی صداقت کی شناخت کے لیے جوابدہی کرنا ہوگی خواہ ان تک کسی نبی کا پیغامِ ہدایت پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ہاں ان خاص احکامات وتعلیمات کی باز پرس ان سے نہیں ہوگی جو کسی نبی کو دی گئیں اور ان کو اس کی خبر نہ ہو سکی۔

## فطرتِ انسانی Innate Human Nature

انسان کے باطن میں خلقی طور پر توحید کی شناخت موجود ہے۔اس تصور کو بیان کرنے کے لیے اکثر ''فطرت'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اس کو عام طور پر

انگریزی میں Primordial Nature یا Innate Disposition کے الفاظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔فطرت کے لفظ کے بنیادی اور ابتدائی معنی ہیں ٹکڑوں میں پھاڑنا، شگاف کرنا۔اس میں کھلنے اور باہر نکلنے کا مفہوم شامل ہے۔اسی فعل میں پیدا کرنے، ظاہر کرنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور روزمرہ کی زبان میں اس کا مطلب ہے گوندھنا، خمیر کرنا۔قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''فاطر السموٰت والارض'' (زمین و آسمان کو پھاڑ کر بنانے والا) کہا ہے۔عام طور پر ترجمہ کرنے والے اس لفظ فاطر کے ترجمے میں ''خالق'' یا ''ابتداء کرنے والا'' لکھتے ہیں لیکن عربی کے لفظ فاطر کے معنی ان نسبتاً مجرد اصطلاحات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ٹھوس اور محسوس ہیں۔کہا جاسکتا ہے کہ اس لفظ کا مطلب ہے ''زمین و آسمان کو پھاڑ کر الگ کر دینے والا'' یہ تعبیر اس دوسری آیت میں بیان کردہ تمثیل سے بھی مل جاتی ہے جس میں زمین و آسمان کو چاک کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا

فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱:۳۰)

کیا ان منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین دونوں منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھولا۔اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔

''فتق'' یعنی پھاڑ کر ٹکڑے کرنے ، چاک کرنے کی یہ آیت اور فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کی آیت میں جو تصویر ہمارے سامنے ابھرتی ہے وہ عالمگیر ہے۔ساری دنیا میں ہر تہذیب میں آفرینشِ کائنات کا نقشہ اسی طرح کھینچا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کو الگ الگ کر کے کائنات پیدا کی۔ان کے جدا جدا ہونے سے پہلے ہر شے ایک ہی سی اور بے امتیاز تھی۔یونانی فلسفے کے

اسلوب بیان میں یوں کہیں گے کہ اس آن صرف chaos تھا آشوب وآشفتگی تھی یعنی نہ کوئی ترتیب ونظام نہ حسن و جمال۔ یونانی زبان کے لفظ Cosmos میں بھی دو مفاہیم پائے جاتے ہیں (اسی سے انگریزی کا لفظ Cosmetics بنا ہے) زمین وآسمان کو الگ الگ کر کے اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو اس کی جداگانہ ہستی عطا کر دی۔

ہم نے پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ آسمان استعارہ ہے ہر بلند و ارفع، نورانی، لطیف اور فعّال چیز کا جبکہ زمین حوالہ ہے ہر پست، ظلمانی، کثیف اور منفعل شے کا۔ جب یہ دونوں الگ ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اقلیمِ بالا سے آبِ حیات نازل کرتے ہیں اور اس اقلیمِ زیریں میں جاندار اشیاء وجود میں آ جاتی ہیں۔ زمین و آسمان کی اس تفریق سے پہلے ان کے الگ الگ کیے جانے سے قبل جدا جدا اور علیحدہ ممیّز اشیاء ہو نہیں سکتی تھیں۔

قرآن مجید میں 'فطرۃ'' کا لفظ صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔ اس کی فعلی صورت بھی استعمال ہوئی ہے۔ ہم نے اس کا ترجمہ ''نکالنا، سامنے لانا، برآمد کرنا'' کے الفاظ سے کیا ہے۔ قرآن مجید کا خطاب یہاں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اسی خطاب کی حدود ہر مسلمان تک وسیع ہو جاتی ہیں:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۰ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۰:۳۰-۳۱)

سو تم سیدھا رکھو اپنا رخ دین پر، ایک طرف کے ہو کر، وہی فطرت اللہ کی

جس پر اس نے لوگوں کو تراشا۔اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں۔یہی ہے سیدھا دین لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے۔اسی کی طرف متوجہ ہو کر، اسی سے ڈرتے رہو اور نماز کا اہتمام رکھو اور ان میں سے نہ بنو جو اس کے شریک بناتے ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے دین کو فطرت سے جوڑ دیا ہے وہ فطرتِ ازلی جس پر اسے خلق کیا گیا تھا۔انسان ہونے کا مطلب ہے ''امانت'' کو قبول کرنا اور ''عہدِ الست'' میں شامل ہونا۔انسان کو اسی لیے اسماء کا علم دیا گیا، صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا اور خلیفۃ اللہ بننے کے لیے سب مخلوقات پر فوقیت دی گئی۔لیکن اس مقام پر انسان کی آزادیٔ اختیار بھی ایک مسئلہ کو جنم دیتی ہے۔ہر انسان نے اگرچہ ''بارِ امانت'' اٹھانے کی حامی بھری تھی تاہم اولادِ آدم کی اکثریت اس سے روگردانی کر کے ''ظلوماً جہولاً'' بن جاتی ہے۔اس میں سے اکثر یہ نہیں جانتے ہیں کہ ''امانت'' کی پاسداری ہی سچا دین ہے، یہی راہِ صواب ہے اور انسان کے چلنے کے لیے یہی درست اور صحیح راستہ ہے۔

اختیاری ''مسلم'' بننے کے لیے انسان کو اپنا چہرہ، اپنا رخ (وجہ) اللہ کی طرف موڑنا لازم ہے۔عربی میں چہرے کے لیے جو لفظ ہے یعنی ''وجہ'' وہ کسی شے کی حقیقت، اس کی ذات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن یہاں کہہ رہا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنی پوری توجہ اور سارے وجود سے اللہ کی طرف رخ کرے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ سے انسان کو رشتۂ توحید قائم کرنا چاہیے اور کسی کو اللہ کا شریک نہیں کرنا چاہیے۔اس کا تقاضا ہے کہ دین کے پانچ ارکان پر عمل کیا جائے۔ارکانِ دین کی نمائندگی اس آیت میں ''صلوٰۃ'' سے ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اسلام

کی تیسری جہت کو واقعی طور پر زندگی کا حصہ بنانا بھی درکار ہے۔اس ضرورت کی جانب آیت کے الفاظ "وَاتَّقُوہ" (to be wary of God) اشارہ کررہے ہیں۔

رسولِ خداؐ نے "فطرۃ" کا لفظ ایک مشہور حدیث میں بھی فرمایا ہے جس میں اس اصطلاح کے اسلامی فہم کا بیان سمٹ کرآ گیا ہے۔ "مَا مِنْ مَوْلُودٍ اِلَّا یُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُنَصِّرَانِهِ اَوْیُهَوِّدَانِهِ اَوْیُمَجِّسَانِهِ" (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے عیسائی، یہودی یا مجوسی بنا دیتے ہیں) یہ قولِ رسول ہیں یہ بتلاتا ہے کہ انسان کی خلقی سرشت وفطرت اور اسلام اصل میں ایک ہیں۔ "امانتِ" الٰہی اور "عہدِ الست" کی وجہ سے انسان اس دنیا میں "توحید" کی شناخت لے کرآتا ہے۔پھر ان کی تربیت اور ماحول ان کی اس سرشتِ اصلی میں بگاڑ لے آتی ہے اور وہ الہِ واحد کے بندے بننے کی بجائے دوسری حقیقتوں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔اگر انسان اپنی اصلی کھری فطرت پر لوٹ آئے تو خودبخود "توحید" کی طرف واپس آ جائے گا۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اسلام کی نظر میں ہر غیر مسلم حق کو چھپانے والے

(Truth concealer) ہوتا ہے۔رسولِ خداؐ کے فرمان میں یہ تو یقینی طور پر مضمر ہے کہ یہ تینوں ادیان "توحید" کی راہ مستقیم سے ہٹ کر راہِ انحراف پر پڑ گئے ہیں۔لیکن اگر غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی تعلیمات کا کوئی حتمی جائزہ لینا ہو تو اس کے لیے دیگر احادیث اور قرآنی آیات کو بھی دیکھنا ہوگا۔اس کے بعد آخری بات کہی جا سکے گی۔آئندہ ابواب میں سے ایک باب میں ہم یہ دیکھیں گے کہ ان

نکات پر کوئی واضح عقیدہ موجود نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ غیر مسلم مسلمانوں ہی کی طرح اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی، صاحبِ ایمان بھی اور حق کو چھپانے والے بھی، راہِ راست کے مسافر بھی اور خطا کار بھی۔ لیکن ایک عمومی قاعدے کلیے کے طور پر مسلمان بھی دیگر کسی اور مذہب کے ماننے والوں کی طرح یہی خیال قائم کر لیتے ہیں کہ ہمارا نقطۂ نظر، ہمارا تناظر ہی صحیح ہے دیگر کوئی نقطۂ نظر اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ ایک دین کے لیے یہ بات اتنی ہی فطری ہے جتنا کہ یہ امر کہ ہم جب ''میں'' کا لفظ ادا کرتے ہیں تو ہمارے اندر یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ میری ''انا'' میرے برابر والے انسان کے مقابلے میں زیادہ حقیقی اور زندگی کے لیے زیادہ بامعنی ہے۔ وہ لوگ جو مزید فاصلے پر ہیں ان کی زبان سے ادا ہونے والا ''میں'' اور بھی کم معنویت رکھتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی ہدایت ''اپنے ہمسائے سے اپنے جیسی محبت کرنا'' ایک ایسا مشکل کام ہے جس پر پورا اترنے کے لیے عظمتِ انسانی کا ایک غیر معمولی بلند معیار درکار ہوتا ہے اور اگر معاملہ ان لوگوں کا ہو جنہیں آپ نے کبھی دیکھا تک نہیں تو پھر کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

## ابلیس و آدم

''امانت، عہدِ الست اور فطرت'' تینوں الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نوعِ انسانی کو اللہ کی طرف سے ایک باری بھاری ذمہ داری دی گئی ہے۔ اس کے لیے وہ خدا کو بھی جواب دہ ہیں اور مخلوقِ خدا کو بھی۔ قصۂ آدم کی جو صورت اسلام میں بیان ہوئی ہے اس سے یہی تصویر ابھرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جملہ اسماء تعلیم کیے اور فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ عندیہ یہ تھا کہ علمِ اسماء کی بنا پر آدم فرشتوں سے بھی برتر ہو چکا تھا مخلوقاتِ خداوندی میں سے بلند اور

ارفع ترین۔

قرآن میں حوا کی تخلیق کا ذکر نہیں ہے۔احادیث میں البتہ انجیل ہی کی طرح یہ بتایا گیا ہے کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔قرآن میں یہ ذکر البتہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کو جنت میں مقام عطا کیا اور انہیں بتا دیا کہ انہیں وہاں کس طرح رہنا ہے۔

وَقُلْنَا يَاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲:۳۵-۳٦)

اور ہم نے کہا، اے آدم! جنت میں بس تم اور تمہاری بیوی۔اس میں جہاں سے چاہو فراغت سے کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ بے انصاف ہو گے۔تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس سے جس میں وہ تھے۔

جنت میں آدم و حوا کا ''اسلام'' یہ تھا کہ اللہ کی ہدایات پر عمل کریں۔وہ اپنی خواہش سے عمل کرنے میں آزاد تھے،ہاں اس درخت کو چھونے کی اجازت نہ تھی۔اس سے ظاہر ہوا کہ اپنے آغازِ آفرینش ہی سے انسان کو آزادی بھی ملی تھی اور اسی کی طرف سے ہدایت و راہنمائی بھی۔اسی آزادیِ اختیار میں اللہ کی ہدایت کو نظر انداز کرنے کا امکان بھی پوشیدہ تھا۔ادھر ابلیس بھی تاک میں تھا۔سو اس نے آدم اور حوا دونوں کو بھٹکا دیا۔

یاد رہے کہ ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے اس انکار پر باز پرس کی تو اس نے کہا:

اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (۷:۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے خلق کیا اور اسے مٹی سے۔

ابلیس کی نافرمانی پر اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر اتار دیا۔ اس مرحلے پر ابلیس اور اللہ تعالیٰ کے مابین جو گفتگو ہوئی ہے وہ بہت اہم ہے کہ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں ابلیس کے کردار کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے۔ اس مکالمے پر غور کیے بغیر ہم جنت سے آدمؑ کے ہبوط کے واقعے کی پوری اہمیت کو گرفت میں نہیں لا سکتے۔ اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے مکالمے کی باقی تفصیل درج ذیل ہے:

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ ۚ قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۚ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۚ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ۚ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ۚ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ (۱۸ - ۷:۱۳)

کہا، تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں تکبر کرے۔ نکل جا! تو یقیناً ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا، اس دن تک کے لیے مجھے مہلت دے

دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے کہا، تجھ کو فرصت ہے۔بولا، چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا، آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا، نکل یہاں سے خوار اور کھدیڑا ہوا۔ ان میں سے جو کوئی تیری راہ پر چلا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

اس مکالمے میں دیگر تفصیلات بھی ہیں جو قرآن میں دیگر مقامات پر ملتی ہیں۔ ہماری موجودہ بحث کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباس اہم ہے:

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۔ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَىَّ مُسْتَقِيْمٌ ۔ اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۵:۳۹-۴۳)

بولا: اے رب جیسا تو نے مجھے راہ سے کھویا، میں زمین میں ان سب کو بہاریں دکھاؤں گا اور تیرے چنے ہوئے بندوں کے سوا ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ فرمایا، یہ ایک سیدھی راہ ہے مجھ تک پہنچانے والی۔ میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیروکار بن جائیں۔

اس بیان سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ شیطان کی انسان دشمنی کا آغاز کیونکر ہوا۔ اس عداوت کا سبب تھا تکبر، غصہ اور حسد۔ اسے اپنے آتش نہاد ہونے پر غرور

تھا اور مخلوقات میں اپنے بلند مرتبے کا گھمنڈ۔ اسے غصہ اس بات کا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مشتِ خاک کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم کیوں دیا۔ آدم سے حسد کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آدمؑ پر اللہ کی خاص عنایت سب کے لیے عیاں تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ ابلیس کی نگاہ اس بات پر کبھی نہ گئی کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ جانتے ہیں وہ شاید ابلیس کو معلوم نہیں۔ وہ اس چیز کے ادراک میں ناکام رہا کہ اس سے بھی غلطی سرزد ہوسکتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے کیے کا اور اپنے انجام کا الزام اللہ تعالیٰ کو دیتا رہا۔

قرآن میں ابلیس و آدمؑ کا قصہ جس طرح بیان ہوا ہے اس کا ایک دلچسپ حصہ وہ سودا بازی ہے جو ابلیس اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ قیامت کے دن تک اس کو چھوٹ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے مطالبے کو پورا کر دیا۔ اس کے بعد ابلیس کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سب بندوں کو گمراہ کرے گا۔ یہاں ابلیس نے وہی لفظ استعمال کیا ہے جو اس نے اس سے پہلے اس وقت کیا تھا جب اس نے یہ کہا تھا کہ ''تو نے مجھے گمراہ کیا، بھٹکا دیا'' (اَغْوَیْتَنِیْ)۔ اس مقام پر قرآن نے ابلیس کی کمزوری اور گمراہ کرنے کی قوت نہ رکھنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابلیس کا اپنا قول ہے ''میں تیرے سب بندوں کو گمراہ کروں گا سوائے ان کے جو اہلِ اخلاص ہیں''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابلیس جو چاہے کرے، اچھے ''مسلمانوں'' پر اس کا کوئی زور نہ چل سکے گا۔ مختصر یہ کہ ابلیس جو چالیں چلے گا، جو دام بچھائے گا اس قضیے میں اللہ تعالیٰ آغاز ہی سے شامل ہیں۔

شیطان کے بارے میں مسیحیت کے بیانات پڑھیے تو اکثر اوقات یوں لگتا ہے کہ گویا شیطان پر کسی کا زور ہی نہ چلتا ہو۔ اس نے اللہ سے سرکشی کر کے بغاوت کی اپنی ایک الگ قلمرو بنالی ہے جس میں اللہ کے قانون کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا

گیا ہے۔ بعض مواقع پر تو معاملہ ایسا خراب نظر آتا ہے گویا ابلیس نہ ہو بدی کا دیوتا ہو جسے آخر کار تو شکست ہو جائے گی لیکن فی الحال وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہے۔

اسلام میں تصورِ ''توحید'' کا ایسا غلبہ ہے کہ ابلیس کے لیے کسی طرح کے بھی خود مختار کردار کی گنجائش نہیں بنتی۔ ابلیس تک کو ''مسلم'' مانا گیا ہے اگر چہ وہ صرف ایک بہت وسیع معنی میں ''مسلم'' ہے۔ وہ اللہ کا بندہ تو ہے مگر مجبوری اور اضطرار میں۔ وہ اختیاری بندۂ خدا نہیں ہے۔ اس کا تکبر گھمنڈ اور خود پسندی، اس کا زعم کہ ''انا خیر منہ'' (میں اس سے بہتر ہوں) اسے یہ دیکھنے ہی نہیں دیتا کہ وہ بھی دوسری ہر مخلوق کی طرح اللہ ہی کا بندہ ہے۔

قصۂ ابلیس کو آیاتِ قرآنی کے مکمل سیاق و سباق میں غور سے پڑھیے تو یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ یہاں انسان کی آزادی اختیار کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ ابلیس خطا و عصیان اور گمراہی کا نمائندہ ہے۔ اس کے بغیر غلط فیصلے، نا درست چناؤ ممکن نہیں بلکہ یوں کہیے کہ انتخاب اور چناؤ ہی ممکن نہیں۔ انسان کے لیے ابلیس کا وجود ہی صحیح اور غلط، حق اور باطل، خوب اور نا خوب، ہدایت اور گمراہی، فوز و فلاح اور انجام بد سب کے درمیان ایک خطِ امتیاز قائم کرتا ہے۔ اگر راہِ انحراف نہ ہوتی تو راہِ صواب کیسے سامنے آتی۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ تخلیقِ کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان، بلند و پست نور و ظلمت، روشن و تاریک، لطیف و کثیف اور ثقیل اور ہلکے کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیا۔ ان میں امتیاز کے بغیر ایک چیز کو دوسری سے جدا کرنا، ممیز کرنا ممکن نہیں، نہ اس عمل کے بغیر کوئی مخلوق جامۂ ہستی میں آ سکتی ہے۔ نور اور ظلمت،

روشنی اور تاریکی کا فرق ایک مادی مفہوم تو رکھتا ہی ہے لیکن اس میں ایک غیر مادی اور غیر محسوس معنی بھی ہیں۔ نور حوالہ ہے تمام صفاتِ خداوندی کا جبکہ تیرگی اور ظلمت اشارہ ہے انہی صفات کے فقدان کا۔ نور کی ایک روحانی معنویت بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نور کا تعلق ہے تابندگی اور چمک سے، علم سے، ہدایت اور نجاتِ اخروی سے۔ اس کے برعکس ظلمت کا تعلق ہے جہل سے، گمراہی اور ضلالت سے اور خسران و نقصان سے۔ بعض مسلمان مفکرین نے لکھا ہے کہ جب وقتِ آخر آن لگے گا تو آگ کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا۔ اس کا روشن اور نورانی حصہ بلند ہو کر جنت میں چلا جائے گا جبکہ اس کی گرمی اور تمازت بہ کر جہنم میں داخل ہو جائے گی۔ دوزخ ایک ایسا ٹھکانا ہے جس میں اذیتناک اور جلا ڈالنے والی تیرگی ہے۔ جنت اقلیمِ نجات و آزادی ہے، حیاتِ نو دینے والی روشنی۔

مختصر یہ کہ ابلیس ظلمتِ خطا و عدوان کی تجسیم ہے، مجسم جہل، تکبر اور ظلم کی تیرگی ہے۔ ابلیس جن قوتوں کا نمائندہ ہے اس کے بغیر اخلاقیات کی دنیا برقرار نہیں رہ سکتی۔ غلط اگر نہ ہو تو صحیح کیسے جانا جائے گا، نادرست ہی سے تو درست کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔ انسان کو نجاتِ اخروی کیسے حاصل ہو گی اگر خطا و خسران اور غلط اور نقصان کے ذریعے Salvation اور Damnation کی نوعیت متعین نہ ہو۔ ہم روشنی میں داخل ہی کیونکر ہوں اگر تاریکی نہ پائی جائے جس سے نکل کر ہم نور میں قدم رکھیں۔ ہمارا تو وجود ہی نہ ہو کیونکہ ہماری ہستی کا دارومدار ہی ہماری انسانی صورتِ حال کے اس ابہام پر ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی تعریف متعین کیجیے تو یہ نکتہ سامنے آئے گا کہ ہم نور و ظلمت کے درمیان معلق ہیں، زمین و آسمان کے بیچ، روح اور بدن کے درمیان۔

ابلیس بدی اور ستم گری کا نمائندہ ہے لیکن مسلمان یا کم از کم سمجھدار مسلمان جانتے ہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے پیدا کیا تھا جو وہ انجام دے رہا ہے۔وہ محض اپنا فرضِ منصبی پورا کر رہا ہے۔ عالمِ خلق میں اس کا کردار یہی ہے، گستاخی، گھمنڈ، غصہ اور حسد۔اللہ کے پیمانۂ تقدیر نے اس کے لیے صفات الٰہیہ میں سے قہاریت، جباریت اور عظمت و کبریائی جیسی صفات قہر و غضب کا تو بڑا حصہ مقدر کر دیا لیکن حکمت، شائستگی اور حسِ تناسب سے تقریباً تہی دامن رکھا۔قرآن مجید نے بھی کئی آیات میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔وہ آیت جس میں ابلیس کے قسم کھا کر اپنے ارادۂ اغوائے انسانی کے اعلان کا ذکر ہے وہ یوں ہے:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (۳۸:۸۲)

اس نے کہا قسم ہے تیری عزت کی میں ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔

یہاں اس کا ربط اللہ کے نام ''العزیز'' (The Almighty, The Inestimably Precious) سے قائم ہوتا ہے۔اسی طرح جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ابلیس نے اپنی بڑائی جتائی (استکبار کیا) تو وہ اسے اللہ کے نام ''المتکبر'' (The Grand, The Proud) سے جوڑ دیتا ہے۔ابلیس ایک ایسی خدمت کر رہا ہے جو سمائے غضبیہ سے ایک قریبی تعلق رکھتی ہے۔

سرشتِ ابلیس پر مزید گفتگو کرنے سے پہلے ذرا آدم و حوا کی طرف واپس چلتے ہیں ہم نے قصۂ آدم وہاں چھوڑا تھا جہاں ابلیس کی وجہ سے جنت میں ''ان سے لغزش سرزد ہوئی''۔لوگ اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جنت میں ابلیس کا کیا کام؟ اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ انسان ہونے کا مطلب ہے خطا و صواب، درست و نا درست اور اطاعت و معصیت کے درمیان ایک چناؤ کا سامنا

کرنا۔ اللہ تعالیٰ آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ سے الگ رہنے کا حکم ہی نہ دیتے اگر ان کی مشیت میں آدم کی غلط روی کا امکان موجود نہ ہوتا۔ اس حکم میں اس امر کا اثبات مضمر تھا کہ اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے درمیان ایک معاملہ طے پا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ابلیس انسانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا (اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ، کم از کم ایک حد تک، ابلیس کو اس میں کامیابی ہوگی)۔

جب آدم و حوا نے اس شجر سے پھل کھا لیا تو ان پر اپنی برہنگی عیاں ہوئی اور وہ درختوں کے پتوں سے اپنے بدن کو ڈھانپنے لگے۔ انجیل میں بھی یہ قصہ اسی طرح مذکور ہوا ہے اور قرآن و انجیل دونوں سے یہ واضح ہے کہ یہ شجرِ ممنوعہ اصل میں خیر و شر کے علم کا درخت تھا۔

ممنوعہ پھل کھا کر آدمؑ نے کیا کیا؟

وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهُ (۲۰ : ۱۲۱)

آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا سے کہا:

اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۷ : ۲۲)

کیا میں نے تمہیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے؟

آدم و حوا کا جواب ایسا ہے جیسے خواب سے چونک کر اٹھنے والے کسی شخص کا ہوتا ہے۔ وہ یک لخت ششدر رہ گئے کہ ان سے یہ کیا ہو گیا اور پھر وہ دونوں ایک

آواز ہو کر بولے:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سكته وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۷:۲۳)

بولے، اے ہمارے رب، ہم نے خراب کیا اپنی جان کو۔ اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نامراد ہو جائیں گے۔

قرآن میں اس عمل کا الزام نہ تو صرف حوا پر رکھا گیا ہے نہ تنہا آدم پر۔ دونوں سے لغزش ہوئی، دونوں نے اپنی غلطی کا ادراک کر لیا اور دونوں اپنے رب سے مغفرت کے طالب ہوئے۔

اس مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو زمین پر اتار دیا اور انہیں بتا دیا کہ یہاں ان کو باہمی عداوت کا منہ دیکھنا ہوگا۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ

مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۰ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ

وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ (۷:۲۴-۵)

فرمایا: اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک خاص وقت تک رہنا ہے اور برتنا ہے۔ فرمایا: اسی میں تم جیو گے، اسی میں تم مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔

## ہبوطِ آدم The Fall

مسیحی تحریروں میں جو Fall کا لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایک قدرے منفی مفہوم پنہاں ہے۔ عربی کی وہ اصطلاح جو اس واقعے کو بیان کرنے کے لیے

استعمال ہوئی ہے وہ ہے ''ہبوط''۔ یہ لفظ ان آیات میں استعمال ہوا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا سے خطاب کر کے انہیں ''نیچے اترنے'' (اِهْبِطُوا) کا حکم دیا ہے۔ مسلمان مفکرین نے اس واقعہ کے منفی پہلوؤں کو بھی دیکھا اور مانا ہے کہ بہر حال اس کی نوبت اسی لیے آئی کہ آدمؑ وحوا اللہ کے حکم سے باہر ہو گئے۔ یہ لغزش شیطان کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مسلمان مفکرین کی تحریروں میں اس بات کا اشارہ شاذونادر ہی ملتا ہے کہ ہبوطِ آدم کے واقعے سے کسی طرح کے original sin یا ''گناہِ اصلی'' کا بھی کوئی تعلق ہے۔ یہ تصورِ مسیحیت سے خاص ہے۔ آدم وحوا سے لغزش ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا کہ جنت سے نکل کر زمین پر اتر جاؤ۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ کہنا یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اگر آدم وحوا سے لغزش نہ ہوتی تو ان کے لیے بہتر تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر شے بقدرِ اندازۂ خداوندی معین ہے۔ اللہ کی رحمت وحکمت اس امر کی ضامن ہے کہ ہر چیز میں خیر ہوتی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ تخلیقِ آدم کے آغاز ہی میں اللہ نے کہا تھا کہ:

اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲:۳۰)

میں زمین پر خلیفہ بنا رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کو جنت کے لیے نہیں اس دنیا کے لیے بنایا تھا۔ ''نیچے اترو'' (اِهْبِطُوْا) کا مطلب ہے نیچے اتر کر دنیا میں پھیلنا۔ جنت کہیں اور واقع تھی اور بظاہر دنیا سے بالاتر کسی جگہ پر۔ جو شے بھی دنیا سے بلند تر ہو اس میں آسمانی خواص ہوں گے۔ زمینی اوصاف نہیں پائے جائیں گے وہ ارفع ہوگی نورانی ہوگی اور لطیف ہوگی۔

آدمؑ کے زمین پر آنے کو اسلام نے کس نظر سے دیکھا ہے اور کیونکر اس کی تعبیر کی ہے اسے جاننا ہو تو مندرجہ ذیل حدیث پر غور کیجیے جس میں ساری بات بہت خوبصورتی سے سمیٹ کر بیان کر دی گئی ہے:[۱۴]

سیدنا موسیٰؑ نے کہا ''پروردگار، مجھے دکھایئے آدم کون تھا جس نے ہمیں اور خود کو جنت سے نکلوا دیا'' اللہ تعالیٰ نے آدم کی رویت کروائی۔ سیدنا موسیٰؑ نے کہا ''آپ ہی ہمارے جدِ اعلیٰ آدم ہیں؟۔'' آدمؑ نے اثبات میں جواب دیا۔ سیدنا موسیٰؑ نے کہا ''آپ ہی تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی، جسے تمام اسماء کا علم دیا، اور جس کے سامنے اس نے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا امر کیا اور وہ سجدہ ریز ہوئے؟ آدمؑ نے کہا ہاں۔ اس پر سیدنا موسیٰؑ نے کہا ''یہ کیونکر ہوا کہ آپ خود بھی جنت سے نکلے اور ہمیں بھی نکلوا دیا؟۔'' آدمؑ نے جواب میں پوچھا، ''تم کون ہو؟۔'' سیدنا موسیٰؑ نے بتلا دیا۔ سیدنا آدمؑ نے کہا، ''تم بنی اسرائیل کے وہ نبی ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے پردے کے پیچھے سے خطاب فرمایا اور جسے اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے اپنا رسول بنایا؟'' سیدنا موسیٰؑ نے کہا، جی ہاں۔ سیدنا آدمؑ نے کہا ''تم نے دیکھا نہیں کہ میری تخلیق سے بھی پہلے میری (یہ لغزش) کتابِ خداوندی میں درج تھی؟'' سیدنا موسیٰؑ نے کہا کہ ہاں ایسا ہی تھا۔ اس پر آدمؑ نے کہا ''تو پھر مجھے اس بات کا دوش کیوں دیتے ہو جو عرصہ ہستی میں آنے سے پہلے ہی میرے لیے امر فرما دیا گیا تھا۔

رسولِ خداؐ نے اختتامِ کلام کے طور پر زور دے کر تین مرتبہ دہرایا ''سو اس طرح آدمؑ نے موسیٰؑ سے گفتگو کی بازی جیت لی''۔ ہم اس سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عام طور پر مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ہبوطِ آدم کے کچھ منفی نتائج بلا شبہ رہے

ہوں گے تاہم یہ سب سے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور منصوبۂ الٰہی کا حصہ تھا۔ ہبوطِ آدم کے بغیر آدم کو اس زمین پر خلیفۃ اللہ کی حیثیت کیونکر ملتی۔ مسیحی اصطلاح میں کہیے تو یوں ہوگا کہ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانا اصل میں ایک ''لغزشِ مسعود'' fortunate sin کے مترادف تھا۔

یاد رہے کہ خلافت کا مدار عبودیت پر ہے۔ عبودیت اور بندگی اس بات پر منحصر ہے کہ اسمائے تنزیہ اور جلال سے آپ کا رشتہ اور تعلق درست اور صحیح ہو۔ اللہ کا سچا اور صحیح بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ سے اپنا فاصلہ سمجھے اور اس کے غضب، قہر، عظمت، کبریائی، اور اس کے وراء اور بالائے ادراک ہونے کو قبول کرے اور تسلیم کرے۔ تاہم اگر انسان کی نظر صرف اللہ کی رحمت پر رہے اور وہ فقط اس کے روئے مہر و محبت ہی کو دیکھا کرے تو اس کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ ان صفاتِ جلال و غضب کو جان سکے۔ اسی لیے بعض مسلم مفکرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو باغِ بہشت میں اسی لیے رکھا تھا کہ وہ ان سختیوں اور مصائب کی سہار پیدا کر لیں جو اس لمحے یلغار کریں گی جب ان کو اللہ سے بہت دور، اس زمینی دنیا کو اپنا مسکن بنانا ہوگا۔ جنت میں تھے تو اللہ کے قرب میں تھے، گاہ گاہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام فرماتے تھے۔ اللہ کا قرب، جمال اور رحمت ہی آدم و حوا کا سرمایہ تھا۔ روئے ارض پر وارد ہونے کے بعد وہ اللہ سے دور ہو گئے۔ اب انہیں اللہ کی صفاتِ جلال و غضب کے عواقب کا سامنا کرنا تھا۔ کمالِ انسانی کے سارے امکانات سے بہرہ یاب ہونے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں قرب و بعد، دوری اور نزدیکی سبھی کا ذائقہ چکھنے کا موقع ملتا۔ ''توحید'' کی بنا رکھنے کے لیے لازم ہے کہ صفاتِ ''تشبیہ'' اور صفاتِ ''تنزیہ'' دونوں ہی انسان کا تجربہ بن جائیں۔

عام مسیحی تناظر میں ہبوطِ آدم کے منفی نتائج کو ''گناہِ اصلی'' کے تصور کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔اللہ کی نافرمانی کرنے اور شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے سے آدم کی سرشت میں ایک ایسا بنیادی فساد پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہوا کہ وہ مسیح علیہ السلام کی صورت میں خود کو مجسم کر کے اللہ کے تصور کی اصلاح اور تصحیح کرے۔اس کے برعکس اسلام میں Original Sin کا کوئی تصور نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھنے پر آدم و حوا کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔صرف اسی قدر نہیں بلکہ ''ثُمَّ اجْتَبَٰهُ رَبُّهُ'' (پھر اس کے رب نے اسے نوازا) یعنی آدم کو اللہ کا نبی مقرر کیا گیا۔اس لیے قرآن میں آیا ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ (۳:۳۳)

بے شک اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو اہل دنیا کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا۔

یہ وہ نکتہ ہے جس پر اسلام اور مسیحیت میں بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ انسان کی سرشت و نہاد کے بارے میں اسلامی اور مسیحی تصورات میں بنیادی فرق ہے۔پہلے انسان سے لغزش ہوئی، وہ گر پڑا۔ہم سب سے ایسا ہو جاتا ہے لیکن ہمارے برعکس اس سے صرف ایک ہی مرتبہ لغزش ہوئی۔مزید براں یہ کہ اس نے اسی ساعت میں توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو نبی بنایا اور ان کو خطا و عصیاں سے معصوم بنا دیا۔آدمؑ ہمارے لیے مسبب المصائب نہیں بلکہ کمالِ انسانی کا نمونہ ہیں۔اگر انسان اپنے باپ آدمؑ اور اپنی اماں حواؑ جیسے بن سکیں تو کیا کہنے، پھر نہ ان کے لیے حزن ہو گا نہ کسی شے کا خوف۔

روئے ارض پر آدمؑ کا بطور خلیفۃ اللہ خدا کے نبی کی حیثیت سے ظاہر ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور ہدایتِ خداوندی شیطان کی پھیلائی ہوئی گمراہی پر غالب رہتی ہے۔

## غفلت

اسلام میں اگر ''گناہِ اصلی'' کا تصور نہیں ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مسلمان یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ سب کچھ درست ہے اور لوگ باگ جیسے ہیں ویسے ہی چلتے رہیں، یونہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا تو اللہ تعالی کو ۱۲۴۰۰۰ پیغمبر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ تھی، کوئی چیز اصلاح طلب تھی جسے درست کرنا درکار تھا۔

یہ درست ہے کہ فطرتِ انسانی کا ایک تقاضا اعترافِ ''توحید'' ہے لیکن بہت سے لوگ اللہ کے شریک بنانے لگتے ہیں۔ تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ ایک جواب ہے ''ابلیس''۔ لیکن اس جواب کو سمجھنے کے لیے قدرے توضیح درکار ہے۔ اس کی طرف ہم چندے بعد رجوع کریں گے۔ اس سوال کا ایک اور جواب منصبِ نبوت پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ انبیاء کی کوشش کیا ہوتی ہے؟ کارِ نبوت کیا ہے؟ اگر ہم نے یہ سمجھ لیا تو حل طلب مسئلہ زیرِ غور بھی صاف ہو جائے گا۔

ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ انبیاء کے پیغام کی دو سطحیں ہوتی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں ''شہادتین'' (دو کلمۂ شہادت) سے موسوم کیا گیا ہے۔ انبیاء کا اوّلین اور مرکزی پیغام ''توحید'' ہوتا ہے۔ ثانوی پیغامِ ہدایت یہ ہے کہ انسان اللہ کے نازل کردہ احکامات پر پوری طرح عمل کرے تاکہ اس کی زندگی میں ''توحید''

کے جملہ مضمرات اور تقاضے پوری طرح ثبات حاصل کر سکیں۔

اگر سرشتِ انسانی میں 'توحید' پہلے سے موجود ہے، اس کی فطرت اس کی معترف ہے تو پھر انبیاء کو اس پر اتنا زور دے کر خطاب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سوال کا ایک لفظی جواب ہے ''غفلت''۔ قرآن میں اس لفظ کا استعمال تقریباً ''نسیان'' forgetfulness کے مترادف کے طور پر ہوا ہے۔ ابلیس کی سرکشی اس کے گھمنڈ اور تکبر کی وجہ سے تھی۔ لغزشِ آدم کا باعث نسیان (بھول، فراموشگاری) تھا۔ آدم سے بھول ہوئی۔

وَلَقَدْ عَهِدْ نَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْلَهٗ عَزْمًا

(۲۰:۱۱۵)

اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی۔

آدم و ابلیس کا بنیادی فرق دیکھنا ہو تو اس ردِ عمل میں دیکھیے جو دونوں کی جانب سے عتابِ خداوندی کے جواب میں ظاہر ہوا۔ اللہ کے حکم سے باہر ہونے پر، اللہ کی نافرمانی پر جب ان سے باز پرس کی گئی تو ابلیس کا رویہ کچھ اور تھا، آدم کا جواب اور۔ ابلیس نے یہ ماننے ہی سے یکسر انکار کر دیا کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ الٹا اللہ تعالیٰ کو اپنی گمراہی کے لیے قصوروار ٹھہرانے لگا۔ آدم و حوا نے فوراً اس بات کا اعتراف کر لیا کہ ان سے خطا ہوئی، سو وہ دونوں اللہ سے مغفرت اور عفو و درگزر کے طالب ہوئے۔ پس انسان کی بھول چوک ایک اور شے ہے، شیطان کا انکار دوسری چیز۔ کسی معاملے میں بھول ہو جانا اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے سے انکار کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غفلت اور نسیان، لاپرواہی اور

بھول چوک میں کوئی خرابی نہیں۔ اس کے برعکس یہ نوعِ انسانی کی بنیادی خامی ہے۔ پس اسلام کے تصورِ انسان میں غفلت و نسیان جو کردار ادا کرتے ہیں وہ بعض اعتبار سے مسیحیت کے ''گناہ اصلی'' سے مشابہت رکھتا ہے۔ اللہ کو بھولنے کا مطلب ہے توحید فراموشی اور ''توحید'' کے بغیر انسان کے لیے نجاتِ اخروی نہیں۔

پہلے ذکر ہو چکا کہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر بات معاف کر دیتے ہیں سوائے ''شرک'' کے، دوسری کسی ہستی کو اپنا شریک قرار دینے کی کوئی معافی نہیں۔ اللہ کو فراموش کر کے انسان اس کا مقام کسی دوسری چیز کو دے دیتے ہیں۔ اس کی صفات کی نسبت اپنی ذات سے کرنے لگتے ہیں یا ان صفات کو عالمِ طبیع اور معاشرے کی قوتوں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ساری کائنات اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور اس کی نشانیاں ظاہر کرتی ہے۔ سو، غفلت ہو یا نسیان، ایک لحاظ سے، شرک ہی کے برابر ہیں۔ مندرجہ ذیل قرآنی ایات میں اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں اور جنات کا ذکر کیا ہے جو جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ان کا گناہ، ان کا جرم ہے ''غفلت'':

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷:۱۷۹)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند

ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔

غور کیجیے کہ ان لوگوں کو دیکھنے اور جاننے بوجھنے کے سارے وسیلے میسر تھے لیکن وہ ان کا کوئی استعمال نہیں کرتے تھے۔انہیں کیا دیکھنا تھا، کیا سننا تھا؟ اللہ کی نشانیاں، اس کی آیات۔ایسے لوگ عالمِ طبیعی پر نظر ڈالتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ قدرت کی ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔وہ مقدس کتابوں کی قرأت سنتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ کتاب پڑھنے والا انہیں اللہ کا کلام سنا رہا ہے، اللہ ان سے مخاطب ہے:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰:۹۲)

اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۰:۷-۸)

جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔انہی لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے، ان کے اعمال کے پاداش میں۔

جب انسان اللہ کی نشانیوں کا ادراک کرتا ہے تو اسے ہستیِ انسانی کی پوری حدود اور سارے احکامات کا شعور ہوتا ہے۔انہیں یاد رہتا ہے کہ انسان کہاں سے آیا ہے اور کدھر جا رہا ہے۔اگر وہ ان نشانیوں کو نظر انداز کر دے تو پھر وہ اس دنیا، اس سرائے فانی کے ظاہر میں، اس کی نمود ظاہری میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰:۷)

وہ اس دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔

ہم نے ذکر کیا تھا کہ موت کیا ہے، حقیقت سے دو چار ہونا، شعور کی ایک عظیم بیداری۔ لحۂ موت کے بعد انسان اپنے دیکھے اور سنے کو اس کے صحیح معنی میں دیکھنے اور سننے سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ پھر وہ اپنی بے خبری میں مگن رہنا چاہے بھی تو نہیں رہ سکتا۔ وہ کتنی ہی کوشش کرے کہ جہل و شادمانی کی سابقہ حالت پر لوٹ جائے اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اب اسے حقائقِ اشیاء سے نظریں چار کرنا لازمی ہو گا۔ دو فرشتے اسے حضورِ خداوندی میں لے جائیں گے:

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ۔ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۔ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۔ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۔ نِ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ (٥٠ : ٢١-٢٦)

اور ہر جان اس طرح حاضر ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہ۔ تو اس سے غفلت میں پڑا رہا تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا۔ تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے .... تم جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے حق پوش، معاند، خیر سے روکنے والے، حدود کو توڑنے والے، مبتلائے شک کو، جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بنا لیے۔

قرآن و حدیث میں نارِ جہنم اور غفلت کا گہرا تعلق کئی طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ متعدد آیات میں غفلت اور آگ میں جلنے کا باہمی ربط صراحت سے بیان ہوا ہے۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا

وَمَاْوٰکُمُ النَّارُ وَمَالَکُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۴۵:۳۴)

اور حکم ہوا آج ہم تم کو بھلا دیں گے جس طرح تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔

فَذُوْقُوْا بِمَانَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا اِنَّا نَسِیْنٰکُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۲:۱۴)

تو اب چکھو مزا اس بات کا کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تم کو بھلا دیا اور تم اپنے کیے کی پاداش میں اب ہمیشگی کا عذاب چکھو۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ غفلت اور نسیان بنیادی خامیاں ہیں کیونکہ ان سے توحید کی نفی ہو جاتی ہے بلکہ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خدا فراموشی کا مطلب ہے خود فراموشی کیونکہ انسان صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا۔ اللہ سے تعلق جاتا رہا تو گویا انسان کا اپنی حقیقت سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ بے حقیقتی کے گڑھے میں جا پڑتا ہے اور اس کا مطلب ہے ہر حقیقی اور اچھی چیز سے ایک اذیت ناک جدائی اور دوری کا تجربہ۔ قرآن نے اس صورتحال کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے:

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵۹:۱۹)

ان کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو خود ان سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ اصلی نافرمان ہیں۔

## ذکر

اگر غفلت اور نسیان انسان کی بنیادی خامیاں شمار ہوتے ہیں تو ذکر کو اس کی وہ

خوبی کہا جا سکتا ہے جو ہر خامی کی تلافی کر دیتی ہے۔ جس طرح خدا فراموشی انسان کو اس عذابِ الیم تک لے جاتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ بھی اسے بھلا دیتے ہیں اسی طرح اللہ کی یاد انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ اسے یاد کرنے لگتے ہیں:

فَاذْكُرُونِىٓ اَذْكُرْكُمْ (۲:۱۵۲)

تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔

تاہم ذکر سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ انسان اللہ کے سامنے اور اس کی ہدایت کے روبرو کیونکر عمل پیرا ہو۔ ذکر عنوان ہے منصبِ نبوت کا۔ کارِ نبوت ذکر ہی سے عبارت ہے۔

ذکر کے لفظ کے تین بنیادی مفہوم ہیں: تذکرہ کرنا، یاد کرنا، اور یاد آوری یا یاد دلانا۔ کسی شے کا زبان سے ذکر کرنا ایسا ہے جیسے اسے یادداشت میں لانا۔ اسے یاد کرنا، ذہن میں لانا۔ اگر اس لمحے دوسرے لوگ بھی موجود ہوں اور وہ اس شے کے بارے میں پہلے سے کچھ جانتے ہوں تو انہیں بھی وہ شے دوبارہ یاد آ جائے گی۔ انگریزی کا لفظ remembrance دونوں مفہوم رکھتا ہے "اپنے ذہن میں تازہ کرنا، یاد آوری" اور دوسرے شخص کو یاد دلانا"۔

اللہ تعالیٰ انبیاء بھیجتے ہیں کہ انسانوں کو "عہدِ الست" کی یاد دہانی کروائی جائے۔ انبیاء یہ کام کس طرح کرتے ہیں، آیاتِ خداوندی کی تلاوت کر کے، اس کی نشانیاں بتا کر اور یہ یاد دلا کر انسان پر اللہ کی عنایت کا کتنا بوجھ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ انبیاء کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اللہ کو یاد کرے۔ ذکرِ خداوندی کا یہ عمل

تقاضا کرتا ہے کہ انسان حمد و تسبیح میں اسے یاد کرے (یعنی ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' دونوں کا انتخاب کرے)۔

اس انداز میں عمل کرنے والے اہلِ ایمان ہوتے ہیں کہ ایمان کا مطلب ہے دل سے ''توحید'' کا اقرار اور یادداشت، زبان سے اس کا ذکر اور انبیاء کے ذریعے ملنے والے احکاماتِ خداوندی کی پیروی کے وسیلے اس کا اپنے عمل میں نفاذ۔

وہ لوگ جو درست جواب نہیں دیتے، صحیح ردِ عمل سے قاصر رہ جاتے ہیں وہ حق کو چھپانے والے ہیں، حق پوش ہیں Truth Concealers۔ وہ دل ہی دل میں اگرچہ حق کو پہچانتے ہیں لیکن زبان سے اس کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کی تعلیمات پر عمل کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ یہی مختصراً وہ چیز ہے جسے ہم کارِ نبوت اور انسانی جواب، نبی کی دعوت اور انسانی ردِ عمل کا رزمیہ کہہ سکتے ہیں۔ قرآن میں یہ سب کچھ ایک واضح انداز میں یا تو ''ذکر'' کے لفظ سے منسلک نظر آتا ہے یا ان الفاظ سے جو اسی مادے سے مشتق ہیں مثلاً ''ذکریٰ'' ''تذکرہ'' اور ''تذکُّر''۔ مثال کے طور پر بہت سی قرآنی آیات میں سے چند آیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ پہلی دو آیات اس تصور کو واضح کرتی ہیں کہ انسان کے لیے اللہ کا پیغام اصل میں یاد دہانی ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ۔ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ

(٤٠: ٥٣-٥٤)

اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا اہلِ عقل کی رہنمائی اور یاددہانی کے لیے۔

اِنْ هُوَاِلَّا ذِكْرٌوَقُرْآنٌ مُبِيْن (٣٦:٦٩)

یہ تو بس یاددہانی اور نہایت واضح قرآن ہے۔

اللہ کی طرف سے آنے والی یاددہانی کا درست جواب یادِ خدا اور ذکرِ الٰہی ہونا چاہیے۔قرآن نے بہت سی آیات میں ذکرِ خدا یا اسمِ خداوندی کے ذکر کا حکم دیا ہے۔اسمِ خداوندی کا ذکر نماز میں اللہ کے نام کا ذکر کرنے ہی کی طرح ہے۔ذکرِ الٰہی کا ثمر صرف یہی نہیں ہے کہ اگلے جہان میں اللہ تعالیٰ ذکر کرنے والے انسان کو یاد کریں گے۔ذکر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو اسی دنیا میں سکونِ قلب نصیب ہو جاتا ہے:

يـاَيُّهَـاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا و سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (٣٣:٤١)

اے ایمان والو!تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔اور اس کی تسبیح کرو صبح وشام۔

وَاذْكُـرِاسْـمَ رَبِّكَ بُـكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْلَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (٢٦-٧٥:٢٥)

اور اپنے رب کا نام صبح اور شام یاد کرو اور رات میں بھی اسے سجدہ کرو اور اس کی تسبیح کرو رات کے طویل حصے میں۔

فَـاِذَا قُـضِيَـتِ الـصَّـلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (٦٢:١٠)

پھر جب نماز ختم ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل ڈھونڈو اور اللہ کو بہت یاد کرو۔

وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ

(۱۳:۲۸-۲۹)

اللہ اپنی طرف رہنمائی ان لوگوں کی فرماتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سن لو کہ اللہ کی یاد میں ہی دل چین پاتے ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے خوشخبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔

انبیاء کی دعوت اور ان کی یاد دہانی کا غلط جواب، غلط انسانی رویہ یہ ہے کہ پیغامِ خداوندی کی صداقت کا انکار کر دیا جائے اور اپنے کاروبارِ دنیا میں مگن رہا جائے۔ ذرا مختلف نقطۂ نظر سے دیکھیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنے روزمرہ کے دنیاوی معاملات اور ذمہ داریوں میں بے تحاشا انہاک اور مشغولیت سے انسان یقینی طور پر غفلت میں پڑ جاتا ہے۔ دنیا میں زیادہ الجھاؤ غفلت شعاری کو جنم دیتا ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا

(۱۸:۵۷،۳۲:۲۲)

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات سے سمجھایا جائے اور وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لے۔

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ (۳۹:۲۲)

سو خرابی ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کے معاملے میں سخت ہو چکے ہیں۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّ مِنْ أَزْوَٰجِكُمْ وَأَوْلَـٰدِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ ۔ إِنَّمَآ أَمْوَٰلُكُمْ وَأَوْلَـٰدُكُمْ فِتْنَةٌ

(٦٤:١٤-١٥)

اے ایمان والوں! تمہاری اولاد اور تمہاری بیویوں میں سے بعض تمہارے لیے دشمن ہیں ..... تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے لیے) امتحان ہیں۔

اللہ کو فراموش کرنے کا مطلب ہے شیطان کے چھل فریب میں آ جانا، اس کے پھندوں میں گرفتار رہنا، کیونکہ انسان کو غفلت شعار بنانا ہی شیطان کی ساری کاوشوں کا حاصل ہے۔ یہاں بھی یہ نکتہ سامنے رہے کہ اس معاملے میں بھی شیطان اللہ کے حکم سے باہر خود مختار ہو کر کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ غفلت شعار انسانوں کو اللہ تعالیٰ خود اس کے اور اس کی ذریات کے حوالے کر دیتے ہیں۔

وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ ٱلرَّحْمَـٰنِ نُقَيِّضْ لَهُۥ شَيْطَـٰنًا فَهُوَ لَهُۥ قَرِينٌ (٤٣:٣٦)

اور جو کوئی الرحمٰن کی یاد سے آنکھیں چراتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اُس کا ساجھی بن جاتا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَٰلُكُمْ وَلَآ أَوْلَـٰدُكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ

(٦٣:٩)

اے ایمان والو! تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو لوگ یہ کام کریں تو وہی لوگ ہیں جو گھاٹے میں پڑے۔

یہاں اس نکتے پر زور دینا شاید ضروری ہے کہ ان آیات میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اسے سمجھنے کے لیے انسانی سرشت کے اسلامی تصور پر دوبارہ غور کر لینا چاہیے۔ انسان ہونے کا مطلب ہے فطرت پر پیدا ہونا یعنی ''توحید'' کی خِلقی اور پیدائشی شناخت۔ اس اعتراف و شناختِ توحید کو تمثیل کے طور پر ''عہدِ الست'' اور ''بارِ امانت'' کے قصوں میں بیان کیا گیا ہے۔اس فطرت، اس سرشتِ انسانی میں اوپر سے یا خارج سے کوئی اور چیز ایزاد نہیں کی گئی یہ وہی چیز ہے جس سے انسان انسان بنتا ہے۔لیکن یہ فطرتِ انسانی اس کی تربیت اور ماحول کی وجہ سے دھندلا جاتی ہے، اس پر گردِ غفلت کی تہ جم جاتی ہے اور پھر انسان انسان سے فروتر ہو جاتا ہے، مرتبۂ انسانی سے گر جاتا ہے۔ پھر وہ ''گونگا، بہرہ، اندھا ہو جاتا ہے۔ ڈھور ڈنگر کے مانند، بلکہ ان سے بھی بدتر، گمراہ تر''۔ ذکر وہ اہم ترین اور موثر ترین علاج ہے جو انسان کی اصل سرشت اور فطرت کو بحال کرتا ہے اور اسے حقیقت بناتا ہے۔ ذکر بیک وقت غفلت کے تدارک کے لیے اللہ کی رحمت سے ملنے والا وسیلہ بھی اور اللہ کی رحمت پر لبیک کہنے کا انسانی اسلوب بھی۔

ذکر کی اہمیت کا خلاصہ کرنے کے لیے ہم آخر میں چند قرآنی آیات مزید درج کر رہے ہیں۔ان آیات کی ایک خاص معنویت ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ خطاب ہے جو آدم کو زمین پر بھیجنے سے پہلے کیا گیا۔ یہ آیات ان ابتدائی ہدایات کا تذکرہ ہیں جو اللہ کے بندوں اور اس کے نائبین کو زمین پر اتارنے سے قبل جاری کی گئیں۔ اس میں انبیاء کی دعوت اور ان کے پیغام کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر اور قرآن مجید کے مشمولات کو سمیٹ کر بیان کر دیا گیا ہے:

ثُمَّ اجْتَبَٰهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا

جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى ۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى ۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ۔ قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنسَى

(۲۰:۱۲۲-۶)

پھر اس کے رب نے اس کو نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اسے راہ پر لایا۔ حکم ہوا کہ تم سب یہاں سے اُترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے! پس اگر تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ وہ گمراہ ہوگا نہ محروم رہے گا۔ اور جو میری یاد سے منہ پھیرے گا تو اس کی گذران تنگی میں ہوگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا، میں تو بینا تھا۔ کہا جائے گا: اسی طرح دنیا میں تیرے پاس ہماری آیات آئیں اور تو نے ان کو بھلا دیا سو آج تو بھی اسی طرح بھلا دیا جائے گا۔

## آیاتِ خداوندی کے روبرو

اللہ کے رسول اور اس کے نبی اللہ کی آیات اور نشانیاں لے کر آتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی ہر شے سے اللہ کی نشانیاں ہویدا ہوتی ہیں۔ اللہ کی نشانیوں کے روبرو صحیح انسانی رویّہ ہے اللہ کو یاد رکھنا۔ قرآن مجید میں بہت سے دوسرے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جن سے اشارہ ملتا ہے کہ ذکر اور یادِ خدا کیا ہے۔ یہ لفظ ہیں ''سننا''، ''دیکھنا''، ''سوچنا''، ''تدبر''، ''تفکر''،

''تعقل''۔ سب میں ایک نقطہ مشترک ہے کہ انسان وہ ہے جو نمودِ ظاہری سے دھوکا نہ کھائے ۔انسان کو یہ دنیا ''توحید'' کے سیاق وسباق میں دیکھنا چاہیے ۔انبیاء کا پیغام ساری ہستی کا پیغام ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اللہ کا بندہ اور خلیفۃ اللہ بننے کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔

آیاتِ خداوندی کے روبرو صحیح انسانی رویہ وعمل کے بارے میں قرآن نے جتنے لفظ استعمال کیے ہیں ان میں سے ہر ایک کے کچھ خاص مضمر مفہوم ہیں۔ یہاں ہم ان سب الفاظ کا تجزیہ تو ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے تاہم قرآن کے اسلوبِ بیان اور اس کے معانی کی ایک جھلک، ایک ذائقہ منتقل کرنے کے لیے چند نمائندہ آیات پیش کر رہے ہیں:

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (٦:١٢٦)

اور یہ تیرے رب کی راہ ہے سیدھی۔ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان کر دیں ہیں ان لوگوں کے لیے جو دھیان کرنے والے ہیں۔

كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ (٧:٥٨)

یوں ہم اپنی آیات پھیر پھیر کر بتاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر کرنے والے ہیں۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (٢:٢٦٦)

یوں اللہ تم کو اپنی آیات سمجھاتا ہے کہ شاید تم غور کرو۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (٣:١١٨)

ہم نے اپنی آیات تم کو جتادی اگر تم کو عقل ہے۔

اُنظُرْ كَيفَ نُصَرِّفُ الاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (٦:٦٥)

دیکھو ہم اپنی آیات کس کس طرح مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الآيٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (٦:٩٧)

ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کردی ہیں جو جاننا چاہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (٦:٩٩)

ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے کھول کر سنادی ہیں جو سمجھیں۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (١٠:٦)

بے شک دن اور رات کے بدلنے میں اور زمین و آسمان میں مخلوقاتِ خداوندی میں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ڈر رکھتے ہیں۔

هُوَالَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ والنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (١٠:٦٧)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ تم اس میں چین پاؤ اور دن دیا دکھانے والا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو سنتے ہیں۔

يُفَصِّلُ الاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (١٣:٢)

وہ کھول دیتا ہے اپنی آیات تا کہ تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرو۔

اَنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (١٤:٥)

بے شک ان کے اندر ثابت قدم رہنے والوں اور شکر کرنے والوں کے لیے

بڑی نشانیاں ہیں۔

وَمَآ اَنْتَ بِھٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْ

مِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۷:۸۱)

اور نہ تم اندھوں کو گمراہی سے پھیر کر راہ پر لانے والے بن سکتے۔ تم تو بس

انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں۔ پس وہی فرمابردار بنیں

گے۔

یادِ الٰہی، ذکرِ خدا اور اللہ کی نشانیوں پر غور کرنا اگر اہلِ ایمان کی علامتیں ہیں تو اللہ کی آیات کو نظر انداز کرنا، ان سے روگردانی، ان سے اعراض وہ چیزیں ہیں جن سے منکرینِ حق پہچانے جاتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کی جملہ مثبت صفات ذکرِ خدا کے وسیلے سے ظہور کرتی ہیں اور تمام منفی اوصاف غفلت اور انکار کے کارن اُبھرتے ہیں۔

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰:۹۲)

بے شک بہت سارے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ

(۲:۹۹)

اور ہم نے تم پر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں۔ ان کا انکار صرف عہد شکن

لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَھُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ

(۵:۷۵)

دیکھو کس طرح ہم ان کے سامنے اپنی نشانیاں کھول کر بیان کر رہے ہیں پھر دیکھو کہ وہ کس طرح اوندھے ہوئے جا رہے ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا

(٦:١٥٧)

تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے (دوسروں کو) پھیریں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ (١٨:٥٧)

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی نشانیوں کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے اور وہ اس سے منہ پھیر لیں اور اپنے کیے کو بھول جائیں۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۔ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا (٤٥:٧-٨)

ہلاکی ہے ہر اس لپاٹیے گناہگار کے لیے جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے کہ اس کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں۔ پھر وہ استکبار کے ساتھ اپنی روش پر ضد کرتا ہے گویا اس نے سنی ہی نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ (٦:٣٩)

اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ

اَبْوَابُ السَّمَآءِ (۷:۴۰)

بے شک جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔

## ہدایت اور گمراہی Guidance and Misguidance

کارِ نبوت اور اس کے جواب میں صحیح انسانی رویے کی نمائندگی اگر ''ذکر'' سے ہوتی ہے تو ''ہدیٰ'' (ہدایت Guidance) وہ صفتِ خداوندی ہے جو انبیاء میں مجسم ہو جاتی ہے۔ اس ایک لفظ میں دونوں پہلو، دونوں مفہوم سمٹ آئے ہیں یعنی انبیاء کو بھیجنے سے اللہ کی غرض اور اس دنیا میں انبیاء کا کام۔ اسی طرح اگر ''ذکر'' کا متضاد ہے ''غفلت'' اور ''نسیان'' تو ''ہدایت'' کا متضاد ہو گا بہکانا، بھٹکانا (اِضلال misguidance) اور گمراہ کرنا (اِغواء Leading astray)۔ جس طرح انبیاء اللہ کی طرف سے ہدایتِ مجسم ہوتے ہیں اسی طرح شیاطین خطا اور گمراہی کی صفت کی تجسیم کہے جا سکتے ہیں۔

انسان کے لیے ہدایت فراہم کرنے کا مطلب ہے اسے کوئی راہ دکھانا اور اس راہ پر چلا کر منزل تک لے جانا۔ یہاں جس راستے کا ذکر ہے اس سے مراد ہے وہ خاص تعلیمات اور احکامات جو ہر نبی کو دی جاتی تھیں بالخصوص وہ احکام اور شریعت جو سیدنا محمدؐ پر نازل کی گئی۔ وہ منزل جس کی طرف یہ راستہ انسان کو لے جاتا ہے نجاتِ اخروی اور جنت کی منزل ہے۔

نجات اور فلاحِ اخروی کیا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو وہاں ہو گی جہاں ہم ''معاد'' یا آخرت کی بحث کریں گے۔ اس وقت یہ عرض کریں گے کہ نجات کا

مطلب ہے اپنی فطرتِ حقیقی کی بنیاد پر انسانی مسرت وسعادت۔خوش ہونے کا مطلب ہے پوری طرح اپنا آپ بن جانا۔انسان کی تعریف اور شناخت صورتِ خداوندی کے حوالے سے ہوتی ہے کیونکہ انسان کو صورتِ الٰہی پر خلق کیا گیا۔پس خوشی اور تکمیلِ سعادت ان اسماء کو جاننے پر اور ان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے پر منحصر ہے جو آدم کو تعلیم کیے گئے۔

اسمائے الٰہیہ میں سے ایک نام "الہادی The Guide" بھی ہے چنانچہ کلمۂ توحید یہ تقاضا بھی رکھتا ہے کہ "لاھادی الا اللّٰہ" سب ہدایت اللّٰہ کی ہے اور انبیاء فقط اس کے نمائندوں کے طور پر کارِ نبوت انجام دیتے ہیں۔قرآن اور دوسری مقدس کتابیں اللّٰہ کی ہدایت کی زبانی اور تحریری صورت ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲۲:۵٤)

اور اللّٰہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔

وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا (۲۵:۳۱)

اور تیرا رب راہ دکھانے اور مدد کرنے کے لیے کافی ہے۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدَىٰ (۲:۱۲۰)

ان سے کہو: اللّٰہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔

مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي (۷:۱۷۸)

جسے اللّٰہ راہ دکھائے وہی راہ پانے والا بنتا ہے۔

وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ (۳:٤)

اور اتاری تھی تورات اور انجیل اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(۲۷: ۲)

یہ آیتیں ہیں قران اور کھلی کتاب کی۔ہدایت اور خوش خبری ایمان والوں کو۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۲: ۱۵۷)

یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت۔اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔

ہدایتِ خداوندی کا تعلق اس کی رحمت سے ہے جیسا کہ موخرالذکر آیت سے ظاہر ہے۔جب اللہ تعالیٰ انسان کو ہدایت دیتے ہیں تو اسے اسمائے رحمت و جمال کی تاثیر تلے لے آتے ہیں۔ہدایت کا نتیجہ ہے اللہ کا قرب۔قرآن میں جنت کے اعلیٰ ترین درجات کے باسیوں کو ''المقربون'' (جو قریب کیے گئے) کہا گیا ہے۔ قربِ خداوندی کا دارومدار ''توحید'' پر ہے جس سے انسان کا الحق سے صحیح تعلق استوار ہوتا ہے۔

ہدایت کے برعکس، گمراہی اور ضلالت کا قریبی تعلق قہر وغضب سے ہے۔وہ جو گمراہ ہیں وہ اللہ کی طرف رخ کرنے کے بجائے اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔اس طرح وہ اللہ سے دور اور دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ان پر سرگردانی و حیرت ، کثرت، جدائی، انتشار، لاتعلقی، بےاعتدالی اور زوال غلبہ پاتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ سے دور ہونے کا مطلب ان اسمائے الٰہیہ کے زیرِ تاثیر آنا جو اس کی تنزیہ، ماورائیت اور دنیا سے الگ، دور ہونے اور اس سے غیریت پر دلالت کرتے ہیں۔

گمراہی اور ضلالت کا منبع کیا ہے؟ بہ نظرِ ظاہر تو یہی کہا جائے گا کہ شیطان اس کا سبب ہے جو انسان کا کھلا اور بڑا دشمن ہے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قول یوں آیا ہے:

هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ

(۲۸:۱۵)

یہ ہوا شیطان کے کام سے۔ بیشک وہ کھلا دشمن ہے اور بہکانے والا ہے۔

قرآن ہی میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ گناہگار لوگوں کو حکم دیں گے کہ وہ اللہ سے اسی دوری اور بُعد میں پڑے رہیں جو انہوں نے اپنے لیے اختیار کی تھی:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۔ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۔ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۔ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ۔ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ (۳۶: ۵۹-۶۳)

اور اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ اور اے آدم کے بیٹو، کیا میں نے تمہیں کہہ نہیں رکھا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا! وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی پرستش کرنا، یہی سیدھی راہ ہے۔ اور وہ تم سے ایک خلقِ کثیر کو بہکا لے گیا۔ پھر کیا تم کو سمجھ نہ تھی؟ یہ ہے وہ دوزخ جس سے تم ڈرایا جاتا رہا ہے۔

ضلالت وگمراہی کے اسباب شیطان کے سوا اور بھی بتائے گئے ہیں۔ان میں ہوا وہوس Caprice بھی ہے۔اس وصفِ بد کا پہلے بھی ذکر ہوا تھا کہ ہوائے نفس تمام جھوٹے خداؤں میں سے بدترین ہے۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (٣٨:٢٦)

اور نہ چل جی کی چاہ پر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے۔

قرآن میں ہوا وہوس کا جس طرح نقشہ کھینچا گیا ہے اس کو مجموعی طور پر نظر میں رکھیے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ ہوا وہوس ہمارے اندر کے شیطان کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے ہوائے نفس کا تجربہ ہے جو ہمیں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر اڑا لے جاتی ہے اور کسی سمت میں بھی لے جائے اللہ کی ہدایت سے ہمیشہ دور ہی کرتی ہے۔ہوائے نفس کا الٹ ہے ''عقل'' Intelligence۔عقل ہمارے اندر کی وہ نورانی، اور ملکوتی قوت ہے جو اللہ کی ہدایت کو دیکھتے ہی شناخت کر لیتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نفسِ انسانی کا بھی ایک نبی ہوتا اور وہ ہے عقل۔

قرآن مجید نے انسانوں میں سے ایک شخص کو سراپا گمراہی کے طور پر پیش کیا ہے اور وہ ہے فرعون۔اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ قرآن کا فرعون ہر وہ صفت لیے ہوئے ہے جو شیطان سے خاص ہے بالخصوص غرور۔فرعون تکبر کی پوٹلی تھا۔قرآن میں اگر سیدنا موسیٰؑ کو نام لے کر ۱۳۶ مرتبہ یاد کیا گیا ہے تو ان کے سب سے بڑے دشمن فرعون کا نام بھی ۷۴ دفعہ آیا ہے۔قرآن میں دوسرے انبیاء سے زیادہ سیدنا موسیٰؑ کا ذکر ہے اور ظالموں اور مجرموں میں سے سب سے زیادہ تذکرہ فرعون کا کیا گیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں فرعون کے جن اعمال کا ذکر ہے انہیں ایسی تمام بری خصلتوں کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے جو کسی انسان میں پائی جاتی

ہوں۔فرعون کے خلاف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس نے اپنے لیے یہ کہ کر خدائی کا دعویٰ کیا:

فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹:۲٤)

میں ہوں رب تمہارا سب سے اُوپر۔

لیکن ہر وہ انسان جو اپنی ہوائے نفس کو اپنا خدا بنالیتا ہے اصل میں یہی دعویٰ رکھتا ہے اس لیے کہ جس چیز کو اس نے اپنا خدا بنایا وہ اس کا اپنا نفس ہی تو ہے۔

ہوائے نفس اور فرعون سے گمراہی کی نسبت کرتے ہوئے قرآن دراصل ان دونوں کو شیطانی صفات سے منسوب کرتا ہے کیونکہ ہوائے نفس اور فرعون میں ساری شیطانی صفات مجسم ہوگئی ہیں۔فرق یہ ہے کہ ہوائے نفس انسان کے باطن میں شیطان کی غمازی کرتی ہے اور فرعون انسانی معاشرے میں شیطان کا نمائندہ ہے۔

قرآن نے یہ بات صاف صاف بتادی ہے کہ شیطان انسانوں کا سب سے بڑا اور کھلا دشمن ہے۔شیطان کے لیے قرآن کی درجن بھر آیات میں "عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" (کھلا دشمن) کے الفاظ آئے ہیں۔تاہم یہ بات خاصی اہم ہے کہ قرآن نے کبھی بھی شیطان کو اللہ کا دشمن کہ کر نہیں پکارا اگر چہ آیات کا مفہوم اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ شیطان اللہ کا دشمن ہے کیونکہ قرآن ہی میں منکرینِ حق کو "اَعْدَاءُ اللّٰہ" (اللہ کے دشمن) کا نام دیا گیا ہے۔قرآن بآسانی شیطان کو اللہ کا دشمن بھی کہہ سکتا تھا کیونکہ کتنی ہی جگہ اسے انسان کا دشمن کہا گیا ہے اس سے اشارہ یہ ملتا ہے کہ یہاں قرآن مجید ایک ایسے نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے جس کا ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔ابلیس نے اگرچہ اللہ کی نافرمانی کی لیکن وہ آج بھی اللہ ہی کی ایک

خدمت انجام دے رہا کہ اسی کی وجہ سے ہمارے لیے خیر اور شر میں چناؤ کا امکان پیدا ہوتا ہے۔انسان کا شیطان سے بڑھ کر اور کوئی دشمن نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس کے لیے جہنم کا راستہ کھولتا ہے۔لیکن جہنم بھی تو اللہ کی ایک مخلوق ہے اور اسکی اور اس کی تخلیق کا بھی ایک مقصد ہے۔قرآن مجید میں صاف آیا ہے کہ جہنم کے اپنے کچھ حقوق ہیں:

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَئْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْد

(۵۰:۳۰)

جس دن ہم جہنم کو کہیں گے "کیا تم بھر چکی" اور وہ بولے گی، کچھ اور بھی ہے؟

شیطان نہ ہوتا تو دوزخ کو اہلِ دوزخ کیونکر فراہم ہوتے۔اسی طرح اگر شیطان کے پیدا کردہ چناؤ کا امکان نہ ہوتا تو اخلاقیات کی ساری قلمرو وجود میں نہ آتی۔کیونکہ اس صورت میں خیر اور شر کے درمیان امتیاز ہی قائم نہ ہو سکتا۔دراصل قرآن گمراہی اور ضلالت کی صفات کو صراحتاً خود اللہ تعالیٰ کے حوالے سے دیکھتا ہے۔صرف پانچ آیات ایسی ہیں جن میں گمراہی کی نسبت براہ راست شیطان کی طرف کی گئی ہے۔جبکہ تیس سے زیادہ آیات ایسی ہیں جن میں گمراہ کرنے کے فعل (اضل، یُضل) کا فاعل اللہ تعالیٰ کو بتایا گیا ہے۔

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (۷۴:۳۱)

اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور راہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (۱۴:۴)

پس اللہ جسے چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت دے۔

"مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَہُوَ الۡمُہۡتَدِیۡ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (۷:۱۷۸)

جسے اللہ راہ دے وہی راہ پائے اور جنہیں وہ بھٹکا دے وہی ہیں جو زیان میں ہیں۔

مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَا ہَادِیَ لَہٗ (۷:۱۸۶)

جسے اللہ بھٹکا دے اسے کوئی نہیں راہ دینے والا۔

بعض مسلمان علمائے الٰہیات کی طرف سے ہمیشہ یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ ان آیات میں جو بھٹکانے کی نسبت اللہ تعالی سے کی گئی ہے اس کی تفسیر اس انداز میں کی جائے کہ ان کے قائم کردہ تصورِ خوب اور ناخوب کا تحفظ کیا جا سکے۔ اللہ تعالی کے لیے کیا چیز موزوں ہے اور کیا نامناسب، اس کا ان علماء کے یہاں ایک اپنا تصور ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ اللہ تعالی کا دفاع کرنے چلے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالی کو لوگوں کے ذہن میں اٹھنے والے شکوک وشبہات سے بچانا لازم ہے یا پھر ان کا مسئلہ صرف اتنا ہے کہ چونکہ اللہ کے کلام کا یہ حصہ ان کے اپنے تصورِ اخلاق اور معیارِ اخلاقیات کے خلاف پڑتا ہے سو وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالی نے جو کہا اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ لیکن ابتدائی زمانوں کے بہت سے مسلمان مفکرین اس بات میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے کہ قرآن جو کہہ رہا ہے وہی سمجھا جائے بلکہ ان کے یہاں تو یہ نتیجہ بھی ملتا ہے کہ "الہادی" اللہ کا نام ہے تو "المضل" (گمراہ کرنے والا) بھی اسی کا نام ہے۔ اس نکتے سے الٰہیات کے کئی نازک مسائل یقیناً جنم لیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ نکتہ زیرِ غور آ ہی چکا ہے لہٰذا ہمارے لیے ان مباحث پر گفتگو کرنا ناگزیر ٹھہرتا ہے۔ لیکن اس بات کو چھیڑنے سے پہلے ذرا یہ دیکھ لیجیے کہ قرآن میں

اضلال اور بھٹکانے کی نسبت اللہ تعالیٰ سے کس انداز میں کی گئی ۔

ہدایت وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ سے خاص ہے۔اللہ کے سوا کوئی ہادی نہیں ۔ انبیاء جو دعوت دیتے ہیں اور جو پیغام لاتے ہیں اس میں بھی یہی صفتِ خداوندی اپنا ظہور کرتی ہے۔لیکن انبیاء کو اپنے طور پر انسان کی ہدایت کے لیے کوئی طاقت نہیں دی گئی ۔اگر انبیاء خود سے کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے تو انبیاء سے کمتر درجے کے فانی انسانوں کو دوسرے لوگوں کی ہدایت کا مرتبہ کیونکر حاصل ہو سکتا ہے ۔انبیاء خدا کے پیامبر ہوتے ہیں ۔اس کی بات لوگوں تک پہنچاتے ہیں لیکن ہدایت دنیا خود اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاحۡذَرُوۡا فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ (۵:۹۲)

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو۔پھر اگر تم پھر و گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کا ذمہ یہی ہے کہ کھول کر پہنچا دے ۔

وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ (۳:۲۰)

پھر اگر وہ ہٹ جائیں تو تمہارا ذمہ یہی ہے، پہنچا دینا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سیدنا محمدؐ اور دیگر انبیاء ھادی نہیں ہیں ۔وہ یقیناً ہادیانِ نوعِ انسانی ہیں۔

وَاِنَّکَ لَتَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (۴۲:۵۲)

اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

تاہم رسولِ خداؐ اللہ کے نبی کے طور پر لوگوں کے لیے سامان ہدایت فرماتے

تھے ایک عام آدمی کی حیثیت سے نہیں جسے اپنی ذاتی خواہش کی تکمیل مطلوب ہو!

فَمَنْ يَّهْدِىْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (۲۸: ۲۹)

سو کون سمجھائے جسے اللہ نے بھٹکایا۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۲۸: ۵٦)

تم جن کو چاہو، راہ پر نہیں لا سکتے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے راہ پر لاتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۳: ۴۰)

تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے یا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے یا ان کو جو صریح غلطی میں بھٹکتوں کو؟

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (۴: ۸۸)

کیا تم چاہتے ہو کہ ان کو راہ پر لاؤ جن کو بچلایا اللہ نے؟ اور جس کو اللہ راہ نہ دے تم اس کے لیے کوئی راہ نہ پاؤ گے۔

قرآن میں اگر ایک طرف بھٹکانے، بچلانے کی نسبت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے تو دوسری جانب وہ گمراہی کے لیے خود ان لوگوں کو مورد الزام ٹھہراتا ہے جو بھٹک کر گم کردہ راہ ہو گئے کیونکہ اللہ صرف ان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو غلط کار اور ظالم ہوتے ہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ

مَّا يَتَّقُوْنَ (۹:۱۱۵)

اور اللہ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو راہ پر لا کر پھر سے گمراہ کر دے جب تک وہ ان پر وہ چیزیں کھول نہ دے جن سے ان کو بچنا ہے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ (۴۰:۷۴)

اسی طرح اللہ منکروں کو بھٹکاتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ (۴۰:۳۴)

اسی طرح بھٹکاتا ہے ان لوگوں کو جو زیادتی کرنے والے، شک میں پڑے ہوتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ انہیں گمراہ کرتا ہے جو ایمان نہیں رکھتے، جو جان بوجھ کر اور عملی طور پر انبیاء کے پیغام کی صداقت کا انکار کرتے، اسے چھپاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو جھٹلاتے اور ان کی ناشکری کرتے ہیں۔ ظالمین اور اہلِ خطا اپنی گمراہی کا دوش اللہ کو نہیں دے سکتے نہ اس کے لیے شیطان کو ہدفِ ملامت بنا سکے ہیں۔ قرآن کا بیان ہے کہ قیامت کے روز شیطان اپنے پیچھے چلنے والوں سے ان الفاظ میں خطاب کرے گا:

اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۱۴:۲۲)

بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے وعدہ دیا پھر اس کے خلاف کیا۔ اور میری تم پر حکومت نہ تھی، بس میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے مان لیا۔ سو مجھے الزام مت دو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

# ظلم Wrongdoing

انسان کو اگلے جہان میں اگر بدبختی اور انجام کی خرابی کا سامنا کرنا پڑے تو اس کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی۔ قرآن میں یہ موضوع بار بار آیا۔ مثال کے طور پر ''ظلم'' کے تصور کو لیجیے۔ یہ وہ لفظ ہے جو قرآن میں سب سے زیادہ وارد ہونے والی اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ قرآن اس لفظ کو عام طور پر ان تمام بری حرکتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جو اولادِ آدم سے سرزد ہوا کرتی ہیں۔ ہم پہلے عرض کر چکے کہ ''ظلم'' عدل کا الٹ ہے اور عدل کا مطلب ہے ہر شے کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنا۔ پس ''ظلم'' کی تعریف یہ ٹھہری کہ چیزوں کو بے جگہ کرنا، انہیں وہاں رکھنا جہاں انہیں نہیں رکھا جانا چاہیے۔ مثلاً اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔ اللہ کے سوا کوئی شے مقامِ خدائی پر نہیں رکھی جا سکتی۔ ظلم کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ہم جھوٹے لفظوں کو سچے لفظوں کی جگہ دے دیں۔ یا کسی اور کا مال اپنے مال کی جگہ رکھ لیں۔ یا کسی حرام یا مباح کام کو فرض قرار دے دیں۔ جیسے نماز پڑھنے کی بجائے فریضہ صلوۃ کے طور پر کوئی اور کام انجام دینا۔

انسان ظلم کس پر کرتا ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے خلاف کسی کے لیے بھی ظلم کرنا ممکن نہیں۔ ہر شے اس کی مخلوق ہے اور ہر چیز کارِ خداوندی کی بجا آوری میں مشغول ہے۔ پس ظلم ایک ایسا کام ہے جس کی زد میں انسان ہی آتے ہیں۔ تاہم آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ میں اگر ایک وقت نماز نہ پڑھوں تو اس سے کسی انسان پر کیا ظلم ہوگا؟ نماز تو میرے اور خدا کے درمیان ایک چیز ہے۔ اگر نماز نہ پڑھنا ظلم ہے تو پھر کیا اس معاملے میں نماز نہ پڑھ کر میں اللہ کے ساتھ ظلم کر رہا ہوں۔ قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق معاملہ سرے سے یوں ہے ہی نہیں۔ نماز نہ پڑھنے

کی صورت میں ظلم کا شکار صرف وہی شخص ہوتا ہے جس نے نماز ترک کی ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے مخلوق سے بے نیاز ہے۔ مخلوق اس کی ضرورت نہیں۔ اس کا اس میں کیا فائدہ ہے کہ چند لوگ گروہ بنا کر ایک جگہ اکھٹے کھڑے ہو جائیں، اکٹھے جھکیں اور اپنی زبان سے کچھ الفاظ دہرائیں جنہیں وہ خود بھی نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت اپنے کسی فائدے کے لیے نازل نہیں فرمائی۔ انسان کے فائدے کے لیے مقرر کی ہے۔ اس کے وسیلے سے انسان کی مدد کی جا رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو درجہ بدرجہ خیر کی جانب اور حقیقت سے سازگاری کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ جب انسان اس کے احکامات پر عمل کرنے سے گریز کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ناشکری اور کفر کر رہا ہے۔ یہی وہ ظلم ہے جو انسان اپنے ساتھ روا رکھتا ہے۔

قرآن میں جن ۲۵۰ مقامات پر ظلم یا ظالم کے الفاظ آئے ہیں ان میں سے صرف ۲۵ جگہوں پر قرآن نے اس چیز کا ذکر کیا ہے جس پر ظلم کیا گیا۔ ایک آیت میں لوگوں کے ظلم کا نشانہ بننے کا ذکر ہے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ(۴۲:۴۲)

الزام ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔

ایک اور آیت میں ظلم کا ہدف آیاتِ خداوندی یا اللہ کی نشانیاں ہیں۔ عالمِ طبیعی میں ہوں یا اللہ کی کتابوں میں، اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں انسان کی ہدایت کے

لیے ظاہر کرتے ہیں۔ جب انسان ان نشانیوں سے روگردانی کرتا ہے، انہیں نظر انداز کرتا ہے تو گویا ان پر ظلم کرتا ہے۔ ان آیاتِ خداوندی سے ظلم کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ یہ بات وہ روزِ قیامت اچھی طرح جان لے گا جب نتیجہ اس کے سامنے آئے گا اور اس کے اعمال میزان میں رکھے جائیں گے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِالْحَقُّ • فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ • وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (۷:۸-۹)

اس دن وزن دار صرف حق ہوگا پھر جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے سو وہی لوگ ہیں جن کا بھلا ہوا۔ اور جن کے پلڑے ہلکے ہوئے سو وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اس لیے کہ وہ ہماری آیات سے زبردستی کرتے تھے۔

باقی کی ۲۴ آیات میں جہاں جہاں ظلم کا ذکر آیا ہے وہاں بتا دیا گیا ہے کہ ظلم کرنے والے محض اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی قرآن بار بار اس بات کو زور دے کر بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اگر انسان اپنی غلط کاری اور اعمال بد کے نتیجے میں برے نتائج سے دوچار ہوتے ہیں، دکھ جھیلتے ہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ کا دوش نہیں۔ وہ اپنے لیے خود باعثِ وبال بنتے ہیں اپنے سر مصیبت خود لاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ قرآن نے خاص خاص مثالیں دے کر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انسان کے ہاتھ سے ہونے والے ظلم کا کوئی اثر اللہ تک نہیں پہنچتا۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۲:۵۷)

اور انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰:۴۴)

اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ (۱۱:۱۰۱)

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جان پر ظلم کر گئے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴:۱۱۰)

اور جو کوئی گناہ کرے یا اپنا برا کرے پھر اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، مہربان پائے گا۔

قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کو یہ جاننا لازم ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کا نتیجہ یا تو اس کے خلاف جاتا ہے یا اس کے حق میں۔ وہ کچھ بھی کر لے اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اس کا کوئی عمل اللہ کے لیے کسی منفعت کا سبب نہیں بنتا۔ وہ "غنی عن العالمین" ہے اور کسی مخلوق کا کیا ہوا کوئی کام اس کے لیے کوئی تاثیر نہیں رکھتا۔ ثواب اور عتاب، کامیابی اور ناکامی، نجات اور گرفتاری کا کھیل انسان صرف اپنے فائدے نقصان کے لیے کھیلتا ہے۔

اس معاملے میں گویا اللہ تعالیٰ انسان کو میدانِ عمل میں اتار کر اسے تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں اور اپنی رحمت اور کرم سے اسے ہمت دلا کر اس کا حوصلہ تو بڑھاتے ہیں لیکن میدانِ عمل میں فیصلہ کرنا اور صحیح اور غلط میں چناؤ انسان پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انسان کو جو "بارِ امانت" دیا گیا ہے وہ جب تک اس کے کندھوں سے اٹھا

نہ لیا جائے اسے صحیح فیصلہ کرنے اور درست چناؤ کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر یہ "بارِ امانت" اٹھا لیا جائے تو پھر انسان انسان نہیں رہتا۔ اس بارِ امانت کے بنا انسان زمین، آسمان اور پہاڑوں کی طرح ہو جائے گا جو اس امانت کی تاب نہ لا سکے اور اس بارِ گراں کو اٹھانے سے گریزاں ہو گئے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (٤:١١١)

اور جو کوئی گناہ کماتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آتا ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (١٠:١٠٨)

سو جو کوئی راہ پر آئے تو وہ اپنے بھلے کو راہ پاتا ہے اور جو کوئی بھولا پھرے، سو وہ بھولا پھرے گا اپنے برے کو۔ اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں۔

وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّىْ غَنِىٌّ كَرِيْمٌ (٢٧:٤٠)

اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی سو میرا رب بے پروا ہے، کریم ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (٢٩:٦)

اور جو کوئی محنت اُٹھاتا ہے تو اپنے ہی واسطے اُٹھاتا ہے۔ اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ان تمام نکات کو نہایت خوبصورتی سے سمیٹ کر بیان کر دیتی ہیں جو ہم نے گذشتہ سطور میں آپ کے سامنے پیش کیے۔

آیات کا مفہوم پوری طرح واضح کرنے کے لیے ہم نے ہر آیت کے بعد اس کی مختصر شرح بھی درج کر دی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۰ اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۰ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ (۱۷-۱۵ :۳۵)

اے لوگو! تمہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ وہی ہے بے پروا، سب خوبیوں سے سراہا۔ اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور ایک نئی خلقت لے آئے۔ اور یہ اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی کوئی احتیاج نہیں۔ مخلوقات ہر چیز میں اللہ کی محتاج ہیں۔ اللہ چاہے تو ساری کائنات کو نیست و نابود کر کے اس کی جگہ ایک اور دنیا خلق کر دے۔ یہ مٹی کے ذرے، یہ گرد راہ، جو خود کو بہت اہم اور لابدی گردانتے ہیں اللہ کے لیے کسی مصرف میں نہیں، اللہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَۃٌ اِلٰی حِمْلِھَا لَا یُحْمَلْ مِنْہُ شَیْءٌ وَّلَوْ کَانَ ذَاقُرْبٰی (۱۸ :۳۵)

اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور اگر کوئی بوجھوں مرتا اپنا بوجھ بٹانے کے لیے کسی کو پکارے تو اس میں کوئی کچھ نہ اٹھائے گا خواہ اس کا قریبی ہی کیوں نہ ہو۔

ہر انسان اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے۔ انسان کے عمل کی ذمہ داری نہ اللہ پر ہے نہ نبیوں پر نہ دوسرے کسی انسان پر۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ

(۳۵:۱۸)

تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔اور جو پاکی حاصل کرتا ہے اپنے لیے کرتا ہے۔

سیدنا محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم اللہ کا پیغام ہدایت لے کر آئے لیکن ان کی بات پر کان دھرنے والے وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے دین کے پانچ ارکان کی پابندی کی۔ہر وہ اچھا کام،وہ نیک عمل جو وہ کریں گے وہ انہیں برائی اور ظلمت سے پاک کرنے کی تاثیر رکھے گا اور اس کا سارا فائدہ صرف انہی کو پہنچے گا۔

وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ • وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ • وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ • وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ • وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۳۵:۱۸-۲۲)

اور اللہ کی طرف سب کی واپسی ہے۔نابینا اور بینا دونوں یکساں نہیں ہوں گے اور نہ تاریکی اور روشنی،اور سایہ اور دھوپ یکساں ہیں۔اور نہ زندہ اور مردے یکساں ہوں گے۔

ہستیِ انسانی کا سارا رزمیہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھلتا پھیلتا اور اپنے انجام کو پہنچتا ہے کہ اللہ ہی ہر حقیقت،حکمت،خیر اور عدل کا منبع اور مصدر ہے۔انسان اپنی حقیقی صورت حال،اپنی حیثیت سے کیسا ہی بے خبر کیوں نہ ہوا سے بہت جلد اس حقیقت سے آنکھیں چار کرنا ہوں گی۔اس لمحے وہ جان لے گا کہ الحق،دیکھنے والی آنکھ اور

دیکھنے کو اندیکھا کرنے والے کور چشم کو ایک دوسرے سے چھانٹ کر کیسے الگ الگ کر دیتا ہے کہ بصارت صفاتِ خداوندی میں سے ہے اور بے بصری عدمِ حقیقت کا وصف ہے۔ بے حقیقت ہونے کا نام۔ انسان اگر آج الحق کو دیکھنے کی صلاحیت حاصل نہ کر سکا تو اپنی ہستی کی آئندہ منزلوں میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ اسی طرح اگر انسان آج نور سے بہرہ یاب نہ ہوا تو آئندہ بھی تیرگی اور ظلمت میں گھرا رہے گا۔ اگر اسے وہ راحت بخش اور خنک سکون و سلامتی نصیب نہ ہو جو اعتدال، سازگاری اور توازن سے جنم لیتا ہے تو انسان اس جھلسا دینے والے زوال و ہلاکت کا شکار ہو جاتا ہے جو بے اعتدالی اور عدمِ توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اسے وہ زندگی نہ مل سکے جو حق کی آگہی کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے تو انسان ہمیشہ جہالت کی مردنی میں مبتلا رہتا ہے۔

آخر الامر یہ سارا رزمیہ لوٹ کر اللہ کی ہدایت اور عدمِ ہدایت کی طرف واپس آ جاتا ہے۔ انسان کی آزادیِ اختیار ایک بہت حقیقی چیز ہے اور انسان کے لیے اس کی اہمیت حتمی اور لابدی ہے تاہم سب تجزیہ اور جائزہ ہو چکے تو کہنا یہی پڑتا ہے کہ ہر فرد کے لیے پیمانۂ تقدیر میں کیا معین کیا گیا ہے، اس کا فیصلہ الحق کی طرف سے ہوتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَآءُ وَمَآ أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۞ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيْرٌ (۳۵:۲۲-۲۳)

اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سناتا ہے۔ اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں میں پڑے ہیں۔ تو تم بس ڈرا کر خبر دینے والے ہو۔

لوگ اگر حق کے لیے مردہ ہو چکے ہوں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پھر سے زندہ نہیں کر سکتے۔ مارنا اور جلانا الحق کا کام ہے۔ وہی زندگی دیتا ہے اور وہی اسے ختم کر دیتا ہے۔

## دستِ قدرت God 's Two Hands

گمراہ کرنے کے فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے گہرے اور نازک سوالات جنم لیتے ہیں۔ اسلامی علوم کے روایتی نظام میں اس نوع کے سوالات کو عموماً ان ماہرین سے مخصوص سمجھا جاتا ہے جو طلبِ علم کی بلندترین منزلیں طے کر رہے ہوں۔ یہ منتہی جویائے علم ہی ان مشکل سوالوں سے نبرد آزما ہونے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے لیے تو یہ نکتہ سمجھ سے باہر ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے تو پھر وہ انسان کو گمراہ کیونکر کر سکتا ہے۔ تاہم اس سوال کو ہم کسی اور شخص سے جواب حاصل کرنے کے انتظار میں موخر نہیں کریں گے اور یہ عرض کرنے کی کوشش کریں گے کہ مسلمان مفکرین نے ہدایت اور گمراہی دونوں کو کس طرح اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے اور اس الجھن کا کیا حل پیش کیا ہے۔ یہ دکھانا آسان ہے کہ اس معاملے میں قرآن کا بنیادی مؤقف ''توحید'' کی اساس میں کارفرما تصورات یعنی ''تشبیہ'' و ''تنزیہ'' سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

اضلال و ہدایت کے مسئلے سے متعلق جتنے مباحث ہیں ان پر اگر بے لاگ انداز میں بے تعصب ہو کر غور کرنا مقصود ہو تو اس عام فکری رجحان سے پیچھا چھڑا کر سوچنا مفید ہوگا جس کے تحت اللہ تعالیٰ کو اپنے انسانی معیارِ خوب و ناخوب کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے اور صحیح اور غلط کا یہ پیمانہ بالعموم اپنے زمانے کی سوچ اور اسی کے اندازِ فکر سے متعین کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں انسان کے

خیالات وتصورات کو اسلام جس نظر سے دیکھتا ہے اسے مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

ہم اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنی فہم اور سمجھ بوجھ سے کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تنزیہ اور ماوراء ہونے کے سبب ہماری استعدادِ فہم سے بے انتہا دور ہے۔ ہماری سوچ اس تک پہنچ نہیں سکتی۔ ہاں اللہ کے پیمانے پر، اس کے مقرر کردہ معیار پر انسان کو جانچنا ممکن ہے کیونکہ وہ ساری کائنات کا خالق ہے، رب العالمین ہے۔ یہ معیار، جانچ اور پرکھ کے یہ پیمانے مسلمانوں کے پاس قرآن مجید اور احادیثِ رسول ؐ کی صورت میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی شے سے مشابہ نہیں، منزہ ہیں لہٰذا انسان کے لیے خدا کو پوری طرح سمجھنا ممکن نہیں۔ یہ کہ کر ہم پردۂ اسرار کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش نہیں کر رہے نہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں مسلمان کو بے چون و چرا تسلیم کر کے خاموش رہنا چاہیے۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، فہم کی گرفت میں لانے کی سعی کرنا اچھی بات ہے بشرطیکہ انسان کو اپنی حدود کا علم ہو، اپنی نارسائی کا احساس ہو نیز سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے صحیح مآخذ سے رجوع کیا جائے۔

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

(۲:۱۸۹)

گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

ہم نے گذشتہ صفحات میں عرض کیا تھا کہ تخلیق آدم کے وقت جب ابلیس نے

اللہ کے حکم سے سرتابی کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے اس ہستی کے سامنے سجدہ کرنے سے کیوں انکار کیا ''جسے میں نے اپنے دو ہاتھوں سے بنایا تھا'' (لما خلقت بیدی) قرآن میں اللہ کے ''دو ہاتھوں'' کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ آیت ہے جو ہم نے درج کی۔ بہت سے مفسرین کی ان آیات کے بارے میں رائے یہ ہے کہ ان آیات میں ایک ایسے تصور کی جانب اشارہ ہے جس کے مضمرات اور معانی کی چھوٹ ساری کائنات پڑتی ہے اور مسئلہ خیر و شر کی تمام سطحوں کو متاثر کرتی ہے۔

اللہ کے یہ ''دو ہاتھ'' کیا ہیں؟ قرآن مجید کی سورت ۵۶ کی جن آیات میں ''اصحاب الیمین'' (۵۶:۲۷) اور ''اصحاب الشمال'' (۵۶:۴۱) کا ذکر آیا ہے ان سے اس نکتے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ''اصحاب الیمین'' (دائیں ہاتھ کے ساتھی) اہلِ جنت ہیں اور ''اصحاب الشمال'' (بائیں ہاتھ والے) اہلِ دوزخ۔ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جسے ''السابقون'' The Foremost (سب سے آگے بڑھے ہوئے) لوگ کہا گیا ہے۔ (۵۶:۱۱) یہ لوگ اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال دونوں پر سبقت لے گئے اور ان لوگوں کی صفات میں شامل ہو گئے جنہیں قریب کیا گیا ''المقربون''۔

بہت سے مسلم مفکرین کی رائے ہے کہ اللہ کے دو ہاتھ، جن سے اللہ نے آدم کی تخلیق کی، کنایہ ہیں صفاتِ خداوندی کی ان دو بنیادی اقسام کا جو انسان کی تشکیل اور صورت گری میں کارفرما ہوئیں۔ یہ دو اقسامِ صفات ہیں۔ صفاتِ جمال اور صفاتِ جلال یا صفاتِ رحمت اور صفاتِ غضب یا ''تشبیہ اور تنزیہ''۔ ''اصحاب الشمال'' جہنم میں اس لیے ہیں کہ ان پر صفاتِ جلال کا غلبہ ہے جس کا تقاضا ہے اللہ

کی ان سے دوری۔اصحاب الیمین جنت میں بستے ہیں کیونکہ ان کی تخلیق میں جو صفات غالب رہی ہیں وہ اسمائے رحمت و جمال ہیں اور یہ اللہ کے قرب کی موجب ہیں۔[۲۴]

سوال کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں سے بعض کو اپنے سے دور کیوں رکھتے ہیں کہ وہ تکلیف میں پڑیں۔یہ ایسا ہی ہے کہ یہ پوچھا جائے کہ اللہ کے دو ہاتھ کیوں ہیں، دایاں ہاتھ اور بایاں ہاتھ۔یاد رہے کہ سوال کے دو حصے ہیں اور سوال کا دوسرا حصہ اصل میں پہلے ہی کی تکرار ہے۔اللہ تعالیٰ لوگوں کو تکلیف میں کیوں رکھتے ہیں؟ یہ سوال ہم معنی ہے اس سوال کا کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں سے بعض کو اپنے سے دور کیوں رکھتے ہیں۔اللہ سے دور ہونے کا مطلب ہے بنیادی صفاتِ خداوندی کے پرتو سے محروم ہونا یعنی وحدت، حقیقت، کمال، اتمام، رحمت اور نورانیت کا فقدان۔ہر وہ شخص جو ان صفات سے محروم ہو اس پر کثرت، تفرقہ، عدمِ توازن، بے حقیقتی، شر اور ظلمت چھا جاتی ہے۔ان صفات کو اگر نفسِ انسانی کی کیفیات کا بیان بنا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب صفات بے اعتدالی، عدمِ توازن، انتشار، بکھراؤ، تکلیف بلکہ دیوانگی تک کا تقاضا کرتی ہیں۔

پس سوال کی تہ سے ایک اور سوال ابھرتا ہے کہ کوئی شے اللہ سے دور کیوں ہوتی ہے؟ پہلا جواب ''تنزیہ'' کا جواب ہے: ہر شے اللہ سے دور ہے کیونکہ اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔صرف اللہ تعالیٰ ہی حقیقی ہے، نورانی ہے، اللہ کے سوا ہر شے بے حقیقت بھی اور ظلمانی بھی۔

''تشبیہ'' کے پہلو سے دیکھیے تو یہ نظر آئے گا کہ کائنات کی اشیاء کی نسبتیں اور رشتے اللہ تعالیٰ سے گونا گوں ہیں۔ان میں سے کچھ اللہ سے قریب ہیں اور کچھ اللہ

سے دور۔ اللہ سے مطلقاً قریب کوئی بھی نہیں کہ یہ صرف خود اللہ ہی کا مرتبہ ہے۔ اللہ سے مطلقاً دور بھی کوئی نہیں کیونکہ ایسی کوئی شے وجود ہی نہیں پاسکتی۔ اسے حقیقت ہی نصیب نہ ہو سکے گی کیونکہ حقیقت اوّل و آخر اللہ ہی کی ہے۔

نزدیکی اور دوری کی شناخت کیسے ہوتی ہے۔ قرب اور بُعد کا فیصلہ کیونکر ہوتا ہے؟ اللہ کی صفات کو منعکس کرنے والا، اس کی صفات کا مظہر اللہ سے قریب ہے۔ فرشتے اللہ کے قریبی ہیں کہ وہ نور سے خلق کیے گئے جبکہ جسمانیت رکھنے والی مادی اشیاء اللہ سے دورتر ہیں کہ ان کی تخلیق آب و گل سے ہوئی۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر ہر شے کو نور سے کیوں نہیں تخلیق کیا گیا؟ جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ ہر شے کی تخلیق تو نور ہی سے ہے فرق صرف یہ ہے کہ نور کہیں زیادہ ہے کہیں کم۔ نور کی تابندگی الگ الگ ہے۔ نور جب بہت مدھم ہو جائے تو اسے آگ کہتے ہیں۔ جب نور دھیما ہوتے ہوئے اتنا کم ہو جائے کہ آپ اسے نور کے طور پر بمشکل پہچان سکیں تو اسے مٹی کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل نور کے سوا اور کچھ ہے نہیں کیونکہ ظلمت محض فقدانِ نور کا نام ہے۔ پس عرصۂ ہستی کی ہر شے نور کی ایک کرن، نور کی ایک جھلک کی نمائندہ ہے۔ ظلمت کہیں نہیں پائی جاتی۔

قارئین کو اگر نور کی تمثیل پر مبنی جواب تسلی بخش معلوم نہ ہو تو ہم اسمائے صفاتی میں سے کسی ایک نام کو لے کر یہی استدلال قائم کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فرشتے اللہ سے قریب اور اجسامِ مادی اللہ سے دور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بلاواسطہ مظہر ہیں جبکہ اجسام مادی میں کوئی علم ہے ہی نہیں جس کا ذکر کیا جا سکے۔ تاہم آخری تجزیے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ پتھروں تک میں علم ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ظہورِ علم کے درجات الگ الگ ہیں، پس ہمیشہ

ایسا ہوتا رہا ہے کہ ایک شے (یا ایک شخص) کو زیادہ علم میسر ہے جبکہ دوسرے کسی کو تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَفَوۡقَ كُلِّ ذِىۡ عِلۡمٍ عَلِيۡمٌ

اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔

پس ہر صاحبِ علم سے فروتر کوئی اور بھی ہوگا جو اس اتنا علم بھی نہیں رکھتا۔ آپ اعتراض کے طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ بھلا پتھر میں کیا علم ہوگا، جواباً ہم یہ کہیں کہ پتھر کو بخوبی علم ہے کہ اسے اپنی جگہ کیسے جما رہنا ہے۔ یہی نہیں پتھر کا شمار بھی اس ''ہر شے'' میں ہوتا ہے جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۱:۵۷)

زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے۔

جس شے کو اللہ کا علم ہی نہ ہو وہ اس کی تسبیح کیا کرے گا؟ یہ مانا کہ پتھر کا علم ہمارے علم کے مانند نہیں ہے لیکن ہمارا علم بھی تو اللہ کے علم کی طرح نہیں ہے اور اس کے باوجود ہم اپنے لیے بھی یہی علم کا لفظ بولتے ہیں اور اللہ کے لیے بھی۔

اپنے اصل سوال کی طرف لوٹ کر دیکھیں کہ آخر اللہ تعالیٰ بعض مخلوقات کو اپنے سے دور کیوں رکھتا ہے؟ گزشتہ بحث کی روشنی میں اگر یوں کہا جائے تو باعث تعجب نہ ہوگا کہ اس سوال کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ایک سی نورانیت، ایک سے علم، یکساں حیات یا یکساں قوتِ گویائی کے ساتھ کیوں نہیں پیدا کیا؟ پہلا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ یوں کر دیتے تو پھر مخلوقات کی یہ رنگا رنگی اور تنوع کیونکر پیدا ہوتی۔ پھر تو صرف ایک ہی مخلوق ہوا کرتی۔ نتیجہ کیا ہوتا؟

یا دوسرے لفظوں میں کہیے تو یوں ہوگا کہ ایک مخلوق روشن و منور ہے جبکہ دوسری تیرہ و تاریک۔ یہ سچ ہے کہ تاریک مخلوق بھی نور کے مکمل فقدان کے مقابلے میں قدرے حاملِ نورانیت ہے جیسا کہ دیا سلائی کی ایک جلتی ہوئی تیلی شبِ تاریک کے مقابلے میں روشن تر ہوتی ہے لیکن یہ تیلی بجلی کے کوندے کے مقابلے میں تاریک ہے، ۱۰۰ واٹ کے بلب، چاندنی روشنی، سورج کی شعاعوں وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا! روشن ہونا اور تاریک ہونا اضافی معاملہ ہے۔ جیسا کہ علم اور جہل، موت و حیات، گویائی اور خاموشی، طاقت اور کمزوری، سعادت و شقاوت سب اضافی معاملات ہیں۔

اب آیئے اپنے نقطۂ آغاز کی طرف۔ ہدایت اور گمراہی کا مسئلہ۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو ہدایت کیوں دیتے ہیں اور بعض لوگوں کو گمراہی میں کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ پوچھئے تو یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ میں صفاتِ تشبیہ اور صفاتِ تنزیہ دونوں کیوں ہیں؟ وہ رحمٰن و رحیم اور صاحبِ قہر و غضب ہر دو کیوں ہے؟ آخر وہ صرف رحمت والا اور مہربان کیوں نہیں ہے؟ جواب واضح ہے، ایسا ہوتا تو پھر وہ خدا کہاں رہتا!

خدا وہ حقیقت ہے جس میں ہر حقیقی، مثبت، اچھی اور مفید چیز موجود ہے اور جو اس لامحدود کائنات کی تخلیق میں اپنی یہ صفات ظاہر کرتا ہے۔ کائنات کی ہر شے ''ما سوی اللہ'' ہے اور اس لحاظ سے اللہ کے بائیں ہاتھ کے زیرِ فرمان ہے، اللہ سے دور اور اللہ تعالیٰ کی نسبت اس سے تنزیہ، جلال، قہر، غضب اور ماورا اور نارسا ہونے کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کائنات کی ہر چیز اللہ کے دائیں ہاتھ کے زیرِ فرمان ہے، اللہ کے قریب ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت اس سے تشبیہ، جمال، رحمت، مہربانی اور

قابلِ رسائی ہونے کی ہے۔

اگر ایک چیز کو دوسری چیز سے مختلف ہونا ہے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے دونوں ہاتھوں کا تعلق اس چیز سے ایک جیسا ہو۔ اگر دونوں ہاتھوں کا معاملہ کوئی سی دو چیزوں کے ساتھ یکساں ہوں جائے تو وہ دو نہیں رہیں گی ایک ہو جائیں گی۔ لیکن چونکہ ہر چیز دوسرے سے مختلف ہے اس لیے دستِ خداوندی ہر شے سے الگ الگ انداز سے معاملہ کرتا ہے۔ کچھ مخلوقات مثلاً اجسامِ مادی اور شیاطین میں اللہ تعالیٰ کے بائیں ہاتھ کی صفات اپنے آثار و اثرات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہیں جبکہ دوسری اشیاء مثلاً نورانی اشیاء اور فرشتوں میں اس کے دائیں ہاتھ کو صفات کا غلبہ ہوتا ہے۔

انسان اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھوں سے خلق ہوا۔ اس طرح کہ نہ دایاں ہاتھ بائیں پر غالب ہے نہ بایاں دائیں پر لیکن اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو مکمل انسان ہوتے ہیں۔ جو صورتِ خداوندی کو اس کے مکمل ظہور کے ساتھ حقیقت بناتے ہیں۔ اور ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ اکثر انسانوں میں یا تو دایاں ہاتھ غالب رہتا ہے یا بایاں ہاتھ غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسی سے اس امر کا تعین ہوتا ہے کہ کوئی شخص اصحابِ شمال میں ہو کر اپنے انجام کو پہنچے گا یا اصحابِ یمین کا گروہ اس کی منزل ہوگی۔ بالفاظِ دگر اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا یا وہ اہلِ جنت میں ہوگا۔ رسولِ خدا کی ایک حدیث میں اس پوری صورتحال کا نقشہ یوں بیان ہوا ہے:۔ ۴۳

اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلق کیا جب خلق کیا۔ پھر اس کے دائیں کندھے پر ضرب لگائی اور اس کی ذرّیت نکل آئی، سفید گویا سفوف۔ پھر بائیں کندھے پر ضرب لگائی اور اس کی ذرّیت نکالی، کوئلے کی طرح سیاہ۔ پھر جو دائیں ہاتھ میں تھے انہیں کہا ''جنت

میں۔اور مجھے پروانہیں‘‘۔اور وہ جو بائیں ہاتھ میں تھے ان سے کہا آگ میں۔ اور مجھے پروانہیں۔

ایسی صورت میں انسان کو کیا کرنا زیبا ہے؟مسلمان اس صورت حال میں کیا کرتے ہیں،اللہ کے دستِ غضب سے بچنے کی کوشش اوراس کے دستِ رحمت کی طلب۔شیطان سے ان تمام مواقع پر دور رہنے کی سعی جہاں جہاں اس سے سابقہ پڑ سکتا ہے یعنی گمراہی کی صفت سے گریز خواہ وہ ابلیس میں ظاہر ہو،فرعون میں نمو کرے یا ہوا وہوس کی صورت اختیار کرے۔اس کا مطلب ہوا انبیاء کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی اور عقل کی رہنمائی۔قرآن میں دیئے گئے احکامات کے مطابق شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا۔

وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ(٣٦ : ٤١)

اور اگر کبھی تم شیطان کی اکساہٹ سے چوک جاؤ تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔

وہ لوگ جن کی نگاہیں ہر سطح پر’’توحید‘‘ کی تاثیر سے آشنا ہیں اور’’توحید‘‘ کو ہر معاملے میں شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کے نزدیک اس معاملے میں صحیح انسانی رویہ یہ ہے کہ رسولِ خدا کا اتباع کیا جائے اوران کی طرح یہ مانا جائے کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں اور انسان کو دستِ راست اور دستِ چپ ہر دو سے الگ الگ معاملہ کرنا چاہیے۔ہم نے پہلے درج کیا تھا کہ رسول اللہ یہ دُعا کیا کرتے تھے:’’میں تیرے غضب سے تیری رحمت کی پناہ لیتا ہوں،تیرے غضب سے تیری مغفرت کی پناہ لیتا ہوں اور تجھ سے تیری ہی پناہ میں آتا ہوں‘‘۔۴۴

بالفاظِ دیگر آپ فرما رہے ہیں کہ’’اے میرے رب میں تیرے بائیں ہاتھ سے

تیرے دائیں ہاتھ کی پناہ میں آتا ہوں"۔ آخری بات یہی ہے کہ حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے تو اس کے سوا اور کون ہے جس سے انسان پناہ مانگے اور جس کے دامن میں پناہ تلاش کرے۔

فطری بات ہے کہ ہماری بیان کردہ توجیہ اور اس کے مذکورہ استدلال سے ہر پڑھنے والے کی تشفی نہیں ہو سکے گی۔ سوال باقی رہے گا کہ آخر انسانوں کی مختلف قسمیں کیوں ہوتی ہیں اور ان میں سے کچھ جہنم میں کیوں جائیں گی اور کچھ جنت میں کیوں جائیں گی؟ عام طور پر ایسے مباحث میں فی الفور صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے کہ "آخر یہ نزلہ مجھی پر کیوں"؟ یہ واویلا قبل از مرگ ہے۔ کیا جانیے کہ آپ کی منزلِ آخرین کونسی ہے، اصحابِ یمین یا اصحابِ شمال۔ دستِ راست یا بایاں ہاتھ! اگر جنت میں مقیم ہوتے تو یقیناً شکایت نہ کرتے۔ لیکن ابھی سے یہ فرض کرنا بھی مناسب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دوزخ ہی میں ڈالے گا، یہ اللہ کی رحمت سے مایوسی ہے اور ایسا سوچنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں۔ ہمیشہ یاد رکھیے کہ گیا گزرا بدترین گناہگار بھی اپنے کیے سے توبہ کر سکتا ہے اور نیکوں کا نیک (مثلاً ابلیس) کسی لمحے بھی ذلت کے گڑھے میں گر سکتا ہے۔ یہ ہم سبھی کا حال ہے، انسان جو ٹھہرے۔ اوروں کا کیا مذکور ہے، خود نبی علیہ السلام کو یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷: ۱۸۸)

کہیے کہ میں اپنی جان کے برے بھلے کا مالک نہیں ہوں، مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں جانا کرتا غیب کی بات تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی

گزند نہ پہنچتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔

دوسری طرف یہ بھی یاد رہے کہ ہم میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارا انجام کیا ہونا ہے پس اپنی راہِ عمل کے انتخاب میں اور صحیح اور غلط کے درمیان چناؤ کے لیے میں بھی اتنا ہی آزاد ہوں جتنا کوئی اور شخص۔ اللہ کے پیمانہ تقدیر پر اور ہر شے کو معین کرنے پر جو لوگ معترض ہوتے ہیں ان کی نیت عموماً صاف نہیں ہوتی۔ اعتراض کے پسِ پردہ کچھ اور مقصد کارفرما رہتا ہے۔ وہ ہمیں قائل اس بات پر کرنا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں منطقی رویہ یہ ہے کہ انسان یوں کہا کرے کہ "ٹھیک ہے اگر یہ سب مقرر ہو چکا اور طے کر دیا گیا تو پھر اب میں آزاد ہوں، جو چاہے کرتا رہوں کہ اس سے کوئی فرق تو پڑے گا نہیں۔ اگر مجھے دوزخ میں پڑنا ہے تو میں اسے ٹالنے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا اور اگر جنت میں جانا طے ہو چکا ہے تو اس تک پہنچنے میں بھی میرا کوئی عمل سودمند نہیں ہوسکتا"۔ لیکن یہ طرزِ استدلال، یہ دلیل بازی صرف ایک بہانہ ہے جسکی آڑ لے کر انسان اپنے انجام، اپنی منزل اور اپنے آخری ٹھکانے کے بارے میں کچھ سوچنے، کرنے سے خود کو بری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا روم نے اس اندازِ فکر پر نہایت وضاحت سے اپنے مخصوص طنزیہ اسلوب میں تبصرہ کیا ہے۔ ان کی رائے اس شعر میں سمٹ آئی ہے۔[۴۵]

انبیاء درکارِ دنیا جبری اند ‍ ‍ ‍ ‍ کافراں درکارِ عقبیٰ جبری اند

انبیاء را کارِ عقبیٰ اختیار ‍ ‍ ‍ ‍ جاھلاں را کارِ دنیا اختیار

بالفاظِ دگر وہ لوگ جو قرآن کے دیے ہوئے سبق سے آگاہ ہوجاتے ہیں وہ یہ بات

جان لیتے ہیں کہ اس دنیا میں اپنی حالت سدھارنے کے لیے ان کے بس میں کچھ بھی نہیں۔ پس وہ اپنی جدوجہد کا رخ اگلے جہان میں اپنی حالت سدھارنے کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو جبر و اختیار کے بارے میں بال کی کھال نکالنے میں لگے رہتے ہیں ان کی ساری کاوش اپنی دنیاوی حالت بہتر بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ نبیوں کے لائے ہوئے امر و نہی کے احکامات نظر انداز ہوتے رہتے ہیں جبکہ یہی احکامات ان کے مستقبل اور اگلے جہان کی زندگی کو بہتر بنا سکتے تھے۔

چونکہ ہر چیز پہلے سے مقدر ہے لہٰذا انسان کے کسی عمل سے اس کے لیے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس دعوے کے اندر خود ایک تضاد پنہاں ہے۔ یہ تضاد فلسفیانہ سطح پر نہیں ہے کیونکہ اس سطح پر تو اس استدلال میں کوئی معنی بھی ہیں۔ تضاد تو نفسیاتی اور عملی سطح پر پیدا ہوتا ہے۔ اس تضاد کی نوعیت کو سمجھنا ہو تو بحث کو ذرا نیچے اتار کر ایک ٹھوس مثال کی سطح تک لانا مفید ہوگا۔

فرض کیجیے کہ آپ کالج میں طبیعیات کا ایک دشوار ترین نصاب پڑھنا شروع کرتے ہیں اور ساتھ یہ بھی فرض کیجیے کہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر شے اللہ کے پیمانہ تقدیر کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کورس کے آخر میں جو نمبر آپ کو ملیں گے وہ پہلے سے مقدر ہیں۔ اس کے بعد کیا آپ یہ فیصلہ بھی کریں گے کہ کمرۂ جماعت میں آنے نہ آنے، لیکچر سننے نہ سننے اور نصاب کی کتب پڑھنے یا ایک طرف پھینک دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟ آپ کا امتحان میں کامیاب ہونا اور ناکام ہونا مقدر بھی ہو چکا ہو تب بھی اگر آپ کلاس میں جانا ترک کر کے دعوتوں، ضیافتوں میں خوش اوقاتی کرتے رہیں گے تو امتحان میں

کامیابی کے امکانات ہی تلف ہو جائیں گے ۔ اگر آپ امتحان میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو لیکچر سننے کی اور مطالعۂ کتب کی زحمت کھینچنا ہو گی۔اس کے باوجود بھی یہ ہو سکتا ہے کہ آخری امتحان میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے ۔تاہم زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اگر آپ کورس کے تقاضے پورے کر لیں تو امتحان میں کامیاب رہیں گے ۔ جب کامیابی کے مرحلے سے گزر چکے ہوں گے تب آپ پر کھلے گا کہ آپ کا کامیاب ہونا تو مقدر تھا۔ اگر آپ پڑھائی چھوڑ کر آوارگی کرتے رہے ہوتے تو اس لمحے آپ پر عیاں ہو جاتا کہ آپ کا ناکام ہونا مقدر تھا۔

مختصر یہ کہ عملی سطح پر انسانی آزادی اور تقدیر کے مابین کوئی تضاد نہیں، ہدایت اور گمراہی میں کوئی ٹکراؤ نہیں، رحمت اور غضب میں کوئی تصادم نہیں ۔انسان نہیں جانتا کہ اس کا ٹھکانہ کونسا ہے، وہ کس گروہ کا آدمی ہے پس وہ اپنی راہِ عمل کے چناؤ میں آزاد ہے ۔انسان جانتا ہے کہ روزمرّہ کی زندگی میں وہ آزاد ہے، یہی نہیں بلکہ اپنے ہر ہر عمل سے وہ اسے ثابت بھی کرتا ہے۔اسلام کا کہنا یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ انسان کے صرف ان فیصلوں کی باز پرس کرے گا جو اس نے اپنے اختیار سے اور اپنی مرضی سے کیے ہوں گے ۔ جو امور اس کے لیے ناممکنات میں سے تھے ان کے لیے اسے جوابدہی نہیں کرنا پڑے گی۔انسان اگر ہر دعوے سے دستبردار ہو بھی جائے (اور یہی اسلام کے معنی ہیں ۔الحق کے سامنے سرِ تسلیم خم) تب بھی رسولِ خداؐ کے دیے ہوئے نمونۂ زندگی اور اسوۂ حیات کو ایک عملی حقیقت بنانے کے لیے انسان کو ہر سعی اور ہر کاوش کرنا پڑتی ہے۔اسلام میں جو ’’جبریت‘‘ یا ’’مقدر ہونے‘‘ کا تصور ہے اس سے کسی طرح بھی کم ہمتی، آلکس اور سست روی کی افزائش

نہیں ہوتی ۔یہاں تو معاملہ بالکل الٹ ہے ۔اس تصور سے جدوجہد اور سعیِ پیہم کو جلا ملتی ہے۔ہاں یہ ہے کہ اس کوشش و کاوش کا ہدف، اس کا محور یہ دنیائے امروز نہیں رہتی ۔اس کی جدوجہد کا رخ اگلے جہان کی سمت ہو جاتا ہے ۔اب اس کی سمتِ سفر انتشار اور ''شرک'' سے ہٹ کر ارتکاز و''توحید'' کی جانب متعین ہو جاتی ہے ۔

# اسلام اور دیگر ادیان

## نبوتِ عام اور نبوتِ خاص

نبوت وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ کی ہدایت انسانی وسیلوں کے توسط سے نوع انسانی تک پہنچتی ہے۔ جس طرح اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور غضب کی نوعیت کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اس طرح اللہ کی ہدایت بھی اس کے بھٹکانے سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہدایت کا مقتضٰی ہے کہ گمراہی بھی موجود ہو۔ شیطان جس گمراہی کی تجسیم ہے اگر اس کا وجود نہ ہو تو انبیاء کے پیغام میں کوئی معنی نہ رہیں۔ دوری کے بغیر نزدیکی نہیں ہوتی، غلط کے بغیر کوئی صحیح نہیں ہے اور ظلمت کے بغیر نور کا ادارک نہیں ہو سکتا۔ یہ کائنات من وتو کے جس امتیاز پر کھڑی ہے، یہ رنگا رنگی اور تنوع جس کی وجہ سے اس کا وجود ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ اللہ کی صفات اس میں نو بہ نو انداز اور مفصل طور پر ظاہر ہوئی ہیں۔ اخلاقی اور روحانی سطح پر یہ تنوع، یہ اختلاف ہدایت اور گمراہی کے راستوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انبیاء ہدایت کے نمائندے ہیں اور شیاطین گمراہی کے نقیب۔

جہاں جہاں انبیاء رہے ہیں وہاں شیاطین بھی ہوئے ہیں۔ قرآن نے ''شیاطین'' کا لفظ بعض جنات اور بعض انسانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ شیطان وہ ہے جو انبیاء کا دشمن ہو اور گمراہی کی تجسیم۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط

وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (٦ : ١١٣)

اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ جو دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کو پرفریب، ملمع شدہ باتیں کرتے ہیں۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے سو چھوڑ دو ان کو۔ وہ جانیں اور ان کا جھوٹ۔

پہلے نبی اور ہمارے جد امجد، حضرت آدمؑ کو ابلیس کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہم بھی ابلیس، اس کی اولاد اور اس کے پیروکاروں کا سامنا کرتے ہیں۔ گمراہی ایک کائناتی چیز ہے۔ گمراہی باہر کی دنیا میں بھی ہوتی ہے اور ہمارے اندر بھی۔ اس طرح ہدایت بھی ایک کائناتی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں نسلِ انسانی کا تصور انبیاء اور شیاطین کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ انسان کی شناخت ہی اس آزادیٔ اختیار سے ہوتی ہے جو اسے اس وقت دی گئی تھی جب اسے صورتِ خداوندی پر خلق کیا گیا تھا۔ وہ صفاتِ خداوندی میں انتخاب کرنے کے لیے آزاد ہے کیونکہ تمام صفاتِ خداوندی انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ وہ ہدایت کی پیروی کر کے اللہ کے دستِ راست کا انتخاب بھی کرسکتا ہے اور اپنے لیے گمراہی کا راستہ چن کر اللہ کے بائیں ہاتھ کا انتخاب بھی۔ اگر یہ آزادیٔ انتخاب و اختیار نہ ہوتی تو وہ ''بارِ امانت'' کو قبول کرنے میں آزاد نہ ہوتا۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ انبیاء کا بنیادی پیغام ہے ''توحید''۔ اسلام کے تناظر میں دیکھیے تو سبھی انبیاء پہلا کلمۂ شہادت لے کر آئے تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱:۲۵)

تم سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

پہلا کلمۂ شہادت اس ہدایتِ ربانی کا عنوان ہے جو تمام انبیاء میں مجسم ہوتی رہی ہے۔اس کے برعکس دوسرے کلمۂ شہادت کا تعلق اللہ کے اس خاص پیغام ہدایت سے ہے جو سیدنا محمدؐ لے کر آئے تھے۔دوسرے تمام انبیاء کا اپنا اپنا پیغام تھا اور اسی کے مطابق ان کا دوسرا کلمۂ شہادت۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (١٠:٤٧)

اور ہر اُمت کے لیے ایک رسول ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (١٤:٤)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی زبان میں بھیجا۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (٥:٤٨)

تم میں سے ہر ایک کو ہم نے ایک دستور اور ایک کھلی راہ دی۔

قرآن مجید نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کے نبیوں میں ہرگز فرق نہیں کرنا چاہیے کہ ہر نبی بہر حال اللہ ہی کا پیغامِ ہدایت دے کر بھیجا گیا اور انبیاء میں سے ہر ایک کا اوّلین اور اساسی پیغام ایک تھا کہ:٦ے

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (٢:١٣٦)

کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہم پر اُتاری گئی اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ و عیسیٰ کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی ہم

ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

قرآن متعدد آیات میں یہ بتاتا ہے کہ پچھلے انبیاء اپنے سے پہلے آنیوالے نبیوں کے پیغام کا اثبات کرنے اور اس کی یاد دلانے کے لیے آتے تھے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (٦١:٦)

اور یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا، اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ سچا کرتا ہوں تورات کی ان (پیش گوئیوں کو) جو مجھ سے پہلے موجود ہیں اور خوشخبری دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا۔

نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (٣:٣)

اس نے تجھ پر کتاب اُتاری حق کے ساتھ، ثابت کرتی ہے اس کو جو پہلے سے موجود ہے۔ اور اس سے پہلے اس نے تورات اور انجیل اتاری تھی لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید صراحت سے یہ بھی بتا دیتا ہے کہ انبیاء کے لائے ہوئے پیغام کی تفصیلات ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں۔ اگر انبیاء میں کوئی امتیاز قائم کیا جا سکتا ہے تو وہ اسی بنیاد پر ہو گا کہ ان کے پیغام میں کس قدر باہمی فرق پایا جاتا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲:۲۵۳)

یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ان میں سے کوئی وہ ہے جس سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روحِ پاک سے ان کی تائید کی۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۱۷:۵۵)

اور ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

ہر نبی ایک ایسا پیغامِ ہدایت لے کر آتا ہے جس کا خصوصی تعلق اس قوم سے ہوتا ہے جس کا اسے نبی بنایا گیا اور یہ پیغام اپنی تفصیلات میں دوسرے پیغامات سے مختلف ہوتا ہے۔مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ خیال بہت پختگی سے جاگزیں رہتا ہے اور اسی خیال کا عکس ان تمام القابات میں دیکھا جا سکتا ہے جو تمام بڑے انبیاء کے لیے اسلامی کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ہر لقب کسی ایک خاص صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔وہ صفت جو اس نبی کو دوسرے انبیاء سے ممتاز کرتی ہے۔ چنانچہ یہ دیکھیے کہ ابھی ہم نے جو آیات درج کی ہیں ان میں سے ایک آیت میں اس کا ذکر ہے ''جس سے خدا نے کلام کیا'' اکثر مفسرین کی رائے کے مطابق یہاں اشارہ سیدنا موسیٰؑ کی طرف ہے جنہیں اسلامی ماخذ میں ''کلیم'' (بات چیت کا ساتھی) کا لقب دیا گیا ہے۔اس لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت

موسیٰ سے جبرئیل کے واسطے کے بغیر طورِ سینا پر کلام کیا۔ اور اس لیے بھی کہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (٤:١٦٤)

اور دوسرے (بھی بہت سے) رسولوں پر ہم نے وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور کتنے ہی رسول ہیں جن کا احوال ہم نے تم کو نہیں سنایا اور موسیٰ سے تو اللہ نے بول کر کلام کیا ہے۔

لیکن مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے یہاں اشارہ حضرت آدم کی طرف ہو جن سے اللہ تعالیٰ نے باغِ بہشت میں خطاب کیا اور یہ بھی کہ اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کی ذات ہے جن سے اللہ تعالیٰ سفرِ معراج کے دوران ہمکلام ہوئے۔ اسی طرح سیدنا عیسیٰ کو عموماً "روح اللہ" (اللہ کی روح) کا لقب اور سیدنا ابراہیم کو "خلیل اللہ" (اللہ کا دوست) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسلامی ممالک میں اور خاص طور پر وہاں کے ان لوگوں میں جن پر ابھی جدید تعلیم کی چھاپ نہیں لگی میں یہ اعتقاد عام ہے کہ تمام ادیان پہلے کلمۂ شہادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہر دین کا ایک خاص کلمۂ شہادت دوم ہے جو مسلمانوں کے دوسرے کلمۂ شہادت سے مختلف ہے۔ چنانچہ یوں کہا جا سکتا کہ عیسائیوں کا کلمہ یہ ہے "لا الہ الا اللہ عیسیٰ روح اللہ" جبکہ یہودی اسے یوں پڑھتے ہیں "لا الہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ"۔

قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اگرچہ پہلا کلمۂ شہادت کبھی

تبدیل نہیں ہوتا تاہم دوسرے کلمۂ شہادت کی قلمرو ہر نبی کے پیغام کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے چنانچہ مثال کے طور پر وہ قوانین جو یہودیوں کے لیے مناسب ہیں لازم نہیں کہ عیسائیوں کے لیے بھی موزوں رہے ہوں۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی شریعت کے احکامات ایک کائناتی حیثیت رکھتے ہیں۔ (بعض مسلمان البتہ اسی خیال کے حامل ہیں)۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیت میں قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ یہودیوں کے ہاں بعض چیزوں کی ممانعت ہے جبکہ یہی چیزیں مسلمانوں کے لیے ممنوع نہیں۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍ ج وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْمَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (٦:١٤٧)

اور ہم نے یہود پر سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جوان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔

اسی طرح مندرجہ ذیل الفاظ کو قرآن مجید نے سیدنا مسیح کے منہ سے کہلوایا ہے جبکہ ان کے مخاطب یہودی ہیں۔ اشارہ اس جانب ہے کہ مسیحی شریعت سیدنا موسیٰ کی شریعت سے مختلف ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰتِه وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (٣:٥٠)

اور میں تصدیق کنندہ ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی تورات کا اور اس لیے (آیا ہوں) کہ بعض ان چیزوں کو تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام

کر دی گئی ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری سورت کے آخر میں ایک دعا ہے جو بکثرت پڑھی جاتی ہے اس کے الفاظ ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا (۲:۲۸۶)

اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ہے تورات جو مسلمانوں کی شریعت کے مقابلے میں ایک بار گراں محسوس ہوتی ہے کہ شریعتِ اسلام کو حدیث کے الفاظ میں ''سہل اور گوارا'' (سہل و سمح) کہا گیا ہے۔ مختلف انبیاء کو جو الگ الگ پیغامات سونپے گئے ان کے سب سے خوش کن بیانات میں سے ایک وہ بیان ہے جو رسول خداؐ کے سفرِ معراج کے ذیل میں تمام مستند مآخذ میں مذکور ہوا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ آسمانوں کا سفر کرتے ہوئے رسول اللہ نے کئی انبیاء سے ملاقات فرمائی تھی۔ جب آپ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کی امت کے لیے کچھ احکامات دیئے۔ نیچے آتے ہوئے رسول اللہؐ ہر فلک پر انبیاء کو الوداع کہنے کے لیے رکتے ہوئے تشریف لائے۔ چھٹے آسمان پر ساتویں آسمان کے عین نیچے آپ کی ملاقات سیدنا موسیٰؑ سے ہوئی۔ سیدنا موسیٰؑ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے امت کے لیے آپ کو کونسی عبادات کا حکم فرمایا۔ رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ اللہ نے یومیہ پچاس نمازوں کا حکم فرمایا ہے۔ سیدنا موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ آپ واپس جایئے اور اللہ تعالیٰ سے اس بوجھ کو کم

کرنے کی درخواست کیجیے۔انہیں یہ افسوسناک تجربہ ہو چکا تھا کہ لوگ باگ اتنے مشکل حکم پر عمل نہیں کر پائیں گے۔رسولِ خداؐ فرماتے ہیں،''میں واپس ہوا، اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں کم کردیں۔لوٹ کر موسیٰؑ کے پاس آیا تو انہوں نے وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔پس میں پھر واپس ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مزید دس نمازیں کم کردیں۔ میں لوٹ کر موسیٰؑ کے پاس آیا..........''۴۸

آخر کار جب رسولِ خداؐ کئی مرتبہ لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس اور پھر سیدنا موسیٰؑ کے پاس آئے تو نمازوں کی تعداد کم ہو کر پانچ رہ گئی۔اس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے رسولِ خداؐ سے فرمایا:

تمہاری قوم پانچ نمازوں کی پابندی نہیں کر پائے گی۔میں نے تمہارے زمانے سے پہلے کے لوگوں کو آزمایا ہے اور بنی اسرائیل پر غالب آنے کی پوری کوشش کی ہے۔سو اپنے رب کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ تمہاری قوم کے لیے اور آسانی فرما دے۔

لیکن اب وہ نقطہ آ چکا تھا کہ بار بار تخفیف کی درخواست کرنے سے رسولِ خداؐ خجل ہونے لگے تھے۔سو آپؐ نے فرمایا''میں اپنے رب سے اتنی مرتبہ درخواست کر چکا کہ اب شرم دامن گیر ہوتی ہے۔اب میں مطمئن ہوں اور حکمِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔''

نبوت کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر بحث و مباحثہ کا موقع ہو تو آج کے مسلمانوں کے جذبات فوراً بیدار ہو جاتے ہیں۔اس کا مرکزی سبب غالباً یہ ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک میں مذہب روزمرہ زندگی میں ایک بہت بڑا کردار ادا کرتا

ہے۔یورپ اورامریکہ میں ایسانہیں ہوتا۔چنانچہ عموماًیہ ہوتا ہے کہ سیاسی آراءکوبھی مذہبی اصطلاحات میں ڈھال دیا جاتا ہے۔اوردوسرے ممالک کی پالیسیوں کی تنقید دوسرے ادیان پرتنقیدی شکل اختیارکرلیتی ہے۔

نبوت کی بحث میں زیادہ جذباتیت یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ جدیدیت زدہ مسلمان مغرب کے بہت سے لوگوں کی طرح یہ رویہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی سرزدنہیں ہوسکتی۔کمی کوتاہی اگر ہے تو دوسرے لوگوں میں لہٰذا مسئلہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کا دوش ہمیشہ مخالف ہی کو دیا جائے گا۔یہ رویہ ساری دنیا میں عام ہے۔وہ لوگ جو قصۂ آدم کی صداقت کا اعتراف کرتے ہیں ان کے لیے یہ نکتہ نہایت معنی خیز ہے کہ ابلیس وہ پہلی ہستی تھی جس نے دوسرے کو الزام دینے کا وطیرہ اپنایا تھا۔وہی تو تھا جس نے یہ کہا:

قَالَ فَبِمَآ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ

(۷:۱۶)

چونکہ تم نے مجھے بھٹکایا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا۔

اگر انسان آدم اورحوا کے طریقے پر چلے تو اس کی نگاہ اپنی خامیوں پر جائے گی۔اوروہ یہ اعتراف کرنے کی گنجائش دیکھے گا کہ:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (۷:۲۳)

اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اوراگرتو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اورہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم نامرادوں میں سے ہوجائیں گے۔

یہ مت سمجھیے کہ ابلیس کا یہ رویّہ صرف سیاست میں نظر آتا ہے۔یہ تو ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ جب طالب علموں کے لیے امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوتا ہے تو وہ کیا کرتے ہیں۔اکثر آپ انہیں یہ کہتا پائیں گے 'فزکس میں تو مجھے A گریڈ ملا ہے لیکن انگلش کے اس بیہودہ ٹیچر نے مجھے C دے دیا ہے''۔ یہ ابلیس کا رِدّعمل ہے یعنی میں تو نورانی ہوں اس نے مجھے گمراہ کر دیا۔میں تو بھلا آدمی ہوں یہ خرابی برائی کسی اور کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ایسے کسی موقع پر آدم اور حوا ہوتے تو یوں کہتے ''فزکس کے استاد کی مہربانی ہے کہ مجھے A گریڈ مل گیا لیکن انگلش میں، میں نے گڑبڑ کردی اسی لیے میرا C گریڈ آیا ہے۔اب میں پہلے سے زیادہ محنت کروں گا تا کہ اس کمی کوتاہی کی تلافی ہو جائے''۔

مختصراً یہ کہ معاصر صورتحال میں نظریاتی بحثوں کو عموماً اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے گویا خیروشر میں معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔صورت حال اس کی طرح کی ہو تو پھر ان لوگوں کی بات پر کان دھرنے والے کم ہی نکلتے ہیں جو قرآن مجید کے پیغام کی کائناتی اور عالمگیر حیثیت پر زور دے رہے ہوں۔دوسرے شخص کو قصوروار اور خود کو بے خطا جاننا بہت آسان کام ہے۔اس طرح سوچنا ہو تو پہلے یہ بھولنا پڑتا ہے کہ اللہ کی رحمت ساری مخلوقات پر پھیلی ہوئی ہے۔انسان کو اگر یاد رہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے تو وہ اپنے گریبان میں بھی جھانکنے کی کوشش کیا کرے، اپنی کوتاہیوں پر بھی غور کرے اور دوسروں کو اللہ کے سپرد کردے۔پھر انہیں شاید یہ قبول کرنا پڑے کہ C بھی ایک انعام سے کم نہیں تھا، وہ تو فیل ہونے کے لائق تھے۔

## یہودیت اور مسیحیت

تاریخ انسانی میں انبیاء کا کردار جس طرح مذکور ہوا ہے وہ بہت پُرمعنی اور تہ دار ہے۔اس میں معانی کی کتنی ہی سطحیں ہیں۔قرآنی آیات کی بنیاد پر نہ تو یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ پیغام حق پر اسلام کی اجارہ داری ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے ادیان ایک غیر مشروط انداز میں وسیلۂ نجات Valid ہیں۔معاملہ یوں ہے کہ سبھی انبیاء اللہ کی طرف سے پیغامِ حق لے کر آئے لیکن ان کے پیروکاروں نے ان کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنے میں اکثر کوتاہی کی۔ ابتدائی عہدِ اسلام کے مسلمانوں کو جن دو مذاہب کے ماننے والوں سے سابقہ پڑا تھا ان پر قرآن نے اکثر تنقید کی ہے۔قرآن کا کہنا ہے کہ بہت سے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس پیغامِ حق کے مطابق زندگی نہیں گزاری جو ان کو اللہ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔تاریخ کے ہر دور میں عیسائی اور یہودی مصلحین نے اپنی اپنی قوم کو یہی ملامت کی ہے۔

بہت سے مسلمان اسی بات کے سہارے دیگر تمام ادیان کے بارے میں یہ عالمگیر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اب روئے ارض پر صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو منزّل من اللہ اور قابلِ عمل (Valid) ہے اور یہ نکتہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ فرض کر لینے کی کوئی واقعی بنیاد موجود نہیں کہ اسلام کو بھی زوال اور انحراف کی انہی صورتوں کا سامنا نہیں کرنا ہوگا جو اس سے پہلے کے ادیان کو درپیش ہوئیں۔بعض مسلمان اس طرح کی تنقیدی آراء سے اتفاق نہیں رکھتے جو ہر کینڈے کے بنیاد پرست اپنے مزعومہ دشمنوں کے خلاف ظاہر کرتے رہتے ہیں۔مختصر یہ کہ آج کے مسلمان ہوں یا گزرے ہوئے وقتوں کے مسلمان، ان میں اسلام اور دوسرے ادیان کے مسئلے پر کوئی اتفاق رائے نظر نہیں آتا۔تاہم قرآن مجید اور مستند

تفاسیر میں ایک ایسے نقطۂ نظر کی وافر گنجائش ملتی ہے جو مسئلے کی نزاکت اور تہ داری کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر اس پر کلام کرتا ہے۔

قرآن مجید میں دو مقامات پر انبیاء کے لائے ہوئے ادیان کے بارے میں عمومی تبصرہ ملتا ہے۔ آیت یوں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ وَالَّذِیْنَ ھَادُوْ وَالنَّصٰرٰی وَ الصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

(۵:۶۹، ۲:۶۲)

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے، اور جو لوگ یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابئین، جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جس نے نیک کام کیے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے نہ وہ کسی بات کا غم کھائیں گے۔

قارئین اب تک کی معروضات کی روشنی میں یہ اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں کہ ان آیات میں کلیدی مسئلہ اللہ پر ایمان کا ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے ایمان باللہ کا تقاضا ہے ''توحید'' اور ''توحید'' تمام انبیاء کا پیغام ہے۔ ''توحید'' کا اثبات جتنا مستحکم ہوگا، آخرت کی کامیابی اتنی ہی یقینی ہوگی۔ پہلا کلمۂ شہادت جس کے وسیلے 'توحید' کا اظہار و بیان عمل میں آتا ہے، اس قدر اہم ہے کہ مستند ترین مآخذ میں سے ایک میں پائی جانے والی مندرجہ ذیل حدیث میں یوں آیا ہے کہ: مَنْ مَاتَ وَ ھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ (جو شخص یہ جانتے ہوئے موت سے ہمکنار ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو وہ جنت میں داخل ہوگا)[۹۴]

غور کیجیے کہ حدیث میں ایمان کا مذکور نہیں ہے۔ ''توحید'' کا ''علم'' رکھنا کافی ہے۔ ایک اور حدیث میں یہی نکتہ بیان ہوا ہے۔ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے میزان میں اچھے برے اعمال تولے جائیں گے۔ ترازو کے ایک پلڑے میں ہر شخص کے اچھے اعمال اور دوسرے پلڑے میں برے عمل رکھے جائیں گے۔ فیصلے کے لیے ایک ایسا شخص لایا جاتا ہے جس کے نامۂ اعمال کے ننانوے دفتر برے کاموں سے بھرے ہوئے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے' تجھے کوئی شکایت تو نہیں۔ میرے لکھنے والوں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟

وہ جواب دے گا ''نہیں میرے رب''۔

اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تمہارے پاس اس بداعمالی کا کوئی عذر ہے؟ اس پر وہ شخص کہے گا کہ نہیں میرے مالک۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہمارے حساب میں تمہارا ایک نیک عمل لکھا ہوا ہے اور آج کے دن تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

پھر ایک نامۂ اعمال لایا جائے گا جس میں لکھا ہوگا ''اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھدان محمد عبدہ ورسولہ''۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے۔ میزان کے لیے آگے بڑھو۔ وہ شخص اپنے رب سے استفسار کرے گا کہ اس کے دفترِ عمل کے ساتھ یہ ایک لکھا ہوا نامۂ عمل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا''۔

اس کے دفترِ عمل کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور دوسرے پلڑے میں وہ نامۂ عمل رکھ دیا جائے گا۔ بدعملی کے ۹۹ دفتر ہلکے اور وہ ایک نامۂ عمل بھاری نکلے گا کہ اللہ کے نام کے برابر اور کسی شے کا وزن نہیں ہوسکتا''۔[۵۰]

جب قرآن مجید دوسرے ادیان کے ماننے والوں پر تنقید کرتا ہے تو اس کا ہدفِ تنقید یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ہاں ''توحید'' مسخ صورت میں نظر آ رہی ہے ۔ یہ تنقید کرتے ہوئے قرآن مجید یہودیت اور عیسائیت کی ان تعلیمات کا حوالہ دیتا ہے جن کو ان ادیان کے سب پیروکار لازماً تسلیم نہیں کرتے ۔

ایک سادہ مثال لیجیے ۔ عام بات ہے کہ قرآن مجید نے عیسوی تصورِ تثلیث کی تردید کی ہے ۔ تثلیث میں جس حد تک 'توحید'' کا انکار پایا جاتا ہے اس حد تک یہ بات درست ہے ۔ لیکن ہر عیسائی یہ نہیں کہتا کہ تثلیث 'توحید' کے منافی ہے ۔ معاملہ برعکس ہے ۔ تصورِ تثلیث کی اکثر تعبیرات اور بیان اس طرح کیے جاتے ہیں کہ اس سے ''توحیدِ خداوندی'' پر زد نہ پڑے ۔ اگر ''تین ہونے'' کو وحدت پر ترجیح دی جائے تو قرآن کا اعتراض وارد ہوتا ہے لیکن یہ نکتہ ایسا ہے کہ تین اور ایک کے تعلق پر عیسائیوں کے اپنے اندر ایک مسلسل مناظرہ چلا آ رہا ہے ۔ قرآن کی وہ آیات جو تثلیث کے رد میں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵:۷۳)

بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہے تین میں کا ہے ۔

عیسوی عقائد کا ابتدائی علم بھی میسر ہو تو یہ دیکھنا آسان ہے کہ وہاں اللہ تعالی ''تین میں سے ایک'' نہیں ہے بلکہ وہ بیک آن ایک بھی ہے اور تین بھی ۔ جس اعتبار سے وہ تین ہے اس لحاظ سے وہ مخلوقات کے سامنے خود کو تین اقانیم میں ظاہر کرتا ہے ۔ باپ، بیٹا اور روح القدس ۔ ایک اور قرآنی آیت میں بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی گئی ہے:

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا

اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۴:۱۷۱)

مسیح، عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القاء فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو۔ باز آ جاؤ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ الٰہ واحد تو اللہ ہی ہے۔

یہاں یہ دیکھیے کہ سیدنا عیسیٰ کو ان آیات میں ایک نہایت ارفع حیثیت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان جیسے اوصاف دوسرے انبیاء میں نہیں ہیں۔[۵۱] لیکن اس آیت میں بھی زور اسی بات پر ہے کہ خدا صرف وہی الٰہ واحد ہے۔ اگر سیدنا عیسیٰ پر ایمان تین خداؤں کے اعتراف تک لے جائے تو قرآن اسے رد کر دیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی مسئلہ یہ ہے کہ اصل عیسائی موقف نہایت پیچیدہ اور لطیف ہے اور شاید ہی کوئی عیسائی ایسا ہو گا جو یہ ماننے پر آمادہ ہو کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی اور پر ایمان رکھتا ہے۔

بعض مسلمان مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر ''تین میں سے تیسرا'' ہونے کا عقیدہ نہ رکھا جائے تو ''تین'' کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر کسی نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ ''دو'' کے علاوہ تیسرا ہے تو یہ درست ہو گا۔ قرآن میں آیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ

مَا كَانُوا ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۵۸:۷)

کیا جانتے نہیں کہ اللہ جانتا ہے اس سارے کو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے؟ نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں۔ پھر وہ ان کو ان کے سارے کیے سے آگاہ کرے گا، قیامت کے دن۔ بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

ایک اور عیسوی تصور پر قرآن نے شدید اعتراض کیا ہے اور وہ یہ کہ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہا جائے۔ تثلیث کے رد میں جو آیت ہم نے ابھی درج کی اس میں آگے چل کر یوں آیا ہے:

سُبْحٰنَهٗ أَنْ يَكُونَ لَهٗ وَلَدٌ (۴:۱۷۱)

وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔

ایک اور مقام پر قرآن میں اس طرح کہا گیا ہے کہ:

أَنّٰى يَكُونُ لَهٗ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۶:۱۰۲)

اس کے اولاد کہا جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

قرآن میں اس لفظ کا استعمال اور مسلمانوں کا عمومی فہم اس بات پر دال ہے کہ

''بیٹا'' کے لفظ کو مسلمان کسی استعاراتی یا مجازی او رعلامتی معنوں میں نہیں سمجھتے ۔اس کے لیے ان کے معنی ہیں صلبی فرزند، جسے ماں نے جنم دیا،یعنی وہ خدا کی مفروضہ مؤنث ساتھی سے پیدا ہوا ہو۔یہ تو ہوسکتا ہے کہ بعض عیسائی یہی عقیدہ رکھے ہوئے ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کوئی زوجہ منتخب کر لی یا یہ کہ اس سے کسی طرح سیدہ مریمؑ کو حمل ٹھہرا اور بچے کی ولادت ہوئی۔لیکن عیسوی دینیات میں کسی عالمِ دین نے آج تک اس طرح نہیں سوچا۔ان کے لیے سیدنا عیسیٰؑ کا بیٹا ہونا حقیقت ہے مگر اس کو ایک جسمانی مفہوم میں لینا ممکن نہیں۔سیدہ مریمؑ کو اکثر ''مادرِ خداوند'' Mother of God کہا جاتا ہے۔اس سے بھی مسلمانوں کے ذہن میں الجھن بڑھ جاتی ہے کہ ان کے سامنے یا تو صرف قرآن کی آیات ہوتی ہیں یا ایک اجنبی مذہب کے بارے میں عوامی غلط فہمیوں کا مجموعہ۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ بیٹا ہونے کا مطلب مسلمان بالکل لفظی معنی میں لیتے ہیں۔مثال کے طور پر قرآن مجید کی مختصر ایک سو بارہویں سورۃ دیکھیے جسے اکثر ''سورۃ توحید'' بھی کہا جاتا ہے۔ولدیت اورفرزندی کے بارے میں جو غور کرے گا جلد ہی یہ سمجھ لے گا کہ یہ دونوں اصطلاحات اضافی ہیں۔ہر فرزند (کم از کم امکان کی حد تک) والد بھی ہے۔اور ہر باپ باپ ہونے کے علاوہ بیٹا بھی ہے۔اس سے صرف ایک استثناء ہے سیدنا آدم علیہ السلام۔غور کیجیے کہ اس سورۃ میں توحید کا اثبات کرتے ہوئے قرآن مجید نے صرف یہ خیال ہی رد نہیں کیا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں بلکہ اس سے جڑے ہوئے ایک دوسرے غلط عقیدے کی نفی بھی کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کا جنا ہوا ہوسکتا ہے،مسلمان کی نگاہ میں یہ ایک سراسر لغو اور بیہودہ خیال ہے۔

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۚ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲)

تم اعلان کرو، اے پیغمبر کہ وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کا سہارا ہے۔ وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو قرآن مجید میں ایک اور بات کے لیے اکثر ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ ان کا جرم یہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی مقدس کتابوں میں تبدیلیاں کر دیں اور اس طرح انبیاء کے لائے ہوئے پیغامات کو بے نتیجہ اور خراب کر کے رکھ دیا۔ قرآن مجید کی آیات سے دیگر آسمانی کتابوں کے بارے میں جو بات سامنے آتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ پہلو دار ہے جتنا کہ مسلمان عموماً تسلیم کرتے ہیں۔ عربی کا کلیدی لفظ جو اس ضمن میں استعمال ہوا ہے وہ ہے "تحریف"۔ اس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے صحیح راستے سے ہٹا دینا، مسخ کرنا، بدل دینا۔ ذرا دیکھیے کہ مندرجہ ذیل قرآنی آیات کا اشارہ آسمانی کتابوں کے اصلی "متن" کی جانب ہے یا اس سے مراد ان صحیفوں کی "شرح و تعبیر" لی جا رہی ہے۔ مفسرین قرآن نے دونوں موقف اختیار کیے ہیں لہٰذا آیات کی معنویت کو سمجھنے کے لیے مسلمانوں کے پاس مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔

مِنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا .... وَلَوۡ اَنَّهُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ وَانۡظُرۡنَا لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ (۴:۴۶)

یہود میں سے ایک گروہ، زبان کو توڑ مروڑ اور دین پر طعن کرتے ہوئے، الفاظ کو ان کے موقع محل سے ہٹا دیتا ہے اور "سمعنا وعصینا" (ہم نے سنا

اور نہ مانا) کہتا ہے۔.... اگر وہ ''سمعنا واطعنا'' (ہم نے سنا اور مانا) کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

غور کیجیے کہ اس آیت میں قرآن مجید نے کوئی عمومی فیصلہ صادر نہیں کیا بلکہ یہودیت کے ماننے والوں میں سے ''بعض لوگوں'' پر تنقید کی ہے۔ اگر معاملہ شرح و تعبیر ہی کا ہے تو اس قول کی صداقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کیونکہ ہر دین کے ماننے والے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ہم مذہبوں میں سے کچھ لوگ اپنی کتاب کے معنی و مفہوم میں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن مجید کی ایک آیت درج ذیل ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا

(۵:۱۳)

پس ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کر دی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے۔

اس آیت میں قرآن مجید نے ہدایت اور گمراہی کو صحیفۂ خداوندی کی متن میں تحریف کرنے سے متعلق کیا ہے۔ یہود میں سے وہ جو اللہ سے وعدہ کر کے اس سے پھر گئے تھے ان کے دل عذابِ الٰہی کی وجہ سے سخت ہو گئے۔ دل کا سخت ہونا وہ اصطلاح ہے جو قرآن مجید نے ان تمام نتائج اور خرابیوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال کی ہے جو اللہ سے روگردانی کرنے والے لوگوں کا مقدر ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد ہے عقل کا کند ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کی

رحمت، کرم اور جمال کی صفات سے تعلق کمزور پڑ جانا۔ وہ جن کے دل سخت ہو جاتے ہیں وہ اللہ سے مزید دور ہو جاتے ہیں اور زیادہ گمراہی میں دھنس جاتے ہیں۔ پس وہ اپنے صحیفوں کے معانی میں تحریف کرنے لگتے ہیں۔ انبیاء ان کو اللہ کی یاد دلانے کے لیے آئے تھے لیکن ان لوگوں نے انبیاء کے پیغام کا کچھ حصہ فراموش کر دیا۔ فراموشگاری کے اس عمل کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی مقدس کتاب کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ اس سے اشارہ صرف اس امر کی طرف ہے کہ یہ سخت دل لوگ ذکرِ خداوندی کے معانی کو ''سمجھنے'' سے محروم ہو چکے تھے یعنی یہ بھول گئے کہ پیامِ خداوندی اسی صحیفے کے قالب میں عطا ہوا ہے۔

اسی موضوع کی ایک اور آیت میں قرآن مجید نے رسولِ خدا کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے اردگرد جو یہود ہیں وہ اگر آپ کے پیغامِ ہدایت پر کان نہیں دھر رہے تو آپ ان کے لیے دلگیر نہ ہوں۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡھُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَ ھُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ (۲:۷۵)

کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں۔

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگر صحیفۂ خداوندی میں اپنے من چاہے معانی تلاش کرنے کی پرانی عادت ترک نہ کی جائے تو اسلام قبول کرنا کافی نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں بھی وہی معاملہ ہے کہ آیت میں موردِ عتاب ''ان میں

ایک گروہ" ہے۔سارے یہود اس کے مخاطب نہیں ہیں۔

بعض مسلمان علمائے الہیات کی مناظرے کی حس قدرے زیادہ بیدار تھی۔ ان حضرات نے تورات وانجیل میں اس نظر سے تحقیق کی کہ یہود ونصاریٰ کے تحریف ِ صحائف کے ثبوت تلاش کیے جائیں۔اس سلسلے کا پہلا مفصل اور منظم تحقیقی کام اندلس کے مشہور عالم ابن حزم (م ۱۰۶۴/۴۵۶) نے انجام دیا تھا۔خدا کی کتاب کا تصور اسلام اور یہود و نصاریٰ میں مختلف ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ عیسوی اور یہودی مصاحف میں طرح طرح کی بہت سی کتب شامل ہیں جو الگ الگ زمانوں میں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے لکھی گئیں۔ان دونوں امور کو سامنے رکھیے تو یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوگا کہ مسلمان علماء کو جرح ونقد کا بہت سا مواد دستیاب ہوا۔مزید براں یہ ناقدین اکثر انہی باتوں کو دہراتے رہے ہیں جو عیسائی فرقوں کے باہمی مناظرات کی تحریروں میں پہلے سے ملتی تھیں یا پھر انجیل کے ان ناقدین کی لکھی ہوئی تھیں جن کی اکثریت اسلام سے پہلے ہو گزری تھی۔ان میں Samaritons یہودی۔ عیسائی، Karaites، Gnostics، یونانی فلاسفہ اور مانویت کے ماننے والے سبھی شامل تھے۔اسلام کے بارے میں لکھنے والے بعض مورخین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عہدِ جدید میں انجیل کے جو تنقیدی مطالعات ہوئے ہیں اور جو انجیل کے بارے میں مسلمانوں سے بڑھ کر شدت سے تنقید کرتے رہے ہیں ان کے بہت سے خیالات کا مآخذ مسلمانوں کی یہی مناظرانہ تحریریں ہیں۔۵۲

قرآن مجید میں پیغمبروں کے ذریعے آنے والے پیغامِ خداوندی کو بالعموم "کتاب"، یعنی مصحف یا صحیفہ کا نام دیا گیا ہے۔اس لیے کسی ایک نبی کے ماننے والوں کو "اہلِ کتاب" کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔قرآن میں تیس مقامات پر

اہلِ کتاب کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان میں سے اکثر آیات کو پڑھنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے کہ یہی دو ادیان ایسے تھے جن کے ماننے والوں سے ابتدائی زمانے کے مسلمانوں کا سامنا ہوا تھا۔ دو آیات میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ''اہل الذکر'' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔

جن آیات میں ''اہل کتاب'' کا ذکر ہوا ہے ان میں اسلام سے پہلے کے مذہبی منظر نامے کی تصویر کے دونوں رخ بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی کتاب پر عمل کرتے ہیں لائق تحسین ہیں اور جو لوگ انبیاء کے لائے ہوئے پیغامِ ہدایت کی پیروی نہیں کرتے قابلِ مذمت اور لائقِ ملامت۔

وَدَّ کَثِیۡرٌ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَوۡ یَرُدُّوۡنَکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِکُمۡ کُفَّارًا حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِہِمۡ (۲:۱۰۹)

بہت سے اہلِ کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان کے بعد پھر تمہیں کفر کی حالت میں پلٹا دیں، محض اپنے حسد کی وجہ سے۔

"لَیۡسُوۡا سَوَآءً مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ یَّتۡلُوۡنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیۡلِ وَہُمۡ یَسۡجُدُوۡنَ ۔ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۔ وَمَا یَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلَنۡ یُّکۡفَرُوۡہُ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ (۳:۱۱۳-۱۱۵)

سب اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ یہ رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت اور سجدہ کرتے ہیں، اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے

ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور یہ لوگ صالحین میں سے ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے تو اس سے محروم نہیں کیے جائیں گے۔

قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ کی باہمی عداوت پر سختی سے تنقید کی ہے۔ دونوں کتابِ خداوندی کے ماننے والے، توحید اور نبوت کو تسلیم کرنے والے ہیں، پھر ان میں دشمنی اور لڑائی کیسی؟ پہلی آیت خاص طور پر غور کرنے کے لائق ہے کیونکہ اس میں ان لوگوں پر عمومی گرفت کی گئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہودیت اور مسیحیت دونوں بے بنیاد دین ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (۲:۱۱۳)

اور یہود نے کہا، نصاریٰ کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ نے کہا: یہود کی کوئی بنیاد نہیں اور یہ دونوں کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح کی بات ان لوگوں نے بھی کہی جن کو علم نہیں ہے۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ

کہ دو: اے اہلِ کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ

دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۰ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ

وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْ بَعْدِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۳:۶۴-۶۵)
کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اک
دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو کہہ دو کہ
گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ اے اہلِ کتاب تم ابراہیم کے بارے میں
کیوں حجت کرتے ہو درآنحالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی مگر اس
کے بعد! کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے؟

قرآن مجید کی بہت سی اور آیات میں بھی یہودیت اور مسیحیت کا مذکور ہے مگر ان سب کا جائزہ ایک الگ کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک عمومی تصویر کھینچنے کے لیے جس قدر درکار تھا وہ ہم نے پیش کر دیا ہے۔۵۳

عیسوی اور اسلامی نقطۂ نظر کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے ایک نکتے پر البتہ کچھ اور وضاحت درکار ہو گی۔ عیسائیوں کے لیے "الکلمۃ" the Word سیدنا عیسیٰؑ کی ذات ہے۔ "اللہ کا کلمہ بدن کے قالب میں (word made flesh)- اناجیلِ مقدس وہ الہامی کتب ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لکھی گئیں۔ عہد نامہ جدید سارے کا سارا کلمۂ خداوندی کا رنگ لیے ہوئے ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ کے مقابلے میں یہ سب کتب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں کہ سیدنا عیسیٰؑ کلمۂ مجسّم ہیں۔ عہد نامۂ جدید کے بغیر تو عیسائیت کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کو زبانی روایتِ مصحف کا سہارا میسر ہو لیکن عیسائیت ہو اور سیدنا عیسیٰؑ نہ ہوں یہ نا قابلِ تصور ہے۔

مسلمانوں کے لیے کلام اللہ قرآن ہے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر۔ یہ درست ہے کہ وہ کامل انسان، خلیفۃ اللہ اور وہ نمونہ اور اسوہ ہیں جس کے

اتباع کے لیے اللہ نے لوگوں کو حکم دیا ہے مگر یہاں اللہ کا پیغام اولین حیثیت رکھتا ہے اس کا پیام لانے والا نہیں۔ اسلام کا تصور رسولِ خداؐ کے بنا تو ممکن ہے لیکن قرآن کے بغیر اسلام کا تصور کرنا بعید از خیال ہے۔

مسلمان دوسرے مذاہب کو اسلام کے پیمانے پر پرکھتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں دینِ کامل ہے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ظاہر ہے کہ اپنے نقطۂ نظر سے نگاہ کرتے ہیں۔ یہ وصف مسلمانوں ہی سے خاص نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو توقع ہوتی ہے کہ دوسرے ہر مذہب کی بھی قرآن کی طرح کی کتاب ہو گی۔ یہ خیال قرآن مجید کی وجہ ہی سے ان میں پروان چڑھتا ہے کیونکہ قرآن میں تورات و انجیل کا بار بار ذکر آیا ہے۔ لیکن غور کیجیے کہ قرآن میں انجیل کا ذکر ہمیشہ صیغہ واحد میں آیا ہے، جمع میں نہیں۔ قرآن نے یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ سیدنا مسیح پیغمبرِ خدا، انجیل کا پیغامِ ہدایت لے کر آئے تھے ایسے ہی جیسے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اناجیلِ اربعہ Four Gospels کا ذکر آتے ہی فوراً کھٹک جاتے ہیں۔ صحیفۂ خداوندی سے متعلق انسانی اور ربانی عناصر کے بارے میں نقطۂ نظر کا بھی فرق ہے جس سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ختم نہ ہونے والی غلط فہمیوں کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔

دیگر ادیان بالخصوص یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو بطور خلاصہ بیان کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے: قرآن مجید پڑھتے ہوئے بہت سے مسلمان ان آیات پر زور دیتے ہیں جن میں دوسرے ادیان پر تنقید کی گئی ہو اور وہ آیات نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کی تاویل کر لیتے ہیں جن میں دیگر ادیان کے بارے میں تعریفی کلمات آئے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ بعض قرآنی

آیات سے اسلام کے واحد دینِ برحق کا مفہوم پوری شدت سے ظاہر ہوتا ہے تاہم کتنی ہی دیگر آیات ایسی ہیں جن کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ دیگر مذاہب کے لیے ایک کھلے رویہ کی گنجائش اور سمائی ہوسکتی ہے۔ اس مسئلے پر مسلمانوں کے جو مؤقف سامنے آتے ہیں ان کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کی حقیقت کے بارے میں ان کا فہم کیسا ہے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے واقعی بڑھی ہوئی ہے اور ان سب لوگوں کو اپنے دامانِ رحمت میں سمیٹے ہوئے ہے جو ہدایتِ خداوندی کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے لیے تمام ادیان کو ربانی پیغامِ ہدایت کے طور پر دیکھنا کوئی مشکل نکتہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اللہ کا تصور ایک سخت گیر، متلون اور مزاج دار آقا کے طور پر کرتے ہیں، ایسا آقا جو احکامات صادر کرتا رہتا ہو اور ان احکامات کی فوری تعمیل اور بے چوں و چرا پابندی کا منتظر ہو، انہیں یہ خیال زیادہ راحت بخش محسوس ہوتا ہے کہ صرف وہی (ان کا مذہبی گروہ/ان کی سیاسی جماعت) اللہ کے ہاں مقبول ہیں۔

پیغامِ حق کی اجارہ داری کے دعووں کے مقابل بسا اوقات بہترین رویہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا سامنا ایک خندۂ وافر سے کیا جائے اور معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ اسی نیت سے ہم اس حصے کو اختتام ایک حکایتِ لطیف پر کرتے ہیں۔ اس کے راوی ایک عالمِ دین ہیں جن سے برسوں پہلے ہم نے یہ حکایت سنی تھی۔

دو ایرانی علماء دین پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے سوال کیا، ''تو پھر آخرالامر کون جنت کا حقدار ہوگا''؟ دوسرے صاحب شاعر بھی تھے اور اپنی حسِ مزاح کے لیے معروف تھے۔ وہ جواب میں گویا ہوئے ''بھئی، یہ تو بہت

سادہ سی بات ہے ۔اسلام کے سوا دیگر تمام ادیان جھوٹے ہیں لہٰذا ان کو تو چھوڑیئے ایک طرف ۔ رہ گیا اسلام ۔اب اسلام میں بعض سنی مسلمان ہیں بعض شیعہ ۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ سنی راہِ راست سے بھٹک گئے ہیں لہٰذا ان سبھوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا ۔باقی بچے شیعہ مسلمان ۔اب ان میں دو طرح کے لوگ ہیں،عوام اور علماء ۔سب جانتے ہیں کہ عوام اللہ سے غافل اور دین سے لاپرواہ ہوتے ہیں سو ان کو تو آگ میں جلایا جائے گا ۔رہ گئے علماء سو وہ عالم بنے ہی اس لیے ہیں کہ عوام پر حکم چلا سکیں تو جہاں پر جا وہاں راجا ۔باقی بچے تم اور میں ۔سو تمہارے بارے میں بھی ٹھیک سے کچھ کہنا مشکل ہے ''۔

کیا آپ کو یہ طرزِ استدلال مانوس لگتا ہے؟ کچھ بہت غلط نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے معاصرین میں سے بہت سے لوگ اسی انداز میں سوچتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں،عیسائی اور یہودی ہوں،علماء اور سائنسدان ہوں،سیاستدان ہوں یا کچھ اور ۔یاد رہے کہ یہ موقف ابلیس کے موقف سے خاصا ملتا جلتا ہے جس کا دعویٰ تھا ''انا خیر منہ'' (میں اس سے بہتر ہوں)

## The Quran القرآن

اس کتاب کے آغاز ہی سے ہم نے قرآن کی خاص حیثیت پر زور دیتے آئے ہیں ۔اسلام کے معنی اور اس کے مراسم و عبادات کو متعین کرنے میں قرآن مجید کا جو حصہ ہے وہ حتمی اور ناگزیر ہے ۔قرآن پیغامِ حق ہے اور پیغامِ حق اسلام ہے ۔لیکن اگر اس پیغام کو چند لفظوں میں بیان کرنا ہو تو کیسے کیا جائے گا ۔

قرآن اپنے بارے میں جو کچھ کہتا ہے،اپنی تعریف جس طرح متعین کرتا ہے

اس سے اسلام کے تصورِ نبوت کے اساسیات کے بارے میں ایک نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ایک طرف تو قرآن نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کا اطلاق الہامی کتابوں پر بھی ہوتا ہے اور دوسری جانب قرآن اپنے آپ کو دیگر تمام کتب سے برتر قرار دیتا ہے۔پس اپنے بارے میں قرآن نے جو کچھ کہا اس سے دونوں تصورات کو بنیاد ملتی ہے کہ اللہ کے پیغامِ ہدایت عام اور عالمگیر بھی ہوتے ہیں اور ان میں بعض اپنی ایک خاص شان رکھتے ہیں۔قرآن نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اسے سمجھنا ہو تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن نے اپنے لیے جو اسماء وصفات برتے ہیں ان کے مفاہیم اور مدلولات پر غور کیا جائے۔

قرآن کے متن میں خود ''قرآن'' کا لفظ ستر دفعہ آیا ہے۔اس کا مصدر وہ مادہ ہے جس کے دو بنیادی معانی بظاہر ایک دوسرے سے غیر متعلق لگتے ہیں۔ایک معنی ہیں ''پڑھنا'' اور دوسرے ''یکجا کرنا، اکٹھا کرنا''۔عام طور پر ''قرآن'' کے نام کے معنی ''پڑھنا قرأت'' بتائے جاتے ہیں۔ایک معروف روایت کے مطابق قرآن کا پہلا لفظ جو رسول خدا پر وحی کے طور پر اترا وہ تھا ''اقراء'' (پڑھیے)۔یہ لفظ اسی سہ حرفی مادے سے امر کا صیغہ ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ٠ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٠ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ٠ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ٠ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۹۶:۱-۵)

انہیں پڑھ کر سناؤ (اے پیغمبر) اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔لہو کی ایک پھٹکی سے انسان کو پیدا کیا ہے۔انہیں پڑھ کر سناؤ اور واقعہ یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے

یہ قرآن سکھایا انسان کو اس میں وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

ان چند آیات میں ہمیں نہ صرف ''قرآن'' کے نام کی جڑ بنیاد کا پتا چل جاتا ہے بلکہ انسان اور خدا کے مابین جو ایک لازمی اور اساسی تعلق ہے اس کا نقشہ بھی سامنے آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے جس نے اپنے کرم اور رحمت سے انسان کو اس کی منزلِ آخرین کی حقیقت کا علم دیا اور اس طرح اسے راہِ تکمیل کے لیے ہدایت فراہم کی۔

اس نام ''قرآن'' میں ایک اور اہم نکتہ مضمر ہے جس کی معنویت کو جدید دنیا میں رہنے والوں کے لیے گرفت میں لانا دشوار ہے۔ قرآن سب سے پہلے ایک ''تلاوت کردہ'' کتاب ہے، ''کتابِ خواندگی'' ہے۔ اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کا لکھنا، اس کی تحریری صورت تو محض سہولت کے لیے اور انسانی کمزوری کی رعایت رکھتے ہوئے وجود میں آئی ہے۔ قرآن کو خدا کے فرشتے حضرت جبرئیل نے رسولِ خداؐ کو پڑھ کر سنایا۔ آپؐ نے اسے یاد کر لیا اور اپنے ساتھیوں کے سامنے پڑھا۔ صحابہؓ نے آپؐ سے سن کر یاد کیا۔ جو لوگ لکھنا جانتے تھے انھوں نے لکھ بھی لیا۔ وہ جن کے حافظے ابھی لکھے ہوئے حرف پر انحصار کرنے سے بے توقیر نہیں ہوئے تھے قرآن کو زبانی یاد کرتے رہے۔ اس زمانے کے عربوں کو اپنی یادداشت پر اتنا ناز تھا اور انھیں ہر اہم بات کو یاد رکھنے کی ایسی پختہ عادت تھی کہ ان میں سے اکثریت نے متنِ قرآنی کو کبھی کاغذ پر لکھنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ رسولِ خداؐ کی وفات کے کئی سالوں بعد لوگوں نے اس جانب توجہ کی کہ اسلام کا ماحول تیزی سے بدل رہا ہے اور نئے حالات میں خطرہ تھا کہ قرآن کے متن کے کچھ حصے ضائع ہو جائیں یا ان میں غلطیاں در آئیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے رہبرِ وقت نے قرآن مجید کے تحریری

نسخے تیار کر کے عالمِ اسلام کے مختلف مقامات پر ارسال کرنے کا حکم دیا تا کہ ان سرکاری نسخوں سے ملا کر سب لوگ اپنے نسخے درست کر سکیں۔

آج ہم جس معاشرے میں زندہ ہیں وہ قوتِ حافظہ کھو چکا ہے۔ ہمارا تمام تر انحصار تحریر پر ہے یا پھر ہم سیکھنے سکھانے اور معلومات فراہم کرنے کے لیے برقی، الیکٹرونک آلات کے محتاج ہیں۔ ساری دنیا میں تحریری زمانے سے پہلے کے تمام معاشروں میں لوگوں کی قوتِ حافظہ ایسی ہوتی تھی کہ آج اسے سوچ کر بھی دماغ چکرا جاتا ہے۔ یہی نہیں آج ہم خود سے یہ بھی کہتے ہیں کہ چھوڑیئے صاحب، یہ کیا لغویت ہے، یادداشت میں محفوظ کرنے کے لیے اتنی مشقت کرنے کا بھلا کیا فائدہ ہے!"

ہم بہت سے ایسے حقائق فراموش کر بیٹھے ہیں جن کو گزرے وقتوں میں اسلام ہی میں نہیں دوسرے معاشروں میں بھی بدیہی سمجھا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک حقیقت یہ تھی کہ ہم وہی ہیں جو ہم جانتے ہیں یعنی ہماری شناخت ہمارا علم ہے۔ زندگی کا ایک مقصد ہے اور انسان اس مقصد کے حصول کے لیے اس دنیا میں آیا ہے لیکن اگر اس مقصد کو جانا ہی نہ جائے تو منزلِ مقصود تک رسائی شاید ہی ممکن ہو۔ اپنے انسان ہونے کے بارے میں جاننا ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ ماضی کی ہدایتِ خداوندی کو اپنے اندر جذب کیا جائے۔ اس ہدایت کو اپنی اولاد کی نسل تک منتقل کرنے کا اس سے آسان تر اور کوئی طریقہ نہیں کہ اسے سینہ بہ سینہ یادداشت انسانی میں ثبت کر دیا جائے۔ اگر اس ہدایت کو ان کے سینوں میں محفوظ کرنے کے بجائے صرف حیطۂ تحریر میں بند کر دیا جائے گا تو گویا ہم نے تعلیم وتربیت کے فریضے کو خیرباد کہہ دیا۔ اب یہ یقینی ہے کہ سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کی اکثریت جو اس

پیغام کو قبول کر سکتی تھی دوسرے کاموں میں الجھ جائے گی اور ایسے کام ان کو اپنی طرف کھینچ لیں گے جو انسانی زندگی کے مقصد سے سرے سے لگا نہیں کھاتے ہوں گے۔ ہم یہ بھی بھول چکے ہیں کہ کسی چیز کو زبانی یاد کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب اس یادداشت کے طریقے انسانی رہن سہن اور تہذیب میں پہلے سے اپنی جگہ بنائے ہوئے ہو۔ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ بچے اسفنج کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ بہت کچھ زبانی یاد کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں بلکہ ان کو جس رسمی تعلیم اور پڑھائی کا بوجھ مجبوراً اٹھانا پڑتا ہے اس کے باوجود بھی وہ اتنا کچھ یاد کر لیتے ہیں۔ اگر ان کی ذہنی پرورش ناقص غذا پر کی جائے تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ مزاحیہ کتب کے کرداروں کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ جدید تہذیب سے باہر نکل کر دیکھیے تو بہت سی دیگر تہذیبوں میں بچوں کی ذہنی پرورش کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کا روایتی ادب ابتدائے عمر ہی سے پڑھایا جاتا تھا۔ اور وہ یہ سوچتے اور جانتے ہوئے پروان چڑھتے تھے کہ انہیں اپنی زندگیاں رحمت اور حکمت کی عظیم انسانی مثالوں کے نمونے پر ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتابیں ان کے رگ و پے میں اتر جاتی تھیں اور ساری عمر ان کے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے کا کام دیتی تھیں جس سے وہ ہمیشہ نشاطِ فکر حاصل کرتے رہتے۔

روایتی اسلامی ماحول میں تعلیم کا آغاز قرآن مجید یاد کرنے سے ہوتا ہے کہ یہی حکمت کا بلند ترین درجہ ہے۔ اس کے بعد علم کے کسی بھی شعبے کا انسان رخ کرنے پہ اس کے لیے ایک لازوال سرچشمۂ الہام کا کام دیتا رہتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے عظیم ترین اور دانا ترین افراد نے ہمیشہ یہی اعتراف کیا ہے کہ انہیں جو کچھ آتا ہے وہ قرآن مجید کے بحرِ بیکراں کے چند قطروں سے زیادہ نہیں۔

قرآن کے الفاظ کو یاد کرنے اور اس کو اپنے جزوِ ہستی بنانے کا ایک اشارہ تو خود لفظِ قرآن کے معنی میں ملتا ہے۔قرآن کو پڑھا نہیں جاتا اس کی قرأت کی جاتی ہے۔اس کی تلاوت ہوتی ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ قرآن کو آواز کے ساتھ اس طرح پڑھا جاتا ہے کہ اس کے قدرتی آہنگ کا ظہور ہو سکے۔پڑھنے والا اس کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے جھومتا بھی رہتا ہے۔کسی عالمانہ کتاب کا ایک پیراگراف یاد کرنے کے مقابلے میں ایک گیت یاد کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۱۷:۵٤)

اور ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لیے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی سوچنے والا؟

قرآن کو یاد کرنے میں آسانی اس لیے بھی ہو جاتی ہے کہ اس کی آیات میں ایک حسین صوتی آہنگ اور تناسب پایا جاتا ہے۔قرآن کے ترجمے میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔

مسلمان یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔اس کا مطلب یہ کہ اللہ تعالٰی نے انسان سے عربی میں کلام کیا ہے اور عربی زبان کلمۃ اللہ کا، اللہ کے کلام کا قالب ہے۔ جیسا کہ علماء نے لکھا ہے اسلام میں کلمۃ اللہ کی تجسیم Incarnation (گوشت پوست میں ڈھلنا) قالب اختیار کرنا enfleshment کا کوئی ذکر نہیں ہو سکتا، یہاں کلام اللہ کتاب کی صورت اختیار کرتا ہے۔اسے ہم ''انکتاب'' enbookment کہہ سکتے ہیں۔اسلام میں کلمۃ اللہ نے گوشت پوست کا قالب اختیار نہیں کیا۔اس کا ''اوتار'' بدنِ انسانی میں نہیں

ہوا بلکہ کلمتہ اللہ کتاب کی صورت ظاہر ہوا۔پھر یہ کتاب ان گنت کتب خانوں میں پھیلتی چلی گئی۔تاہم اصل کتاب لکھی ہوئی نہیں تھی، اسے پڑھا اور سنا گیا تھا اور ایسی کتاب جس کی تلاوت کی جاتی ہو، جسے قرأت کے وسیلے جانا جاتا ہو وہ انسانوں کا جزوِ بدن بن جاتی ہے۔تلاوت کے صوت و آہنگ کا انسانی بدن پر براہ راست اثر ہوتا ہے۔قرآن کی تلاوت سے انسان اسے اپنے اندر اتار لیتا ہے۔پھر کتاب کا یہ اوتار بالواسطہ طور پر کلمتہ اللہ کی ''تجسیم'' کر دیتا ہے۔کتاب اللہ کو اس طرح مجسّم کرنے کی اعلیٰ ترین مثال خود سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے جن کی سنت وہ آدرش، وہ اسوۂ کامل ہے جس تک پہنچنے کی ہر مسلمان آرزو رکھتا ہے۔آپ ؐ کی رحلت کے بعد آپ ؐ کی زوجہ محترمہ سیدہ عائشہؓ سے کسی نے آپ ؐ کے اخلاق کے بابت استفسار کیا۔سیدہ عائشہؓ نے فرمایا ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا''؟ سوال کرنے والے نے کہا، ''بے شک پڑھا ہے'' حضرت عائشہؓ نے کہا ''کان خلقه القرآن'' ۵۴؎ (آپ سراسر قرآن منش تھے)

آپ ؐ نے اپنے اصحاب کو جو دعائیں تعلیم فرمائی تھیں ان میں سے ایک میں یہ الفاظ آئے ہیں: ۵۵؎

خداوندا! تجھ سے سوال کرتا ہوں.... کہ تو قرآن کو اور علم کو میرا رزق بنا دے، اور میرے گوشت پوست، میرے خون، میرے چشم و گوش کو قرآن میں رنگ دے اور میرے بدن کو اس میں مشغول کر دے۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کر رہے کہ قرآن کے پیامِ ہدایت کی ایک فکری، استدلالی اور عقلی جہت بھی ہے جس کو جاننے کے لیے تلاوتِ متن کے سوا بھی کوشش کی جا سکتی ہے، اسے فہمِ انسانی کی گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔اگر یہ بات نہ ہوتی تو

ہم یہ کتاب لکھنے کی زحمت نہ کرتے۔تاہم یہ کہنا بعید از صداقت ہوگا کہ قرآن کا پیغام محض مطالعہ کتابِ خداوندی سے پوری طرح جذب کیا جا سکتا ہے۔ہم نے عرض کیا تھا کہ اسلام میں ایمان کا لازمی تقاضا عمل بھی ہے۔تمام اسلامی عبادات میں سب سے بنیادی عبادت نماز ہے اور نماز مجموعہ ہے بدن کی دہرائی جانے والی حرکات،سکنات اور تلاوتِ قرآن کا۔یہ سب چیزیں قرآن مجید کو نماز ادا کرنے والے شخص کا جوہرِ ہستی بنا دیتی ہیں۔مسلمان جس حد تک اپنی زندگی میں اپنے دین کو ایک حقیقت بناتا ہے اس حد تک قرآن مجید اس کے دل،اس کے دماغ اور اس کے ''بدن'' کی حقیقت بنتا چلا جاتا ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ بدن بھی نور کے ایک وسیلے کے طور پر کام کرتا ہے بلکہ دور تک تجزیہ کریں تو بدن بھی نور ''ہی'' ہے ہم اسے تیرگی اور ظلمت صرف اس لیے کہتے ہیں کہ روح کے نور کے مقابل یہ تیرہ و تاریک معلوم ہوتا ہے۔لیکن اگر اس امر پر نظر رکھی جائے کہ خود بدن بھی نور ہی کا ایک مظہر ہے تو پھر یوں بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی نورانیت میں اضافہ ہو جائے۔اس میں ظاہر ہونے والا نور درخشندہ تر اور روشن تر ہو جائے۔تلاوتِ قرآن (مطالعہ نہیں) کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے کلام کی نورانیت کے لیے گویا انسان کے ہر بُنِ مو کو کھول دیتی ہے۔روایتی اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اسی بات سے مسلمان ممالک میں دیکھی جانے والی ایک عام چیز کی وضاحت ہوتی ہے۔ان ممالک میں اکثر اور دیگر جگہوں پر بھی یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بہت سے لوگ،کیا مرد کیا عورت،بڑھتی عمر کے ساتھ حسین تر ہوتے جاتے ہیں۔اسلامی زبانوں میں ایسے لوگوں کے بارے میں عام طور پر یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب یا صاحبہ،بڑی ''نورانیت'' لیے ہوئے ہیں۔ان کے وجود میں جاری و

ساری نورِ خداوندی نے اللہ سے ان کے قرب کی وجہ سے ان کے بدن کو بھی منقلب کر دیا ہے۔ جن ممالک میں بدھ مت کا چلن ہے وہاں ایسے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں ''خالی ہونے کی صفات'' نمودار ہوئی ہیں یا یہ کہ ہم سب انسانوں میں جو ایک سرشتِ گوتم (Buddha nature) مخفی ہے وہ اپنا ظہور کر رہی ہے۔

قرآن خود نور ہے جیسا کہ اس کی بہت سی آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور ایمان وعمل کے وسیلے قرآن مجید کو مجسم کرنے کا مطلب ہے اس نور سے اپنی قلبِ ماہیت کرنا۔ اس نور کی روشنی میں اپنا آپ بدل ڈالنا اور نور کی ساری صفات کو واقعی اپنے اندر پیدا کرنا۔ نور کی صفات اللہ کی صفات ہیں۔

جدید دنیا میں رہتے ہوئے سوچیں تو اس بات کا تصور دشوار محسوس ہوتا ہے کہ ایک کتاب اس قدر اہم کیسے ہوسکتی ہے۔ اپنی ساری زندگی اس کتاب کو عملِ مجسم کی صورت دینے میں صرف کہ دینا ہمیں ایک خوفناک حد تک محدود کر دینے والا تجربہ، ایک قید و بند محسوس ہوتا ہے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہستیِ انسانی کی کتنی ہی اہم سمتوں اور جہات سے خود کو کاٹ کر ہمیں اس تنگنائے میں اپنی سمائی کا اہتمام کرنا ہوگا۔ لیکن اس طرح کی سوچ اور اس نوعیت کے فیصلے صرف ایک جدیدیت زدہ ذہن میں اُبھرتے ہیں جس کے پاس کتاب کے مغربی تصور کے سوا اور کوئی تصور نہ ہو۔ کتاب کیا ہوتی ہے، مغرب اسے نہیں جانتا، کہ آج کے جدید انسان کے پاس کتاب کے نام پر دو ہی چیزیں ہیں، ناول اور سکول کا نصاب۔ اگر قرآن مجید میں کسی ناول یا نصابی کتاب سے مشابہت کا شائبہ بھی پایا جاتا تو ہم یہ تقیید گوارا کر سکتے ہیں۔

یہ کتاب آخر ہے کیا چیز؟ یہ سوال اس استفسار کے مترادف ہے کہ یہ دین آخر

کیا ہے، یہ کتاب ہی دین ہے اور یہ دین کتاب۔ اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے ادیان کے بارے میں بھی یہی بات سچی ہے۔ اسلام اس معاملے میں دوسرے ادیان سے الگ ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ بات زور دے کر کہہ رہے ہیں کہ قرآن مجید ایک کتاب ہے۔ ہاں اگر ہم اپنی اصطلاحات کو ذرا وسیع اور عالمگیر معنی میں استعمال کریں اور یہ کہیں کہ قرآن کلمتہ اللہ ہے، اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود کو ظاہر کیا ہے تو پھر دوسرے ادیان میں اس سے مشابہ اور ہم معنی تصورات تلاش کرنا کہیں آسان ہو جائے گا۔ روایتی یہودیوں کے لیے اپنے وسیع ترین معنوں میں تورات کا یہی کردار تھا اور روایتی عیسائیوں کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کلمتہ اللہ کی تجسیم تھے۔ اور اسی سے عیسوی روایت کو اپنی پوری حقیقت میسر آئی تھی۔

اسلام کے تناظر میں رہتے ہوئے دیکھیے تو یہ قطعاً کوئی جبر یا پابندی نہیں ہے کہ انسان قرآن مجید کو اپنے عمل میں مجسم کرنے کے لیے عمر بتا دے۔ اس کے برعکس انسانوں کی ہر وہ کدوکاوش جو اس کے سوا ہو گی اس سے انسان کے امکانات سے صرفِ نظر ہو جائے گا اور ہمارے دل اور ہمارے دماغ اپنے آپ کو اس حقیقت سے بیگانہ کر دیں گے کہ ہم کیا ہیں، انسان کیا ہے۔ قرآن کے معنی کے بارے میں یہ نقطۂ نظر تبھی سمجھ آئے گا جب ہم اسلام کے تین اصولوں کو پیش نظر رکھیں گے۔ اگر ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے سماجیات، تاریخ، فلسفہ یا جدید علوم میں سے کسی اور نقطۂ نظر کو اختیار کیا تو پھر زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ہمارے ہاتھ میں ایک اجنبی کا مرتب کردہ جائزہ رہ جائے گا جو اس عجیب سی چیز کو بنظرِ تماشہ دیکھ رہا ہو گا۔ بہت ہوا تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں میں بھی ایسے ہی ملتے جلتے

تصورات پائے جاتے ہیں۔لیکن اگر یہ دریافت کرنا ہو کہ اسلام اپنے آپ کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اس کا تصور اپنے بارے میں کیا ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ایک مرتبہ پھر اس بات پر غور کریں کہ خدا کیا ہے، انسان ہونے کا مطلب کیا ہے اور خدا اور انسان کے مابین سب سے بہتر اور مطلوب رشتہ کیا ہونا چاہیے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس میں اس نے اپنا آپ ظاہر کیا ہے۔اسی طرح انسان صورتِ خداوندی ہے لہٰذا اس کا اظہارِ ذات۔لیکن قرآن لفظ اور آواز کے وسیلے سے ظاہر ہوتا ہے جبکہ انسان جسم اور روح کی صورت میں۔قرآن کی صورتِ ظاہری مکمل طور پر ظاہر ہو چکی یعنی یہ کہ قرآن ایک مرتبہ نازل ہو چکا اور اب کبھی تبدیل نہیں ہو گا۔لیکن انسانوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی پیدائش سے لے کر موت تک اس دنیا میں پوری طرح موجود ہو۔قرآن سارے کا سارا ہمارے سامنے ہے لیکن ہم میں سے کوئی انسان بھی تماماً یہاں نہیں ہے۔ہمارا عہدِ طفلی گذر چکا اور ہمارا بڑھاپا ابھی وارد نہیں ہوا۔یہ کیسے تصور کیا جائے کہ وہ شیر خوار بچہ جو کل تھا اور وہ خستہ و درماندہ پیرِ ناتواں جو کل ہو گا، ایک ہی ہستی ہیں۔لیکن واقعہ یہی ہے۔اس بات کو بیان میں لانا ذرا مشکل ہے۔

اس عمرِ دراز (انشاءاللہ) کے اس سارے پھیلاؤ کے بیچ آپ کی اصلی ذات کہاں واقع ہے۔یہ مقامِ غور ہے۔واقعہ یہ ہے کہ آپ حقیقت میں جو کچھ ہیں، آپ کا اصلی اپنا آپ، زندگی کے اس راستے کے ہر ہر قدم پر اس کی ایک تجسیم اور اس کی ایک نہ ایک صورت موجود رہتی ہے۔لیکن آپ کی حقیقتِ ذات ہمیشہ ایک راز بنی رہتی ہے۔ایک خدائی بھید جس کی نسبت، جس کا ناطہ روحِ خداوندی کے ساتھ ہے۔وہی جس کے بارے میں خدا نے کہا تھا:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷:۸۵)

اور تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور تم کو تو بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے۔

خدا کے زبانی کلام یعنی قرآن مجید اور اللہ کی صورتِ مجسم یعنی نوعِ انسانی میں جو ہم نے موازنہ کیا تو اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں سے یہ نکتہ سامنے لایا جا سکے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے جبکہ انسان کے معاملے میں ہم پورے انسان کو کبھی بھی نہیں دیکھ پاتے۔ کیونکہ ہم جس جگہ سے انسان پر نظر ڈالتے ہیں وہ پورے انسانی وجود کی نشوونما اور وقت کی بساط پر اس کے سفر کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا کہا جا سکتا ہے۔ یہ سفر اس دنیا میں ہماری زندگی سے پہلے بھی جاری تھا اور ہماری موت سے آگے بھی اس کے مراحل کھلتے اور پھیلتے جائیں گے۔ پس قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا مکمل پرتو ہے جو اس کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ جبکہ ہم لوگ یعنی انسان کسی بھی لمحۂ زیست میں ادھوری اور نامکمل شبیہ اور دھندلے عکس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ہمیں صورتِ خداوندی پر خلق کیا گیا ہے سو ہم میں یہ صلاحیت اور استعداد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کی اپنے عمل سے خارجی دنیا میں صورت گری کریں اور انہیں عالمِ ہستی میں مجسم کر دیں۔ لیکن یہ جاننے کے لیے کہ یہ صفاتِ خداوندی کیا ہیں اور ہم ان صفاتِ خداوندی کا مجموعہ کیونکر ہیں ہمیں اپنے سامنے خارج کی دنیا میں ایک عملی نمونہ درکار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ نمونہ، یہ عکس، یہ مثال قرآن مجید ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کھلے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے رسولِ خداؐ کا اتباع لازم ہے تا کہ قرآن ان کا خلق ان

کا کردار بن جائے۔اوران کے سوچنے، جاننے، محسوس کرنے اورعمل کرنے کے ہر طورطریقے کو ڈھالتا اور بناتا چلا جائے۔ یہ قیدوبندنہیں ہے آزادی ہے۔تنگنائی نہیں بیکرانی ہے۔انسان کی نموپر روک نہیں اس کے امکانات کا پھیلاؤ ہے۔

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ج وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (٦:١٢٦)

سواللہ جس کو چاہے راہ دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دے۔اور جس کو چاہے کہ وہ راہ بھولے تو اس کا سینہ بالکل تنگ کردیتا ہے۔

اسلام کا مطلب ہے قرآن مجید کومجسم کرنا۔اس سے بہت کچھ کھلتا ہے کیونکہ جب انسان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہے اورقرآن مجید اس کا خُلق اوراس کا کرداروعمل بن جاتا ہے تو پھر حقیقت کی تمام صفات سے اس کا سچا اور صحیح رشتہ قائم ہوتا ہے یعنی ہر وہ چیز جو خیر ہے، حسن و جمال ہے، مثبت ہے، لائقِ تعریف ہے اور چاہے جانے کے قابل ہے۔جب انسان کسی اورراستے پر چل نکلتا ہے یا یوں کہیے کہ راہِ نبوی کے سوا کسی اورراستے پر چلتا ہے تو گویا اپنے آپ کوسکیڑ کر جکڑ دیتا ہے۔اس طرح انسان کی شخصیت صورتِ الٰہیہ کی بہت سے سمتوں اور جہات سے کٹ جاتی ہے اوراس کی بڑھوتری اس سمت میں رک جاتی ہے۔انہی سمتوں میں جانے سے انسان انسان بنتا ہے۔اللہ کے سوا کسی اورنمونے پر خودکوڈھالنے کا مطلب ہے شرک میں مبتلا ہونا۔اس طرح انسان اپنی حقیقت کے بارے میں شک وشبہ میں پڑ جاتا ہے، میں وہ ہوں یا یہ، مجھے یہ بننا چاہیے یا وہ۔اورپھر وہ اس چیز کی آگہی سے بھی محروم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں یا فلاں نہیں ہے۔ بلکہ چنیں و چناں، این وآن ہرچیز کا خالق ہے۔اسی طرح اللہ کا عکس بھی اِس تک یا اُس تک

محدود نہیں ہو سکتا۔ وہ چنیں و چناں، این و آن سب کو سمیٹے ہوئے ہے اور ان میں سے کسی ایک کی بھی اس پر کوئی روک نہیں۔کمالِ انسانی کا جو خواب، جو تصور اسلام دیتا ہے اس میں لامحدود امکانات ،مکمل سرشاری اور تکمیلِ آرزو سب ملے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہمیشہ رہنے والا خوش آئند مستقبل اور بھرپور، مکمل مسرت وشادمانی۔

یہ سب کچھ خود قرآن کے لفظ میں مضمر ہے جب اس کے معنی ''پڑھنے، تلاوت کرنے'' کے لیے جائیں۔بعض علماء نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ''قران'' کا لفظ اپنی کتاب کے نام کے طور پر دیا ہے تو اس لفظ کے دوسرے معنی بھی مرادِ خداوندی میں شامل ہیں۔ہم نے پہلے عرض کیا کہ اس لفظ کا ایک مفہوم ''یکجا کرنا'' بھی ہے پس قرآن مجید کا مطلب ہوا یکجا کرنے یا اکٹھا کرنے والی چیز ۔لیکن یہ کیا اکٹھا کرتا ہے۔کسے یکجا کرتا ہے۔تمام انبیاء کی حکمت و دانائی، وہ ہدایت جو اللہ تعالیٰ نے آدم اور اولادِ آدم کو عطا کی۔اس لیے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ علم اور حکمت سب قرآن میں پائے جاتے ہیں۔قرآن مجید اپنے سے پہلے کے پیغامِ الٰہی کی تصدیق کے لیے آیا لہٰذا اس نے کوئی ایک چیز ایسی نہیں چھوڑی جو نوعِ انسانی کے لیے ذرا بھی اہمیت رکھتی تھی۔رسول اللہؐ کے نواسے حضرتِ حسن رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے جس میں لفظِ قرآن کا یہ مفہوم واضح طور پر نظر آتا ہے۔اس سے قرآن مجید کی پہلی سورت سورۃ فاتحہ کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔مسلمان یہ سورت نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں۔اس سورۃ کی تلاوت کرکے گویا وہ سارے قرآن کی تلاوت اور اس کی تجسیم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سو کتابیں نازل کیں اور چار کتابیں اتاریں اور ان ۱۰۰ کتابوں کو چار

کتابوں میں رکھا یعنی تورات، انجیل، زبور اور الفرقان (قرآن مجید) پھر اللہ تعالیٰ نے ان سب کتابوں کو قرآن مجید میں رکھا اور قرآن مجید کی ہر چیز کو اس کی طویل سورتوں میں رکھا اور طویل سورتوں کی ہر چیز کو سورۂ فاتحہ میں رکھ دیا۔

## قرآن کے اسماء Names of the Quran

ہر وہ نام اور صفت جو قرآن مجید نے اپنے لیے استعمال کی ہے اس کے کچھ انسانی اور کچھ ربانی مضمرات ہیں اور ان معانی میں بے انتہا وسعت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر نام میں پائی جاتی ہے۔مندرجہ ذیل سطور میں ہم قرآن مجید کے چند اسماء کا ذکر کریں گے اور مختصراً یہ بتائیں گے کہ مسلمان قارئین کے لیے ان اسماء میں کیا کچھ مضمر ہے۔

حضرتِ حسن کا جو قول ہم نے ابھی نقل کیا اس میں قرآن مجید کا دوسرا مشہور نام مذکور ہوا ہے، ''الفرقان''۔اس اصطلاح کا بنیادی مفہوم ہے ''الگ کرنا، جدا کرنا، فرق کرنا''۔بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس نام سے قرآن مجید کے دوسرے نام یعنی القرآن کی تکمیل ہوتی ہے۔''قرآن'' کا اگر مطلب ہے ''وہ جو ہر حکمت و دانائی کو یکجا کرتا ہے'' تو فرقان کے معنی ہیں ''وہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور حکمت و دانائی کو پرکھنے کی کسوٹی فراہم کرتا ہے''۔قرآن مجید نے فرقان کا لفظ تورات کے لیے بھی استعمال کیا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ

(۲۱:۴۸)

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی اور روشنی اور یاددہانی عطا فرمائی خدا ترسوں کے لیے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا (۲۵:۱)

بڑی برکت ہے اس کی جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی کتاب اتاری تا کہ وہ اہلِ علم کے لیے ہوشیار کرنے والا بنے۔

قرآن اپنے آپ کو صرف ''الکتاب'' کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔جیسا کہ ہم نے دیکھا یہ اصطلاح قرآن نے صحائف سماوی کے لیے بالعموم اور تورات و انجیل کے لیے بالخصوص استعمال کی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس لفظ کو دو سو سے زیادہ مقامات پر استعمال کیا ہے اور ان سب آیات میں یہ لفظ وحی revelation کے لیے ایک عنوان کے طور پر برتا گیا ہے۔خود ''وحی'' اور ''تنزیل'' (اتارنا) کے الفاظ کہیں کم استعمال ہوئے ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲:۲)

یہ کتابِ الٰہی ہے۔اس (کے کتابِ الٰہی ہونے) میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴:۱۳۶)

اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے اتاری۔

ان دو اسماء کے علاوہ قرآن مجید اپنے لیے جو اسماء اور صفات استعمال کرتا ہے

ان کو دو دستہ کیا جا سکتا ہے۔ایک وہ جو علم ،حکمت اور حق و باطل کے مابین امتیاز کی اس قوت پر زور دیتے ہیں جو قرآن فراہم کرتا ہے۔اور دوسرے وہ اسماء جو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیوں نازل کی،اس سے ان کی غرض کیا تھی یعنی اس کا کرم،اس کی رحمت۔پہلی قسم کے اسماء یہ ہیں الھدیٰ،الحق ،الحکمت،العدل،النور، البرہان،البیان،التبیین ،ذکریٰ،تذکرۃ اور ذکر۔دوسرے اسماء میں الرحمت،الشفاء ،کریم اور مبارک شامل ہیں۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہدایت کا تصورِ مسلمانوں کے تصورِ نبوت کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔یہاں ایک بات کا اور اضافہ کر دیں کہ صورۃ فاتحہ جو سارے پیامِ قرآنی کو اپنی سات مختصر آیات میں سمیٹے ہوئے ہے ایک دعا کے گرد گھومتی ہے اور اس دعا کا محور ہے ہدایتِ خداوندی:

اِھۡدِنَاالصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (۱:۵)

ہم کو سیدھی راہ پر چلا۔

اگر اللہ تعالیٰ اس دُعائے خاص کو قبول کر لیں تو پھر انسان کو کچھ اور نہیں چاہیے یا یوں کہیے کہ باقی سب کچھ خود سے ہو جائے گا۔

قرآن کا نام الحق بھی ہے۔اس پر ہم بطور اسمِ خداوندی کے گفتگو کر چکے ہیں۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّ نَذِيۡرًا (۲:۱۱۹)

ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ(٤:١٧٠)

اے لوگو! رسول تمہارے پاس تمہارے رب کے ہاں سے حق لے کر آ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ الحق ہے۔قرآن حق بھی ہے اور دلیلِ حق بھی۔اس طرح قرآن مجید حکمت بھی ہے۔حکمت کی عام طور پر تعریف یوں کی جاتی ہے۔''حق کی شناخت کرنا اور عملی صورتِ حال پر اس کا اطلاق کرنا۔دانا اور حکیم وہ ہے جو حق کو جانے اور صحیح انداز میں اسے عمل میں لائے۔قرآن حق کو جانتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ قرآن خود الحق ہے۔پھر اس کو عمل میں لانے کے لیے قرآن مجید نے اسے بولے ہوئے لفظ کی صورت انسانوں تک پہنچایا۔انسان اس حکمت کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ خود کو الحق کی مرضی کے مطابق ڈھال سکے،اس سے سازگاری اور ہم آہنگی حاصل کر سکے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (۴:۱۱۳)

اور اللہ نے تم پر کتاب وحکمت نازل کی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۱۰:۱) (۳۱:۲)

یہ آیتیں ہیں پُر حکمت کتاب کی۔

چونکہ قرآن مجید حکمت بھی عطا کرتا ہے اور قوتِ امتیاز بھی اس لیے یہ اشیاء کے لیے حَکَم بھی بن جاتا ہے۔فیصلہ کرنے اور حکم لگانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ علم کا کسی خاص صورتحال پر اطلاق کرکے نتیجہ مرتب کرنا،حق کو باطل سے الگ کر دینا اور معاملے کی صحیح صورت کو واشگاف کر دینا۔اسلام کے تصورِ عدل کا حکمت سے گہرا

تعلق ہے۔ بلکہ دونوں الفاظ ایک ہی بنیادی سہ حرفی مادے سے نکلے ہیں۔ان کے بنیادی معنی ایک ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳:۳۷)

اسی لیے ہم نے یہ کتاب اتاری ہے عربی میں، ایک فرمان کی حیثیت سے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ "توحید" کی ماہیت کو جاننے کے لیے نور کا تصور کس قدر اہم ہے۔نور وہ شے ہے جو پوشیدہ کو عیاں اور چھپے ہوئے کو آشکار کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نور ہے کہ اس سے وہ خدائی حکمت آشکار ہو جاتی ہے جو عالمِ مخلوقات میں مخفی ہے اور غفلت کے سبب انسان کی آنکھ اور اس کے فہم سے اوجھل رہتی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (۶۴:۸)

پس ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا۔

نور سے ہر شے صاف اور واضح ہو جاتی ہے اور جو فیصلہ بھی ہوتا ہے وضاحت سے ہوتا ہے، ابہام سے پاک ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے آپ کو "برہان" (دلیل) "بیان" Clear explication اور "تبیین" Elucidation کے طور پر پیش کیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (۴:۱۷۴)

لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے سند آ چکی اور ہم نے تمہارے لیے واضح روشنی اتار دی۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّ رَحْمَةً

وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (١٦:٨٩)

اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے اور وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرمانبرداروں کے لیے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (٣:١٣٨)

یہ بیان ہے لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ڈرنے والوں کے لیے۔

ہدایت دینے کی صفت کا صاف اور صریح تعلق حق و باطل میں امتیاز اور راہِ راست کی جانب رہنمائی سے تو ہے ہی اس میں ایک تصور بھی مضمر ہے۔ یہ صفت اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہدایت دینے والا اس کا بھلا چاہتا ہے جسے ہدایت دی جا رہی ہے اور اس طرح اسے ہدایت یافتگان کی بہبود عزیز ہے۔ اسی لیے اللہ تعالٰی کی اسمائے رحمت و جمال میں سے ایک نام ہے ''الہادی''۔ اب ہم آتے ہیں قرآن کے ان ناموں کی طرف جو دوسرے دستے میں شامل ہیں۔ وہ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اور دوسری الہامی کتابوں کو نازل کرنے سے اللہ تعالٰی کی غرض کیا تھی۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى اِمَامًا وَّرَحْمَةً (٤٦:١٢)

اور اس سے پہلے سے موسیٰ کی کتاب موجود ہے۔ رہنما اور رحمت۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ . هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ

(٣١:٢-٣)

یہ آیات ہیں پُر حکمت کتاب کی۔ وسیلۂ ہدایت اور رحمت حسن عمل والوں کے لیے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

(۷:۲۰۳)

یہ تمہارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

قرآن ایک رحمت ہے کیونکہ یہ انسان کو اس کی اپنی تکمیل اور فلاح و بہبود کی جانب ہدایت کرتا ہے چنانچہ اس سے انسان کی سرشت اور فطرت میں پائی جانے والی ہر بیماری کو اس کا مداوا اور ہر زخم کو اس کا مرہم مل جاتا ہے اور وہ پوری صحت سے توحید پر کاربند ہو سکتا ہے۔

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۵۷)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت، سینوں کے امراض کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت آ گئی ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

(۱۷:۸۲)

اور ہم قرآن میں جو اتارتے ہیں وہ شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن ہر اچھی چیز کا مظہر ہے کیونکہ اگر ہدایت نہ ہو تو نوعِ انسانی برباد ہو جائے۔ قرآن ان کو ان کے اپنے نفوس کا اندمال اور شفاء، سلامتی اور فلاح و بہبود فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے اسے "مبارک Blessed" کا نام دیا گیا ہے۔ اس لفظ میں یہ معنی شامل ہیں کہ یہ کتاب ہر برکت، ہر خیر اور ہر مطلوب شئے کا ماخذ ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

(٦:١٥٦)

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اُتاری ہے، سراپا خیر و برکت۔ تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

مسلمان جب بات کرتے ہیں تو قرآن مجید کو صرف قرآن کے نام سے نہیں پکارتے۔ عام طور پر قرآن کے لفظ کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفاتی نام شامل کیا جاتا ہے۔ یہ کلام اللہ کے احترام کا تقاضا ہے۔ بعض انگریزی گو مسلمانوں نے قرآن کو ''قرآنِ مقدس'' (The Holy Quran) کہنا شروع کر دیا ہے۔ جیسا کہ انجیل کو کتابِ مقدس کہا جاتا ہے لیکن قرآن میں یا کسی بھی اسلامی زبان میں Holy کے لفظ کے کسی بھی لسانی مترادف کو قرآن کے نام کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ سب سے زیادہ جو اسمِ صفت قرآن کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے وہ ہے ''کریم'' اور اس کی بنیاد اس آیت پر ہے جس میں یوں آیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَقرآن الكَرِيم (٥٦:٧٧)

بے شک یہ قرآن ہے، عزت والا۔

الحق اور النور کی طرح الکریم بھی اللہ کا ایک نام ہے اور یہ اس کے اسمائے جمال اور اسمائے رحمت میں سے ہے۔ مزید برآں اگر زمانی اعتبار سے دیکھیے تو شاید صفتِ تخلیق کے بعد یہ پہلی صفت ہے جو قرآن میں نازل ہوئی۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے لیے ہدایت فراہم کرنے کا سبب خدائی کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ہم نے عرض کیا کہ عام طور پر یہی کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات مندرجہ ذیل ہیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۔ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْ ۔ (٩٦: ١-٥)

انہیں پڑھ کر سناؤ (اے پیغمبر) اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔ لہو کی ایک پھٹکی سے انسان کو پیدا کیا ہے۔ انہیں پڑھ کر سناؤ اور واقعہ یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے یہ قرآن سکھایا۔ انسان کو اس میں وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی صرف انسان کو علم عطا کرنے اور اسے ہدایت دینے ہی میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ایک گہرے اور بنیادی مفہوم میں تخلیق خود اللہ کے جود و کرم کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ مخلوقات اپنی ہستی کے لیے کوئی حق جتلانے کی حیثیت نہیں رکھتی۔

## محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اگر قرآن اسلام ہے تو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی صورت میں مجسم اسلام ہیں۔ وہ اللہ جس نے قرآنِ مجید میں خود کو منکشف کیا ہے اس کی محبت اور بندگی کا تقاضا ہے کہ کلامِ خداوندی کی کامل تجسیم، اس انسانِ کامل سے بھی وہی تعلق اور محبت رکھی جائے جو اپنے اسوۂ حسنہ میں اللہ کی صفاتِ فرقانی و قرآنی، اس کی صفتِ ہدایت، حق، حکمت، نور، عدل، برہان، تبیین، ذکر، رحمت، شفاء، کرم اور برکت سب کا مظہر ہے۔

اسلام کی ساری تاریخ میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو جو حیثیت رہی

ہے ۵۶ اس پر نظر کیجیے تو یہ امر باعثِ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ بعض نئے خیال کے مسلمان جنہیں بالعموم بنیاد پرست کے عنوان سے پکارا جاتا ہے ''توحید'' کے نام پر رسولِ خداؐ سے محبت، عقیدت اور تعلق کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی طرف سے یہ تنقید ہوتی ہے انہی لوگوں میں ''تشبیہ'' کا تصور بھی تقریباً مفقود دیکھا گیا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے ''تنزیہ'' پر ایک ایسا مبالغہ آمیز اصرار جو خدا کو انسانی معاملات سے اتنا ماوراء بنا دیتا ہے کہ اسکے بعد صرف چند صریح احکاماتِ خداوندی کی پابندی چھوڑ کر لوگ باگ آزادی سے جو چاہیں کیا کریں۔

اس میں شک نہیں کہ اگر جدیدیت کو آنا ہے تو اسلام میں اس نوعیت کے تغیرات جنم لیتے رہیں گے۔ لیکن ہم لوگ جو مغربی دنیا میں رہتے ہیں جدیدیت سے گزر کر مابعدِ جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ کم از کم ہم تو یہ پورا حق رکھتے ہیں کہ اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھا سکیں اور یہ اعتراض کر سکیں کہ روایت اور زمانے کے آزمائے ہوئے اُصولوں کو ٹیکنالوجی کی ترقی سے پیدا ہونے والی جنتِ ارضی کی امیدِ موہوم کی خاطر اٹھا کر پھینک دینا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

روایتی اسلام میں رسول خداؐ کی کیا حیثیت رہی ہے اس کی وضاحت کے لیے ہم صرف ان چند نکات تک محدود رہیں گے جو قرآن مجید نے آپؐ کے لیے بیان کیے ہیں۔ ہمارا کہا ہوا سرسری اور سطحی سے زیادہ نہیں ہو سکے گا۔ ''کان خلقہ القرآن'' کو نظر میں رکھیے تو یہ بات سمجھ میں آسانی سے آ جائے گی کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں رسول اللہؐ کا نام لے کر ذکر آیا ہے صرف ان مقامات کو پڑھنے سے رسول اللہؐ کی عظمت اور حیثیت واضح نہیں ہو سکتی۔ کتابِ خداوندی ساری کی ساری

اگر اللہ کے بارے میں بتاتی ہے تو ساتھ ہی اللہ کے افضل و اشرف نبی کے کمال یافتہ جوہرِ انسانی کا اظہار بھی کرتی ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم صورتِ الٰہیہ کا وہ حقیقی مظہر ہیں جو مسلمانوں کی نگاہ میں دوسرے ہر مظہرِ صورتِ خداوندی سے برتر و بہتر ہے، وہ دوسرے مظاہر جو انبیاء اور اولیاء کی شخصیات میں آدمؑ سے لے کر دنیا کے لمحۂ آخر تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اسلام سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا مرتبہ و حیثیت دیتا ہے اسے جاننا ہو تو پہلے ''تنزیہ'' کے حوالے سے اس پر غور کرنا چاہیے، یعنی اس نقطۂ نظر سے کہ اللہ تعالی الحق ہے اور اس کے سوا ہر شے بے حقیقت۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ہر غیر اللہ کے پاس ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ماسوی اللہ میں سے ہیں لہٰذا دیگر تمام مخلوقات کی طرح اللہ کے مقابلے میں وہ بھی کچھ نہیں۔ انسانی اصطلاحات میں کہیے تو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر دوسرے لوگوں کی طرح انسانِ فانی ہیں۔

لیکن رسولِ خداؐ اور دوسرے لوگوں کے مابین ایک بڑا فرق ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ آپ اللہ کے عبدِ کامل ہیں۔ ہم عرض کر چکے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی بندگی کر رہی ہے لیکن انسان نے چونکہ ''بارِ امانت'' اٹھایا تھا لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی صلاحیت اور استعداد کی مکمل نمود کے لیے اپنے ارادے و اختیار سے اللہ کی بندگی کرے۔ نفسِ انسانی کی اللہ کے سامنے اختیاری سرافگندگی کی یہ صفت رسولِ خداؐ کی ذات میں سب سے نمایاں ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے آپؐ کو ''عبداللہ'' (اللہ کا بندہ) کہا ہے۔ مسلمان کے شعور میں اس لقب سے زیادہ قابلِ تعظیم اور واجبِ احترام اور کوئی لقب نہیں۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ عبدِ کامل

ہونے کے ساتھ آپ کامل خلیفۃ اللہ بھی ہیں۔ ''تنزیہ'' کو پوری طرح واقعہ بنانے کے ساتھ آپؐ نے ''تشبیہ'' کو بھی مجسم کر دیا تھا۔ قرآن مجید نے سیدنا محمد علی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے ان دو پہلوؤں کو یوں ظاہر کیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ

(۱۸:۱۱۰) (۴۱:۶)

کہیے کہ میں بھی ایک آدمی ہوں، جیسے تم۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود بس وہی اللہ ہی ہے۔

عہدِ جدید میں بہت سے مفسرین نے اس آیت کے صرف پہلے حصے پر توجہ دی ہے اور یہ بھلا دیا ہے کہ دوسرے حصے میں کیا مضمر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے انسانوں کی طرح ایک بشر ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں لیکن یاد رہے کہ انسان کو سارے اسماء کا علم دیا گیا تھا اور فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا تھا۔ انسان ہونے کا مطلب عام و عامیانہ ہونا نہیں ہے۔ یہ ایک خدائی امانت ہے، ایک خاص استحقاق، خصوصی چیز اور کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس بارِ امانت کا حق ادا کرتے ہیں اور اس کا صحیح مصداق بنتے ہیں۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ ۰ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا (۳۳:۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے

والا ہے۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انسانوں سے جو چیز الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ؐ نے انسان کی اصل ذمہ داری کے مطابق زندگی گزار کر دکھا دی۔ اللہ کی ہدایت پر پورا عمل فرمایا اور اسی لیے آپ ؐ کو اللہ تعالیٰ نے سارے عالم کے لیے ایک رحمت کے طور پر منتخب فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱:۱۰۷)

اور ہم نے تو تم کو بس اہلِ عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

سابقہ اقتباس میں جو آیت درج کی گئی تھی اس کے دوسرے حصے میں ایک بہت اہم نکتہ آیا ہے۔

اِلَّا اَنْ يُّوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا تو بس اللہ ہی ہے۔

اسی سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان تو ہیں مگر ایسے انسان جس پر وحی آتی ہو۔ اگر کسی کے دماغ میں یہ خیال کہیں گزرا ہو کہ وہ بشر تھے اور بشر ہونے کی وجہ سے ہماری ہی طرح کچھ کمی کوتاہی رکھتے تھے تو اس آیت سے یہ غلط سوچ رفع ہو جانا چاہیے۔ آخر صرف آپ ؐ ہی کو قرآن نازل کرنے کے لیے کیوں چنا گیا؟

یہ درست ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے انسانوں کی مانند ایک بشر تھے لیکن وہ عام انسانوں کی طرح غفلت و نسیان میں نہیں تھے، بارِ امانت سے گریزاں نہیں تھے۔ یہ بارِ امانت آپ ؐ نے اٹھایا اور ایسے کہ ساری دنیا اس سے آج

تک فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ وہ صفات جن کی نمود آپ کی ذات میں ہوئی وہ آپ کی اپنی صفات نہ تھیں، یہ اللہ کے اسماء اور اس کی صفات کا ظہور تھا۔ ہم نے پہلے درج کیا کہ بحیثیت ایک بشرِ انسانی کے آپؐ اپنی خواہش سے کسی کی ہدایت کا سامان نہیں کر سکتے تھے تاہم اللہ کے رسول کے طور پر اور خلیفۃ اللہ کی حیثیت میں آپؐ دلیلِ حق بھی تھے، الحق کی جانب رہنما بھی اور نجات کے لیے انسان کے رہبر بھی۔ اللہ کا نورِ ہدایت اسی طرح ظاہر ہوتا ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ صِرَاطِ اللّٰهِ

(۴۲: ۵۲-۵۳)

اور تو البتہ سُجھاتا ہے سیدھی راہ، راہ اللہ کی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۔

وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (۳۳: ۴۵-۴۶)

اے نبی! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

آپؐ سے جو نور ظاہر ہوا ہے وہ آپؐ کا نور نہیں خدا کا نور ہے۔ ''لا نور الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی نور نہیں)۔ انسانِ فانی کے پاس نور کہاں۔ لیکن خلیفۃ اللہ کے طور پر انسان مشعلِ نور ہو سکتا ہے۔

قرآن بہت وضاحت سے یہ حکم دیتا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک نمونہ، ایک مثال ہیں۔ اس مثال کی پیروی، اس کا اتباع کرنا لازم ہے۔ آپؐ کے اتباع ہی سے اللہ کی یاد کا راستہ کھلتا ہے، یہ ذکر اللہ کا وسیلہ ہے اور ذکرِ خداوندی ہی وہ

مطلوبہ اور پسندیدہ جواب اور ردِ عمل ہے جو خدا کی بھیجی ہوئی یا ددہانیوں کے روبرو انسان کو اختیار کرنا ہے۔ یہ بات اہم اور لائقِ توجہ ہے کہ اسلامی روایت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بہت سے القاب دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک ''ذکراللہ'' (یادِ خدا) بھی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (۳۳:۲۱)

اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے ان کے لیے جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ مسلمان ہونے اور اللہ کا بندہ ہونے کا مدار اطاعتِ الٰہی پر ہے۔ اطاعتِ خداوندی کا انحصار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر ہے۔

مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (۴:۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ

(۳:۳۱-۳۲)

کہہ دو: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری راہ چلو۔ کہ اللہ تم کو چاہے اور بخشے تمہارے گناہ۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کہہ دو: حکم مانو اللہ کا اور رسول کا۔ پھر اگر یہ ہٹ رہیں تو اللہ نہیں چاہتا منکروں کو۔

اللہ سے محبت اور اتباع رسول کے درمیان قرآن مجید نے جو رشتہ قائم کیا ہے وہ خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔اس پر آگے چل کر دوبارہ گفتگو ہوگی۔یہاں اتنا عرض کرنا مناسب ہوگا کہ محبت یا لگاؤ نفس و دل کی ایک صفت و صلاحیت ہے جو محبوب اور محبت کے درمیان فاصلے کو پاٹ دیتی ہے، اسے قابلِ عبور بناتی ہے۔ یہاں انسان محبّ ہے، چاہنے والا اور عاشق۔محبوب اللہ تعالیٰ ہے۔یہ آیت لوگوں کے لیے جو پیغام دے رہی ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ اللہ کا قرب چاہتے ہیں تو اس کے لیے ان کو لازم ہے کہ سیدنا محمدؐ کے اسوہ و مثال کی پیروی کریں۔

## بشارت اور انتباہ (Good News and Warning)

سابقہ صفحات میں قرآن کی ایک ترکیب ''بشیر و نذیر'' (خوش خبری دینے والا، خبردار کرنے والا) ہماری نظر سے گزر چکی ہے۔اس پر ہم نے تبصرہ نہیں کیا۔اسلام کے تصورِ نبوت کا خلاصہ پیش کرنے کے لیے مفید ہوگا کہ ان الفاظ میں پنہاں معانی پر غور کیا جائے۔قرآن مجید نے یہ لفظ ''بشارت اور خوشخبری'' تقریباً ۴۰ آیات میں استعمال کیا ہے۔قرآن میں لفظ ''بشریٰ'' اور اس سے متعلق الفاظ ان آیات میں ایک یا زیادہ پیغاماتِ نبوت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے نصف آیات میں ''ڈرانے، خبردار کرنے'' (نُذُر اور متعلقہ الفاظ) کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہاں خوشخبری کا کوئی ذکر نہیں۔انبیاء نے اپنی قوموں کو جو خبردار کیا تھا اس کا ذکر ہے۔اس گنتی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نبوت بشارت دینے سے کہیں زیادہ خبردار کرنے کا نام ہے۔خبردار کرنے اور ڈرانے سے قدرتی طور پر انسان خوفزدہ ہوتا ہے اور بچتا ہے جبکہ بشارت اور خوشخبری سن کر مسرور ہوتا ہے۔ شاید یہاں قرآن ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ نبیوں کو بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد لوگوں کو

خوش کرنے سے زیادہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں خوف کو بیدار کیا جائے ۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات قرآن کے بارے میں عمومی طور پر بھی کہی جا سکتی ہے اور انسان کے بارے میں قرآن نے جو تصویر کھینچی ہے اس کا بھی قدرتی نتیجہ یہی ہے۔

قرآن کے پیغام کو اگر سمجھنا ہو تو اس کتاب کے مصنف کی غرضِ تصنیف کو سامنے رکھنا ضروری ہو گا۔ اسلام کا کہنا ہے کہ یہ کتاب خدا کی کتاب ہے۔ اس کا حرف حرف لکھنے والے کی منشاء میں رنگا ہوا ہے۔ یہ مصنف عام مصنفین سے مختلف ہے جو اگر چہ اپنی کتابیں ایک غرض سے لکھتے ہیں لیکن انہیں اس بات پر کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ ان کی کتاب لوگ کس طریقے سے پڑھیں گے ۔ کتابِ خداوندی کا مصنف علیم وخبیر ہے اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خوب جانتا ہے ۔ وہ خود کو یوں نہیں جانتے جیسا کہ وہ انہیں جانتا ہے۔ اسے بخوبی علم ہے کہ اس کی کتاب کیونکر سمجھی جائے گی ۔ آپ یہ اعتراض تو کر سکتے ہیں کہ بہت سے لوگ یقیناً کتابِ خداوندی کے مصنف کی منشاء کو غلط سمجھیں گے لیکن اگر آپ توحید کے تصور کو اور خود اس کتاب کی گواہی کو سنجیدگی سے لیں تو یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس غلط فہمی کا اللہ تعالی کو پہلے سے علم نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس غلط فہمی کو اپنے کام کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اور منشائے ربانی اور اغراضِ انسانی لازم نہیں کہ ایک ہی ہوا کریں ۔ یہ سب باتیں ہدایت اور گمراہی کے تصورات سے بے تعلق نہیں ہیں ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَـقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَـفَرُوْا فَيَـقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ‌ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ‏(٢:٢٦)

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ تمثیل بیان کرے خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی چھوٹی کسی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا منشاء کیا ہے؟ اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر ان لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۔ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (۱۷:۴۵-۴۶)

اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر حجاب اور ان کے کانوں میں بوجھ پیدا کر دیتے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا (۱۸:۵۷)

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے تو وہ اس سے اعراض کریں اور اپنے ہاتھوں کے کرتوت بھول جائیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے ( کہ اس کو نہ سنیں ) اس وجہ سے تم ان کو ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ وہ کبھی ہدایت

پانے والے نہیں۔

تو پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کیوں نازل کیا۔ اس سوال کے جواب دینے کے کئی طریقے ہیں۔ سادہ انداز میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید نازل کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ رہنے والی خوشی اور راحت کی خوشخبری دی جائے۔ یہ خوشی انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ خوشی اسے یونہی خود ہی سے حاصل نہیں ہو جائے گی۔ حقوق ہوں گے تو ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہوں گے اگر آپ کوئی چیز بننا چاہتے ہیں، کوئی مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اللہ کے بندے اور خلیفۃ اللہ بننا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے عمل کا حساب کرنا ہوگا۔

قرآن یقینی طور پر تاریخ کی ایک کتاب کے طور پر نہیں آیا اگر تاریخ سے ہماری مراد تاریخی واقعات کی فہرست بنانا اور ترتیب لگانا ہو تو قرآن میں بارہا تاریخی واقعات کے حوالے اور اشارے آئے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح یہ واقعات اللہ تعالیٰ نے بیان کیے ہیں اس میں شک کیا جائے۔ اور یہ سوچا جائے کہ شاید واقعہ کسی اور طرح ہوا ہوگا۔ تاہم اللہ تعالیٰ جب بھی کوئی تاریخی قصہ بیان کرتے ہیں تو وہ کسی خاص نکتے اور سبق کو اُجاگر کرنے کے لیے ہوتا ہے اور اللہ کو سب سے بہتر معلوم ہے کہ اس موقع پر کہانی کیونکر کہی جائے گی۔ علاوہ ازیں قرآن اللہ کی نشانیوں پر جس طرح زور دیتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم جس چیز کو اصل واقعہ کہہ رہے ہیں اللہ کی منشاء اس کی تعریف بیان کرنا نہیں کچھ اور ہے۔ اس کا پیغام وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ یہ قوتِ عمل کے لیے مہمیز ہے۔ تاریخی واقعے کا معروضی غیر جانبدارانہ بیان نہیں۔ معروضی حقائق انسانی نیت اور انسان کی منشاء اور

اس کی شرح وتعبیر سے الگ کوئی وجود رکھتے ہیں، یہ خیال ایک سراسر جدید اختراع ہے اور آج یہ تصور اپنی ساری کشش کھو کر اگر کہیں زندہ ہے تو عوام کی عامیانہ ثقافت میں۔ کتابِ خداوندی کے الفاظ اس غرض سے نازل نہیں کیے گئے کہ وہ ہمارے لیے معلومات اور اطلاعات کے اِدھر اُدھر کے ٹکڑے فراہم کر دیں تا کہ ہمارا ذخیرۂ مہملات وسیع تر ہوتا رہے۔کلامِ خداوندی کا منشاء یہ ہے کہ انسان کو یہ یاد آتا رہے کہ انسان ہونے کے معنی کیا ہیں۔

انسان وہ ہے جو صورتِ الٰہیہ پر خلق کیا گیا اور جسے اللہ کے دو ہاتھوں نے ڈھالا۔انسان ہونے کا مطلب ہے ساری صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر سمو لینا اور اللہ تعالٰی کے جلال و جمال، رحمت وغضب، کرم اور قہر کا مظہر بن کر دکھانا۔اس کا مطلب ہے توحید کے مطابق زندگی گزارنا۔اس کی صفاتِ جلال وغضب کے سامنے انسان کا مفہوم ہے اللہ کا بندہ، اس کا غلام۔اس کی صفاتِ جمال ورحمت کے روبرو انسان کے معنی ہیں خلیفۃ اللہ۔تنزیہ کا تقاضا ہے انسان اللہ تعالٰی کو خود سے ماورا اور بے انتہا دور جانے اور بے انتہا مختلف۔تشبیہ یہ چاہتی ہے کہ انسان اسے اپنے نزدیک جانے اور اپنے شہ رگ سے قریب پائے۔

لیکن نوعِ انسانی کے صرف ان افراد پر صادق آتی ہے جنھوں نے اس ''بارِ امانت'' کو ٹھیک سے اٹھایا اور اپنی فطرت، اپنی سرشتِ انسانی کو عملی حقیقت بنا دیا۔یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نازل کردہ ''ذکر'' کو کان دھر کے سنتے ہیں اور یادِ خداوندی کے ذریعے اس کا جواب دیتے ہیں، اس سے لو لگاتے ہیں۔ایسے لوگ بہت کمیاب ہیں۔صرف انبیاء اور خدا دوست لوگوں میں سے چند لوگ ''توحید'' کے اس درجے کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔باقی کے لوگوں پر یا تو ''غفلت'' کا مکمل غلبہ ہوتا

ہے یا وہ انبیاء کی تعلیم وہدایت کے مطابق زندگی کو ترتیب دینے کی راہ پر چلتے ہوئے اس کے کسی نہ کسی مرحلے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ اللہ سے غافل اور اپنی قدرتی سرشت ونہاد سے بےخبر ہوتے ہیں۔ اس بات کو مان کر چلیں تو سب سے پہلے انسانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا ضروری ہے کہ وہ جس جگہ کھڑے ہیں، جس صورتحال سے دو چار ہیں وہ کوئی آئیڈیل صورتحال نہیں ہے۔ان کے ذہن میں یہ خیال اجاگر کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے دور ہے اور دور ہی رہے گا اگر وہ اپنے آپ کو بدلنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کریں گے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۱۳:۱۱)

اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی روش تبدیل نہ کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ:

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (۵۷:٤)

وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں کہیں تم ہو۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ ہیں۔حضورِ خداوندی کا شعور اور آگہی انسان کو پیدا کرنا پڑتا ہے اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے کیونکہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انسان کو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے مطابق اللہ کا بندہ بننا پڑتا ہے۔

جو باتیں لوگوں کو حقیقی معلوم نہیں ہوتیں ان کے بارے میں وہ طبعی طور پر لاپرواہ ہوجاتے ہیں۔والدین، اساتذہ اور معالجین آپ کو شراب نوشی اور منشیات کے تباہ کن اثرات کے بارے میں خبردار کرتے رہتے ہیں لیکن کئی لوگ ان کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔سائنسدان دہائی دیتے رہتے ہیں کہ فضائی آلودگی ہماری دنیا کو تاخت وتاراج کر رہی ہے لیکن لوگوں کی اکثریت کے لیے ماحول کا مسئلہ دوسرے کا دردِسر ہے۔ہم میں سے جن لوگوں میں قدرتی ماحول کو کوڑے کرکٹ کا ایسا ہولناک ڈھیر بنانے کی عادت پختہ ہوچکی ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی وہ کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ اپنے پوتوں پڑپوتوں کی خاطر اپنے "گراں قدر" طرزِ زیست کی کسی بھی اہم چیز سے دستبردار ہوجائیں۔ہم نے فرض کر رکھا ہے کہ "وہ" (تیسری دنیا کے لوگ) اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اپنے جنگلات کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ کریں کیونکہ "ہم" (جنھوں نے اپنے طبعی قدرتی ماحول کو پہلے ہی ملیامیٹ کر رکھا ہے) اس بات کے حقدار ہیں کہ حالات کو ان کے ڈھرے پر چلنے دیں اور اپنے طور طریقوں کی خرابی کو دور کرنے کی کوئی زحمت نہ اٹھائیں۔

زندگی کے عام تجربوں سے ہم بہت سی اور مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔نکتہ صرف یہ ہے کہ عام قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ لوگ باگ عموماً بے خبر، کل کی فکر سے غافل اور اپنے نفس کے بندے ہوتے ہیں۔انہیں مستقبل کے فائدے کے بارے میں جتنا بھی بتاتے رہیے وہ متاعِ وقت کو ہاتھ سے دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اسے کس طرح کے کند ذہن لوگوں سے معاملہ کرنا ہے۔کارِ خداوندی اس ضمن میں یہ ہے کہ انہیں جھنجوڑ کر بیدار کیا جائے اور

وہ انبیاء کو مبعوث کر کے یہی کام کیا کرتا ہے۔ کَلِّمِ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِم ۵۷ (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کیا کرو) ارشادِ نبیؐ ہے۔ والدین سے بات کرنا اور انداز سے ہوتا ہے اور چھوٹی نا سمجھ بہن سے گفتگو کسی اور ڈھب سے۔ دوست سے گپ لڑانے کا طریقہ الگ ہے اور پالتو جانور کو پکارنے کا اسلوب جدا۔ اسی لیے اللہ کا پیغام بھی اس کے مخاطب لوگوں کو دیکھ کر بھیجے جاتے ہیں۔

انسان سے کلام کرنے میں اللہ تعالیٰ کا طرزِ خطاب کیا ہوتا ہے؟ اسے سکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کیا ترکیب استعمال کرتے ہیں؟ بنیادی طور پر یہ وہی ترغیب اور دھمکی کی ترکیب ہے، چابک اور چھڑی پر لٹکی ہوئی گاجر والا حربہ جو بدشوق اور کند ذہن طالبعلموں کے سلسلے میں برتا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم نے سابقہ صفحات میں جو بیان کیا ہے اس کے مضمر الہیاتی اسباب کی بنا پر یہاں چھڑی پہلے ہے اور گاجر بعد میں۔ اللہ تعالیٰ جو ''الحق'' بھی ہے اور ''الرحمٰن'' بھی، اپنی مخلوق سے بہت ماورا ہے۔ اور یہ خدشہ ہر دم رہتا ہے کہ انسان حقیقت و رحمت سے دوری میں پڑا رہ جائے۔ ایسا ہوا تو انسان پر اللہ کے اسمائے ''تنزیہ'' ہی کا غلبہ رہے گا، جلال، قہر، غضب اور انتقام کا غلبہ۔ تاہم اللہ کا قرب حاصل کرنا ممکن ہے اس طرح انسان اللہ کی صفاتِ تشبیہ سے مانوس اور جمال، لطف، رحمت اور عفوودرگزر کا خوگر ہو جاتا ہے۔

انبیاء کو بھیجنے سے اللہ کی غرض یہ ہے کہ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا جائے تو یہ دونوں الفاظ ''بشریٰ'' اور ''انذار'' (خوشخبری اور خبردار کرنا) اس بات کو بہت خوبصورتی سے بیان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے اور اس بات سے خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ اس بارِ امانت کو اٹھانے

سے گریز کرے گا جو سرشتِ انسانی میں داخل ہے تو اس کے نتائج خود اسی کو بھگتنے ہوں گے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (٦:٤٨) (١٨:٥٦)

اور ہم رسولوں کو تو صرف خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے ہی بنا کر بھیجتے ہیں۔

قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ (٦:١٩)

کہو: اللہ۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔ اور مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس سے تم کو خبردار کروں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو تنبیہ کی ہے اور جس بات سے ڈرایا ہے اس کا توحید سے گہرا تعلق ہے۔ چونکہ حقیقت اگر ہے تو صرف ایک ہی سو ہر وہ شخص جو اللہ کے سوا کسی اور چیز کو حقیقی جانتا ہے، شرک میں پڑا ہوا ہے اور شرک نا قابلِ معافی گناہ ہے۔

اَنْ اَنْذِرُوْا اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاتَّقُوْنِ (١٦:٢)

کہ لوگوں کو آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو مجھ ہی سے ڈرو۔

اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی انسان کو خدا سے دور کر دیتا ہے۔ اسی خاطر اللہ تعالیٰ انسان کو اس درد و الم اور عذاب سے خبردار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے القہار اور المنتقم جیسے اسماء کے انسانی لوازم ہیں۔ نارِ جہنم، عذاب اور حشر کے علاوہ قرآنِ مجید

خاص طور پر قیامت کے دن سے انسان کو ڈراتا ہے جب انسان اپنے رب کے روبرو ہوگا۔انسان نے جیسا تعلق اللہ سے قائم کیا ہوگا اس سے جس نوع کا رشتہ ہوگا اسی کے لحاظ سے اسے خدا کا سامنا کرنا پڑے گا۔اگر وہ اس سے دوری اور بُعد میں پڑا ہوا تھا تو وہ اللہ کے غضب اور چہرۂ انتقام کا سامنا کرے گا اور اگر اس نے راہِ خدا پر گامزن ہونے کی اپنی سی کوشش کی ہوگی تو رحمت اور مغفرت اس کا استقبال کرے گی۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۔ لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (۱۵-۹۲:۱٤)

سو میں نے تمہیں دہکتی آگ سے خبردار کر دیا ہے۔اس میں تمہارا یہ سب سے بڑا بد بخت ہی پڑے گا۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ..... اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (۳۹:۷۱)

اور جو منکر تھے وہ گروہ در گروہ ہانک کر جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے..... کیا تمہارے پاس تمہی میں سے رسول نہیں آئے تھے، اپنے رب کی آیات پڑھتے اور تم کو اس دن کی تمہاری ملاقات سے خبردار کرتے ہوئے۔

يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۱٦-۴۰:۱۵)

تاکہ ان کو روزِ ملاقات سے آگاہ کر دے جس دن وہ خدا کے آگے بالکل

بے نقاب ہونگے۔ان کی کوئی چیز بھی خدا سے مخفی نہیں ہوگی۔

وَاَنْذِرْ هُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِالْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِيْنَ مَالِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۱۸:۴۰)

اوران کوقریب آ لگنے والی آفت کے دن سے ڈرا جبکہ دل حلق میں آن پھنسیں گے اوروہ غم سے گھٹے ہوئے ہونگے۔اس روز ظالموں کا نہ کوئی ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات سنی جائے۔

قرآن یہ چیز واضح کردیتا ہے کہ اس کے خبردار کرنے کا اثر صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اہلِ ایمان ہیں۔دوسرے لوگ اس کے ڈرانے کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۱۸:۳۵)

تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۰ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ (۳۶:۱۰-۱۱)

اوران کے لیے یکساں ہے: ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔وہ ایمان نہیں لانے کے۔تم تو بس انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں اور غیب میں خدائے رحمان سے ڈریں۔سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دو۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہے کہ لوگ سنی ان سنی کر دیں گے تو پھر آخر وہ انہیں خبردار کرنے کی زحمت کیوں کرتا ہے؟ جواب ہے عدلِ خداوندی۔ ظلم ایک انسانی خاصیت ہے۔ یہ صفتِ خداوندی نہیں ہے۔ کل کو کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے راہِ راست سے ہٹا دیا۔ وہ ہر انسان کو اچھی طرح خبردار کر دیتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ غفلت سے بیدار نہ ہوں، پیغامِ خداوندی پر کان نہ دھریں تو قصور انہی کا ہوگا۔ ملامت انہیں کو کی جائے گی۔ وہ رسّہ جس سے انسان خود کو پھانسی دیتا ہے، اس کے اپنے ہاتھوں کا بٹا ہوا ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ

(۳:۱۸۲)

یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ذرا بھی نا انصافی کرنے والا نہیں۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا

(۴:۱۶۳-۱۶۵)

ہم نے تم پر اس طرح وحی کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد آنے

والے نبیوں پر وحی کی۔ اور ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ اور دوسرے بھی بہت سے رسولوں پر وحی بھیجی۔ جن کا حال ہم تم کو پہلے سے سنا چکے ہیں اور بہت سے رسولوں کا حال نہیں سنایا اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا۔ اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والا اور ہوشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

قرآن اگر چہ اللہ کے غضب اور اس کے نتائج پر زور دیتا ہے لیکن اکثر یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ رحمتِ خداوندی وہ صفت ہے جو سب صفات سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے بندوں سے ناراض ہو جاتا ہے لیکن اس کا غضب بھی اس کی رحمت کے زیرِ تدبیر ہے۔ وہ اپنے غضب کا اظہار صرف اس لیے کرتا ہے کہ انسان ہوش میں آئے۔ اس قہر کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بندوں سے انتہائی تلطف کا معاملہ کرے۔ ہمیں اس وقت تعجب نہیں ہوتا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ صرف محبت اور شفقت کی وجہ سے اپنی اولاد سے سختی سے پیش آتے ہیں تو اس بات میں کیا اچنبھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی سرزنش اور سزا ان کی اصلاح اور ان کے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کے نبی جو بشارتیں لے کر آتے ہیں ان کا گہرا تعلق ان صفاتِ خداوندی سے ہے جو رحمت، جمال اور لطف و کرم کی صفات ہیں۔ قرآن بار بار انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس کے ڈرانے میں جو سختی اور شدت ہے اس کے کارن نا امید نہ ہوں اور الحق کے روبرو اپنی نارسائیوں اور کوتاہیوں کو دیکھ کر ہمت نہ ہاریں۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ

رَّحۡمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ (۳۹:۵۳)

کہ دو اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

وہ لوگ جو پیامِ خداوندی کو کھلے کانوں سے سنتے ہیں وہ ''الرحمٰن'' سے ڈرتے بھی ہیں۔ خطرے کا سامنا ہو تو قدرتی انسانی ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اس سے دور بھاگا جائے لیکن اگر معاملہ خوفِ رحمت کا ہو تو صرف یہ اندیشہ رہے گا کہ رحمت سے محروم نہ ہونا پڑے۔ وہ لوگ جو اللہ سے ڈرتے ہیں اس سے دور نہیں بھاگتے، اس کی جانب بڑھتے ہیں۔ بہر کیف، چونکہ اللہ ہی حقیقت ہے سب راستے اسی کی طرف جاتے ہیں، اس سے ہٹ کر اور راہِ فرار انسان کے پاس ہے ہی کہاں۔ پس وہ رسولِ خدا کی مناجات کی پیروی کرتے ہیں ''میں تیرے غضب سے تیری رضا کی پناہ لیتا ہوں، تیرے عذاب سے تیری مغفرت کی پناہ لیتا ہوں اور تجھ سے تیری ہی پناہ میں آتا ہوں''

انسان کو اللہ کے غضب سے بچنا چاہیے اور اس کی رحمت سے چمٹے رہنا چاہیے یعنی ''شرک'' سے گریزاں ہو کر ''توحید'' کی جانب بڑھنا چاہیے۔ کثرت سے وحدت کا سفر کرنا چاہیے۔ غور فرمایئے گا کہ مندرجہ ذیل آیت میں ''انذار'' کو کس طرح اللہ'' کی طرف بھاگنے'' اور ''توحید'' کے اثبات سے متعلق کیا گیا ہے کہ یہی وہ واحد وسیلہ ہے جو قربِ خداوندی کی ضمانت دیتا ہے۔

فَفِرُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ اِنِّىۡ لَكُمۡ مِّنۡهُ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۚ وَلَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ

اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ اِنِّی لَکُم مِّنْہُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۱:۵۰-۵۱)

پس اللہ کی طرف بھاگو! میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی طرف سے تمہارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

انبیاء کی لائی ہوئی بشارتوں اور خوشخبری پر فرحت و شادمانی ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی پناہ میں آ جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے پیامِ ہدایت کو قبول کر کے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ جو اس پیامِ ہدایت پر ایمان لاتے ہیں (کہ فقط تسلیم کر لینا اس امر کے لیے کفایت نہیں کرتا) اور اس پیغامِ ہدایت پر اس طرح عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ان کے اندر سیدنا آدمؑ اور دیگر انبیاء کے اخلاق و اوصاف اور نیکیاں نمو حاصل کر کے ہویدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے، صبر، تواضع اور انکسار، تقویٰ اور دیگر صفات۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُم مُّلٰقُوْہُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ

(۲:۲۲۳)

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے لازماً ملنا ہے اور ایمان والوں کو خوشخبری ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ ۔ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَآ اَصَابَھُمْ وَالْمُقِیْمِی الصَّلٰوۃِ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (۲۲:۳۴-۳۵)

اور خوشخبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

ان پر جو مصیبت آتی ہے اس پر صبر کرنے والے اور نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۱۰:۶۳-۶۴)

ان کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔یہی بڑی کامیابی ہے۔

طٰسٓ تِلْكَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۔ هُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ (۲۷:۱-۴)

یہ طٰس ہے۔یہ قرآن اور ایک واضح کتاب کی آیات ہیں۔یہ ہدایت وبشارت ہے ان ایمان والوں کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت میں یقین رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید نازل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی جو منشا ہے وہ تبھی سمجھ میں آتی اور واضح ہوتی ہے جب اسے ''توحید'' کے سیاق وسباق میں رکھیے اور انسان کی منزلِ آخرین اور مآل وانجام کے تناظر میں دیکھیے۔''توحید'' پر گفتگو تمام ہوئی۔ اب ہم حیاتِ انسانی کے مآل وانجام کی طرف آتے ہیں۔انسان کہاں سے آیا ہے اور اسے لوٹ کر کہاں جانا ہے؟ اللہ کے پاس۔اگلے باب کا موضوع یہی ہوگا،

معاد، سفرِ آخرت اور اللہ کے ہاں لوٹ جانے کے مراحل ۔

# باب پنجم

## آخرت The Return

### موت وحیات کے مرحلے Stages of Life and Death

اسلام کے سارے عقائد اور تمام عبادات کی تہ میں ایک خیال کارفرما ہے، اللہ کی طرف لوٹنے کا خیال، معاد اور آخرت۔ اس کو سمجھے بغیر ''توحید'' و نبوت کی معنویت گرفت میں نہیں آتی نہ توحید و رسالت کو حوالہ بنائے بغیر معاد Return کی معنویت واضح ہوتی ہے۔ ایمان کے یہ تینوں اصول مل کر اسلام کے بنیادی عقائد کے معانی کی تفصیل فراہم کرتے ہیں اور یوں اس تفصیل کی بنیاد پر ''اللہ'' کے لفظ کا وہ مفہوم اُجاگر ہوتا ہے جو قرآن مجید میں نازل ہوا ہے۔توحید، رسالت اور معاد تینوں ایک ہی پیغام کے تین رخ ہیں۔ان میں سے کسی پر بھی بات کیجیے، کسی کی تحقیق کے لیے نکلیے باقی دونوں کو نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔

ایک اعتبار سے یہ کہنا درست ہے کہ رسالت کی بحث دوسرے کلمۂ شہادت ''محمد رسول اللہ'' کی بنیاد پر ضروری ٹھہرتی ہے لیکن دوسرے کلمۂ شہادت کا مدار خود ''توحید'' پر ہے اور توحید کا تقاضا ہے کہ ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' دونوں موجود ہوں۔اگر یہ بات سمجھ لی جائے کہ اللہ تعالٰی کے دو ہاتھ ہیں اور یہ کہ اس کا دایاں اور رحمانی ہاتھ اس کے بائیں اور قہرمانی ہاتھ سے اوپر ہے، اس پر غالب ہے تو یہ دوسرا نکتہ بھی فی الفور سمجھ میں آجاتا ہے کہ اللہ اور اس کی مخلوق میں جو رشتہ ہے اس میں رحمتِ خداوندی کا کردار، اس کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔اپنی رحمت کی طرف لوگوں کو

بلانے کے لیے اللہ تعالیٰ رسولوں اور نبیوں کو بھیجتا ہے جو خبردار بھی کرتے ہیں اور بشارت بھی دیتے ہیں۔

ساری اقلیمِ حقیقت، خدا تعالیٰ اور عالمِ غیب و شہادت سبھی، انسان کی فلاح و بہبود چاہتے ہیں۔ اس تعلق کو ہدایت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ الحق کی بنیادی منشا یہ ہے کہ بطور الھادی انسان کی سعادت اور کمال و فلاح کا سامان کر دیا جائے۔ لیکن اس میں اللہ کے دونوں ہاتھ کارفرما ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اس کے دائیں ہاتھ پر تو توجہ مرکوز رکھے اور بائیں ہاتھ کو نظر انداز کر دے۔ دایاں ہاتھ اگر لوگوں کو ابدی مسرت کی نوید سناتا ہے اور ہمیشہ رہنے والی خوشی کی بشارت دیتا ہے تو ساتھ ہی اس بات سے خبردار بھی کرتا ہے کہ انسان بائیں ہاتھ کی پرچھائیں تلے زندگی بسر کر رہا ہے اور اسے لازم ہے کہ اس زندگی کو اس طرح مرتب کرے کہ اس پر سے بائیں ہاتھ کی یہ پرچھائیں ہٹتی چلی جائے۔

یہ ہے توحید و رسالت کا مختصر بیان۔ انسانی نقطۂ نظر سے یہاں جو بات سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ ان کی خوش انجامی کی کوئی لازمی ضمانت نہیں ہے۔ انسان کی آزادیٔ اختیار ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انسان آزاد ہے کہ اللہ کے دامانِ رحمت کے سائے تلے آنے کے تجربے کو ٹالتا رہے، مؤخر کرتا رہے۔

اسلام میں تصورِ آخرت اور معاد کی بحث کی بنیاد انسانی سرشت اور انسانی مسرت کے ایک خاص تصور پر استوار کی گئی ہے۔ اس تصور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی نکبت اور بدبختی کی نوعیت کو بھی سمجھیں۔ ہم اس سے پہلے ''عہدِ الست'' ''فطرت'' ''بارِ امانت'' ''عبدیت'' اور ''خلافت'' کے تصورات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہم انسانی ذمہ داری اور اس کی جوابدہی پر گفتگو کریں گے یا

یوں کہیے کہ "بارِامانت" اٹھانے کے تقاضوں اور اس کے نتائج پر بات ہوگی۔

معاد و آخرت کی بحث کو عموماً دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ان کو "معادِ اختیاری" اور "معادِ اضطراری" کا نام دیا گیا ہے۔ اس تقسیم سے آپ کو اسلام اور عبدیت کی دو قسمیں یاد آئیں گی جن پر پہلے تبصرہ کیا گیا تھا یعنی کائناتی، عالمگیر "اسلام" اور "اسلامِ نبوی" نیز اختیاری بندگی اور اضطراری بندگی۔

اپنی خلقی سرشت وفطرت کے لحاظ سے نوعِ انسانی اللہ کے سامنے سرافگندہ، اور مطیع ہونے پر مجبور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس امر کے لیے آزاد بھی ہے کہ انبیاء کے لائے ہوئے پیغام کو قبول کر لے یا اس سے منہ موڑ لے۔ اس طرح انسان کے پاس اللہ کی طرف لوٹ جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ایک روز سبھی کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ہر انسان کو موت آئے گی اور ہر شخص اللہ کے حضور میں پہنچے گا۔ ہاں اس دنیا سے رخصت ہونے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خوشی خوشی یہ جانتے ہوئے رخصت ہوں گے کہ انہوں نے پیغمبروں کے لائے ہوئے احکامات وہدایات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے کہے ہوئے کے خلاف نہیں کریں گے، ان کا وعدہ پورا ہوگا۔ کچھ دوسرے ایسے بھی ہوں گے جنہیں گردن سے پکڑ کر کھینچا جائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳:۱۸۵)

ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ

(۸٤:٦)

اے انسان تو بھی کشاں کشاں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے اور اس

سے ملنے والا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (٤٨:٢٩)

اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے مغفرت اور ایک اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (٤:١٢٢)

اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن میں نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ حق جانو اور اللہ سے زیادہ وعدے کا سچا کون ہو سکتا ہے!

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (١٠:٥٥)

سن رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٦٢:٨)

ان کو بتا دو کہ جس موت سے تم بھاگ رہے ہو وہ یقیناً تم سے دوچار ہو کر رہے گی، پھر تم غائب و حاضر کے جاننے والے کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔ پس وہ تم کو ان سارے اعمال سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے

ہو۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (٦:٩٤)

اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ ظالم موت کی جان کنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جان حوالہ کرو۔

موت کے بعد تو ہر انسان کو مجبوراً لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہی ہے لیکن وہ چاہیں تو اس دنیا کی زندگی میں بھی اللہ کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اللہ کا بندہ بننے سے وہ راہ کھلتی ہے جو اللہ کے قرب تک لے جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے وہ اللہ تک پہنچ جائیں (یہ وہ مقصد اور منزل ہے جس پر اسلام کی تیسری جہت میں زور دیا جاتا ہے) یا پھر وقتِ مرگ ان پر یہ کھلے کہ وہ الحق سے نسبتاً زیادہ قریب آ چکے ہیں۔ پس ایسے لوگ کہیں زیادہ مکمل اور مقرب ہوں گے بہ نسبت ان لوگوں کے جو پیغامِ خداوندی سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کو اپنی اغراض اور خواہشات کے مطابق بسر کرتے رہے۔

معاد (لوٹنا، واپس ہونا) کا لفظ ہمیں اس نکتے سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ مصنفین جو اس موضوع کو زیرِ غور لاتے ہیں وہ صرف اس بات تک بحث کو محدود نہیں رکھتے کہ انسان کہاں جا رہا ہے۔ وہ اس نکتے پر بھی کلام کرتے ہیں کہ انسان آیا کہاں سے ہے۔ انسان اگر ''لوٹ کر'' جا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے وہاں تھا جہاں اب واپس جا رہا ہے۔ انسان آیا کہاں سے ہے، عام طور پر یہ بحث ایک اور عنوان کے تحت کیجاتی ہے یعنی ''آغاز و ابتداء'' (مبداء)۔ بہت سی کتابوں کا تو نام ہی اس

پر رکھا جاتا ہے ''المبداء والمعاد'' یعنی آغاز وانتہا۔یا ان کتب کے عنوان میں ''مبداء'' اور ''معاد'' کے الفاظ کسی طرح شامل ہوتے ہیں۔

''مبداء'' (آغاز) اور ''معاد'' (واپسی، منتہا) دونوں الفاظ قرآنی اصطلاحات سے اخذ کیے گئے ہیں اگرچہ قرآن مجید نے اس مفہوم کے لیے اور بھی کئی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۷:۲۹)

جس طرح اس نے تمہارا آغاز کیا اسی طرح تم لوٹو گے۔

وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۴۱:۲۱)

اور وہی ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی جانب لوٹائے جا رہے ہو۔

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (۲۱:۱۰۴)

جس نے طرح ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ

(۱۰:۴)

اسی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تا کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کو عدل کے ساتھ بدلا دے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ

الْاُمُوْرُ (۳:۱۰۹)

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔

"ہر شے" یا "ہر امر" کو اس کی طرف لوٹ کر آنا ہے، اللہ کی طرف لوٹایا جانا ہے، یہ قرآن مجید میں بہت سی آیات میں وارد ہوا ہے۔ بعض آیات میں قرآن مجید نے انسان کے سفر کی چند تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ ان کا آغاز انسان کی ابتداء یا ابتداء کے قریب سے ہوتا ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲:۲۸)

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں وہ بڑے بڑے مراحل آ گئے ہیں جن پر مبداء و معاد کی کتابوں میں بحث کی جاتی ہے یعنی: عدم اور نیستی، یہ دنیا، موت، قبر کی زندگی حشر اور قیامت۔ قیامت کے بعد انسان دو گروہوں میں بانٹ دیئے جائیں گے، ایک وہ جو جنت میں جائیں گے اور دوسرے وہ جن کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔

## موت و حیات Life and Death

معاد یا اللہ کی طرف واپسی پر بات کرنے کے لیے ضروری ہے کہ "زندگی" اور "موت" کی اصطلاحات کا بار بار حوالہ دیا جائے لہٰذا ان دونوں الفاظ کے معانی کا

ایک واضح تصور ذہن ہونا چاہیے۔ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھا کہ انسان کے اس دنیا میں داخل ہونے کی حالت کو قرآن مجید نے ''مردہ شے'' (امواتاً) کہا ہے۔یہ موت یا مردنی کوئی مطلق موت نہیں ہوسکتی کیونکہ ''عہدِ الست'' باندھنے کے لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی نوع کی ہستی رکھتا ہو، موجود ہو، تا کہ اس سے عہد لیا جا سکے۔لہٰذا اس دنیا سے پہلے کا عالمِ مرگ ایک اضافی موت ہوگی۔ اس طرح اس دنیا کی زندگی کوئی مطلق زندگی نہیں ہے کیونکہ یہ زندگی کچھ زیادہ دنوں کی نہیں ہوتی نہ اس کا کوئی اعتبار ہے کہ کب عمر کی نقدی ختم ہو جائے اور موت کا بلاوا آ جائے۔اسی طرح سفرِ حیات کے آخر میں جو موت ہے وہ بھی کوئی مرگِ مطلق نہیں ہے بلکہ ہستی کے ایک طور سے دوسرے طور میں، ایک اندازِ ہستی سے دوسرے میں منتقل ہونے کا نام ہے۔اس دوسرے اندازِ ہستی کا نام ''قبر'' ہے جس میں بہت سے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور ''مردہ شخص'' کو تجربات ہوتے رہتے ہیں۔تجربہ کرنا، کوئی واقعہ پیش آنا، زندہ ہستیوں کی صفت ہے، مردہ اشیاء کی نہیں۔سو یہ جسے موت کہتے ہیں اصل میں صرف اس دنیا کے لحاظ سے موت ہے، سارے عالمِ حقیقت کے مقابل اور اس کے حوالے سے موت نہیں ہے۔قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو ''الحی، القیوم'' کہا ہے (۲:۲۵۵)۔ بالفاظ دیگر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنے آپ سے زندہ ہے، اپنی ذات سے قائم ہے۔توحید کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا زندہ کوئی نہیں اور اپنے آپ سے قائم کوئی نہیں، اللہ کے سوا ہر شے اگر اسے اللہ سے جدا کر کے دیکھا جائے تو سرے سے مردہ ہے بلکہ وجود ہی نہیں رکھتی۔حی اور قیوم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔پس اگر کسی شے میں زندگی ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حیات عطا کی ہے اور اگر کوئی شے قائم ہے تو اسی لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قائم رکھا ہے۔وہ مخلوق جسے زندگی ملے ہے اس کی زندگی کا اگر اللہ کی حیات سے

مقابلہ کیا جائے تو اسے موت ہی شمار کیا جائے گا۔انسان کو زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ساعت میں پوری طرح مردہ نہیں ہے۔لیکن بہت جلد موت اسے آن لے گی اور اس کی اس زندگیِ ناپائیدار کا اختتام ہو جائے گا۔زندگی کی اسی بے ثباتی اور ناپائداری سے انسان کو زندگی ہی میں موت کا تجربہ ہو جاتا ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (۲۸:۸۸)

اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔

اللہ تعالیٰ اگرچیزوں کو زندہ کرتا ہے تو ان سے زندگی چھین بھی لیتا ہے اسی لیے اس کو صرف المُحیی نہیں کہا گیا المُحیی (زندگی دینے والا،حیات آفریں) اور المُمِیت (مارنے والا،موت دینے والا) بھی کہا گیا ہے۔یہ وہ نام ہیں جو قرآن مجید میں اللہ کے لیے آئے ہیں۔

اس کائنات کے اندر نہ تو حیاتِ مطلق پائی جاتی ہے نہ مرگِ مطلق۔ہاں اس کائنات سے باہر اللہ تعالیٰ حیاتِ مطلق ہے اور عدم،جس کا بہرحال کوئی وجود نہیں،مرگِ مطلق کے مترادف ہے۔

حیاتِ خداوندی حیاتِ ناب ہے،خالص اور بے ملاوٹ زندگی،جس میں موت کا شائبہ تک نہیں۔موت کیا ہے زندگی کا نہ ہونا یا زندگی کا رک جانا،ختم ہو جانا۔انسانی زندگی ناخالص بھی ہے اور اس میں موت بھی ملی ہوئی ہے۔اور بیماری یا کسی ذہنی آزار کا سامنا ہو تو بسا اوقات یہ زندگی موت سے بدتر معلوم ہوتی ہے۔صحت اور تندرستی قائم بھی رہے تب بھی زندگی کی ڈور نازک سی چیز ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں۔کون کہہ سکتا ہے کہ اسے آنے والا کل دیکھنا یقیناً نصیب ہوگا۔لیکن اگر

انسانی زندگی میں موت گھلی ملی رہتی ہے تو اس کی موت میں بھی زندگی کی آمیزش ہوتی ہے۔ عالمِ تخلیق کی سطح پر ہر مخلوق کی زندگی کے لیے موت ایک لازمی چیز ہے، جیسے دن کے بعد رات۔ ایک چیز کا تجربہ کرنا ہو تو دوسری کا مزا بھی چکھنا پڑتا ہے۔

قرآن مجید جب موت کا ذکر کرتا ہے تو اس سے عموماً اس کی مراد اس دنیا کی زندگی کے مقابلے میں موت ہوتی ہے۔ ہم نے سطورِ بالا میں جس آیت کا حوالہ دیا تھا اس میں قرآنِ مجید نے انسان سے یہ سوال کیا ہے کہ ''کہ تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا؟''

انسان کس طرح حقیقتِ خداوندی کو جھٹلا سکتا ہے اور کیونکر اس کی ناشکری کر سکتا ہے جبکہ ذرا سا غور و تدبر اسے بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ ہرگز زندگی پر اپنا حق نہیں جتا سکتا۔ ایک وقت ایسا تھا کہ انسان مردہ تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہے تو اس میں اس کا اپنا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ اس کی موجودہ زندگی اس کے اندر پھونکی جانے والی روح کی روشنی سے پھوٹتی ہے۔ جس طرح آب و گل کے اندر روح کا نور چھپا رہتا ہے۔ اسی طرح بدن کے اس سانچے میں زندگی اگرچہ کمزور اور ناپائیدار ہوتی ہے لیکن بہرحال ہے تو زندگی۔

## This World and the Next World دنیا اور آخرت

اسلام میں کائنات کا جو تصور اور جو نظام بیان ہوا ہے اس پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کے بنیادی نکات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اور یہ کائنات ''ماسویٰ اللہ'' ہے۔ پس یہ کائنات بے حقیقت ہے۔ تاہم غیر حقیقی ہونے کے بھی کئی درجے ہیں

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اضافی طور پر حقیقت کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ کچھ چیزیں دوسری چیزوں سے زیادہ حقیقی ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں کچھ چیزوں سے کم حقیقت رکھتی ہیں۔ مطلقاً غیر حقیقی صرف ایک چیز ہے۔ محض اور صرف عدم اور نیستی۔ اس کے علاوہ ہر شے میں ایک طرح کی حقیقت پائی جاتی ہے۔

آسمان زمین سے زیادہ حقیقی ہیں کیونکہ آسمان وہ بلند اور نورانی عالم ہے جس میں نور، حیات، علم، ارادہ، قدرت اور کلام جیسی صفاتِ خداوندی اپنا بھرپور رنگ ظاہر کرتی ہیں۔ آسمانوں کے باسی، روحیں اور فرشتے، اللہ کے قرب میں مسکن پاتے ہیں۔ اس کے برعکس زمین ایک تاریک اور پست دنیا ہے جہاں صفاتِ خداوندی کا بس مدھم سا عکس پڑتا ہے۔ وہ اشیاء جو سراسر زمینی سرشت رکھتی ہیں مثلاً بے جان چیزیں وغیرہ وہ اللہ تعالیٰ سے اضافی طور پر ایک دوری میں پڑی ہوتی ہیں۔

زمین و آسمان کے درمیان بہت سی مخلوقات ہیں مثلاً پودے اور جانور۔ ان میں آسمانی خواص بھی ہیں جو انہیں حیات، ارادہ، قدرت، دیگر صفاتِ خداوندی کے وسیلے عطا ہوتے ہیں اور ان میں اپنے مادی اجسام کی وجہ سے زمینی اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مخلوقات صفاتِ زمینی اور صفاتِ آسمانی دونوں کا آمیزہ ہوتی ہیں۔ دوسرے جانداروں سے نوعِ انسانی اس لحاظ سے الگ ہے کہ اسے صفاتِ خداوندی میں سے سب سے زیادہ صفات میسر آئی ہیں۔ وہ صفات بھی جو آسمانوں میں ظاہر ہوئی ہیں اور وہ بھی جو زمین پر نمودار ہوتی ہیں۔ دوسری ہر مخلوق کچھ نہ کچھ صفاتِ خداوندی سے عاری ہوتی ہے۔ ''سارے اسماء کا علم'' تو صرف انسان کو عطا ہوا ہے۔

یہ کائنات ایک نظامِ درجات پر استوار کی گئی ہے۔ بے جان اشیاء، نباتات

اور حیوانات یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ سے افزوں تر قرب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ الحق ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ کر حقیقت کے درجات کے نمائندہ ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے ہم ان درجات کو زینہ بہ زینہ طے کرکے نوعِ انسانی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں حیات، علم، ارادہ اور قدرت جیسی صفاتِ خداوندی زیادہ کھلے طور پر اور زیادہ شدت سے اپنا ظہور کرتی ہیں۔اسی طرح ساتوں آسمان اللہ تعالیٰ نے درجہ بہ درجہ قرب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان آسمانوں سے وراء پہلے کرسی ہے اور پھر عرشِ خداوندی۔اس عرش پر الرحمٰن متمکن ہے جو اس ساری کائنات کو اپنی رحمت تلے سمیٹے ہوئے ہے۔یہ کائنات بھی اس کی رحمت کے سوا کچھ اور نہیں، اس کا کرم، اس کی عطا ان بے مایہ لوگوں کے لیے جن کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔اور سب کچھ تو چھوڑیے ان کا تو وجود اور ہستی بھی اسی کی دین ہے۔

کائنات کا یہ نقشہ بنیادی طور پر سکونی ہے۔اس میں خالق اور مخلوق کے مابین جس رشتے کی صورتگری کی گئی ہے وہ لحۂ حاضر تک محدود ہے۔لیکن قرآن مجید اللہ تعالیٰ سے اس سے کہیں زیادہ حرکی، فعال اور بدلتے ہوئے تعلق کو بیان کرتا ہے۔ اور اس کے لیے جو اصطلاحات اس نے استعمال کی ہیں وہ ہیں ''سامنے یا قریب کی چیز'' یعنی الدنیا اور ''آخیر والی'' یا ''آنے والی دنیا'' یعنی الآخرۃ۔قرآن مجید نے کائنات کے ان دو حرکی اور سکونی نقشوں اور صورتوں کے درمیان تعلق کو بہت کھول کر بیان نہیں کیا ہے۔لہٰذا مفسرین کے یہاں اس بارے میں کئی طرح کی آراء دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''یہ دنیا'' سے مراد ہے وہ عالَم جہاں ہم اس وقت ہیں۔اور آخرت یا وہ دنیا اس عالَم کو کہتے ہیں جہاں ہم اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد رکھے جائیں

گے۔ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ عالمِ آخرت کا آغاز قیامت سے ہوگا۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق قبر چونکہ موت اور قیامت کے دوران کے وقفے کو کہتے ہیں لہٰذا اس میں اس دنیا اور اگلے جہان دونوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اس کی مثال نفسِ انسانی جیسی ہے۔ جو بدن اور روح کے درمیان واقع ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قبر کی مشابہت نفسِ انسانی سے اتنی زیادہ ہے کہ اسے اکثر موت کے بعد ہستیِ نفسِ انسانی ہی قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس تصور پر ہم آگے چل کر پھر گفتگو کریں گے۔

توحید کی روشنی میں ہمیں بات فوراً سمجھ آجاتی ہے کہ اس دنیا کی زندگی فانی اور ناپائیدار ہے کیونکہ اصلی زندگی تو صرف اللہ ہی کی ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں ان نکات کا بیان ہوا ہے وہاں ان سے کچھ نتائج بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ ماہیتِ اشیاء کا بیان اسی لیے کیا گیا ہے کہ انسانوں پر معنیِ ہستی عیاں ہو سکیں۔ ہر شے ایک نشانی ہے اور اس میں کچھ معانی پنہاں ہیں لیکن انسان غافل ہے اور اسے ان معانی کی بازیافت اور یاددہانی کی ضرورت رہتی ہے۔ قرآن بار بار یہ بات یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی آنی جانی ہے، چند روزہ اور بے ثبات ہے۔ یہ بات کہیں کھلے لفظوں میں اور کہیں قصہ کہانی اور مجاز و تمثیل کے رنگ میں بیان ہوئی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں ایک تمثیل بیان ہوئی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (۱۸:۴۵)

اور ان کو اس دنیاوی زندگی کی تمثیل سناؤ کہ اس کو یوں سمجھو کہ بارش ہو جس کو ہم نے آسمان سے اتارا پس زمین کی نباتات اس سے خوب اپچیں، پھر

وہ چورا ہو جائیں جس کو ہوائیں لیے پھریں۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

قرآن نے زور اسی بات پر دیا کہ روندی اور مسلی ہوئی سوکھی گھاس بھوسے کے لیے زندگی صرف کرنے والے اپنی عمرِ عزیز اور قیمتی وقت کا زیاں کرتے ہیں، یہ انسان کو انسان کے مرتبے سے گرا دینے کی بات ہے۔ وہ شے جس کا اعتبار ہی نہ ہو، جو کسی لمحے دم دے جائے، اس ہستیِ ناپائیدار کے لیے زندگی کا گنوانا کیسا! انسان کا عمل ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ گویا زندگی کے معنی صرف کاروبارِ دنیا میں پوشیدہ ہیں یا روزمرہ کی زندگی اور اس کے تجربات و واقعات اللہ کی نشانیوں کے سوا اور بھی کچھ معنویت رکھتے ہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی انسان کی آنکھ دیکھتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ صرف چیزوں کے ظواہر پر نہ جاؤ، ظاہر سے دھوکہ نہ کھاؤ۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ (۶:۳۲)

اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۰:۷-۸)

جو لوگ ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے اور اسی دنیا کی زندگی پر قانع اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں انہی لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کے اعمال کی پاداش میں۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۔ وَلَوْ

تَرٰی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ (۶:۲۹-۳۰)

کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد ہم اٹھائے نہیں جانے کے۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ (۶:۱۳۱)

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمہارے پاس تمہیں میری آیتیں سناتے اور تمہارے اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہوئے، تم میں سے رسول نہیں آئے؟ وہ بولیں گے: ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۵:۵)

اے لوگو! اللہ کا وعدہ سچا ہے تو تم کو یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے باب میں تم کو فریب کار شیطان فریب میں رکھے۔

اس دنیا کی زندگی کہاں کی زندگی ہے۔ اصل زندگی، سچی زندگی تو خدا کے ہاں ہے، اس کے قرب میں ہے۔ اگلا جہان، آخرت کی دنیا، اس دنیا کے مقابلے میں ہمیشہ رہنے والی ہے کیونکہ وہ حقیقت سے، الحق سے قریب تر واقع ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۲۹:۶۴)

اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے اور دارِ آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ ہے، اگر وہ اس کو جانتے۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۹:۳۸)

کیا تم آخرت کی مقابلے میں دنیا کی زندگی پر قانع ہو بیٹھے ہو؟ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا کی زندگی تو بہت ہی حقیر ہے۔

وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ج وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۸:۶۰)

اور جو چیز بھی تمہیں عطا ہوئی ہے تو یہ بس حیاتِ دنیا کی متاع اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے۔

عقل وہ نورِ روحانی ہے جو ''توحید'' کا شعور بیدار کرتی ہے۔ یہ انسان کی سرشت و نہاد میں ہے پس عقل کو فی الفور یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ''اللہ کی حیات کے سوا اور کوئی حیات نہیں'' اور اس کے سوا اور ہر زندگی ایک دھوکے سے زیادہ نہیں۔

ایک حدیث میں اس دنیا کی زندگی کی بے ثباتی اور اگلے جہان کی حقیقت کا فرق بہت خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا:۵۸؎

روزِ قیامت اہلِ دوزخ میں سے اس آدمی کو لایا جائے گا جس کی دنیا کی زندگی سب سے مزے میں گزری تھی اور نے ہر نعمت پائی تھی۔ اسے ایک مرتبہ آگ میں ڈال کر نکالا جائے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا۔ ''اے فرزندِ آدم، کیا تو نے کبھی کوئی خیر و برکت دیکھی، کیا تجھے کبھی کوئی نعمت ملی؟'' وہ جواب دے گا کہ ''اے میرے رب،

کبھی نہیں۔ مجھے قسم ہے اللہ کی"۔

پھر اہلِ جنت میں سے اسے لایا جائے گا جس کی زندگی دنیا میں نہایت صعوبت اور تکلیف کی زندگی رہی تھی۔ اسے ایک مرتبہ جنت میں داخل کر کے نکال لیا جائے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا، "اے فرزند آدم! کیا تو نے کبھی کسی دکھ تکلیف کا سامنا کیا؟ کیا تجھ پر کبھی کوئی مشکل پڑی؟" وہ جواب دے گا "نہیں میرے رب۔ واللہ مجھ پر تو نہ کبھی کوئی مشکل آئی نہ مجھے دکھ تکلیف کا سامنا ہوا

## قبر The Grave

اگلے جہان کی جانب پہلا قدم یا اگلے جہان کا پہلا مرحلہ قبر کہلاتا ہے۔ انسان مر کر قبر میں پہنچتا ہے۔ موت اس لیے آتی ہے کہ یہ اللہ کا کام ہے۔ وہ جس طرح زندگی کو بقدرِ اندازہ معین کرتا ہے اسی طرح موت کو بھی اپنے پیمانۂ تقدیر سے معین کر دیتا ہے۔ اسلام جس طرح اس دنیا، موت و حیات اور کائنات کو دیکھتا ہے اس نقطۂ نظر سے یہ ایک بالکل ہی اجنبی اور انوکھا خیال ہوگا اگر کوئی یوں سوچے کہ موت ایک حادثہ ہے جو روکا جا سکتا تھا اگر مزید احتیاط کی جاتی یا اسے ٹالا جا سکتا تھا اگر علمِ طب میں اور ادویات میں کچھ اور ترقی ہو چکی ہوتی۔

قرآن مجید نے اکثر کہا ہے کہ ہر شے کو ایک مقررہ میعاد، ایک معین وقت تک کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ وہ فرشتہ جو جنینِ انسانی میں روح پھونکتا ہے اسی لمحے اس شخص کی عمر بھی ثبت کر دیتا ہے۔ موت تو اٹل ہے ہی اور اس سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں اس کے ساتھ موت کا وقت اور دن بھی معین ہے۔ دیگر تمام صفاتِ خداوندی کی طرح حیات بھی نپی تلی ہوتی ہے اور بقدرِ نصیب ہی ملتی

ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا

(۳:۱٤٥)

اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے، ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔

اس کا یہ مطلب کسی طرح نہیں نکلتا کہ لوگ باگ بے پرواہ ہو کر بیٹھ جائیں۔ لمحۂ مرگ کا معین ہونا بھی ان مثالوں میں سے ایک ہے جہاں جبر و اختیار ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ چناؤ کی آزادی، اختیارِ انسانی کا بھی ایک کردار ہے اور ہر انسان مانتا ہے کہ اسے انتخاب کرنے کا موقع اور صلاحیت دی گئی ہے۔ انسان اگر موت و حیات سے بیگانہ ہو جائے اپنے مرنے جینے کی پرواہ ہی نہ کرے تو یہ اس کا اپنا انتخاب ہے۔ قرآن کا ارشاد تو یہ ہے کہ

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲:۱۹٥)

اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو۔

مسلمانوں کو معقول حد تک احتیاط پسند ہونا چاہیے اور چونکہ ہر شخص کے لیے ''معقول حد'' اور ''مناسب حد'' کا فیصلہ کرنا آسان نہیں لہٰذا انہیں اس کے لیے رہنمائی درکار ہوگی اور دیگر معاملات کی طرح قرآن مجید اور رسولِ خداؐ کی سنت سے رجوع کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ انسان کی عمر اور اس کا اسلوبِ مرگ پہلے سے مقرر ہے خواہ مرنے والے نے خودکشی کر کے زندگی کا خاتمہ کیا ہو۔ تاہم رسولِ خداؐ نے صاف صاف فرما دیا کہ خودکشی ایک بڑا گناہ ہے جب آپؐ نے کہا: ''جس نے خودکشی کی وہ ہمیشہ کے لیے آگ میں پڑے گا''[۵۹] عمل کوئی بھی ہو اس کی ذمہ داری اس کے فاعل کی ہے اور اس کا نتیجہ بھی اسی کو بھگتنا ہوگا۔

قرآن مجید نے بعض مقامات پر اس گمراہ خیالی کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے تحت انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح موت کو ٹال سکتا ہے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَى قف وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۔ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ (۴:۷۷-۷۸)

تو جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ اور وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، کچھ اور مہلت کیوں نہ دی؟ کہ دو: اس دنیا کی متاع بہت تھوڑی ہے اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور تمہارے ساتھ ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی اور موت تم کو پالے گی تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اگر چہ مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔

موت کو تو آنا ہی ہے، اس سے کوئی مفر نہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی موت کب اور کیسے ہو گی۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۳۱:۳۴)

اور نہ کسی کو بھی پتا نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ وہ

کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علم والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

اس آیت میں جو نکتہ بیان ہوا ہے وہ سیدنا سلیمانؑ کے بارے میں سنائے جانے والے ایک قصے میں بھی آیا ہے۔ یہ قصہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ ہوا یوں کہ سیدنا سلیمانؑ کے ہاں ایک روز ایک دوست مہمان ہوا۔ آپ اس سے بات چیت میں مصروف تھے کہ حضرت سلیمانؑ کے وزیر نے آ کر اطلاع دی کہ عزرائیل آئے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے پاس فرشتۂ اجل یعنی عزرائیلؑ اکثر آیا کرتے تھے۔ باہم گفتگو رہتی تھی۔ حضرت سلیمانؑ نے انہیں بلوالیا۔ ان کے ساتھ نظامِ عالم اور ان دیگر امور پر بات ہوئی جو فرشتوں اور انبیاء کے معاملات ہوا کرتے ہیں۔ ان کے رخصت ہوتے ہی اس دوست نے حضرت سلیمانؑ سے تقاضا کرنا شروع کر دیا کہ آپ مجھے کوئی ذمہ داری دے کر ہندوستان بھجوا دیجیے۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سے پوچھا کہ بھئی یہ اچانک ہندوستان جانے کا خیال تمہارے سر پر کیوں سوار ہو گیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ عزرائیل نے کمرے میں داخل ہو کر مجھے عجیب طرح سے گھور کے دیکھا تھا۔ ڈرتا ہوں کہ وہ میری جان لینے کے لیے دوبارہ نہ چلے آئیں۔ حضرت سلیمانؑ کو یقین تھا کہ ان کا مہمان بلا سبب خوفزدہ ہو گیا ہے لیکن اس کو خوش کرنے کے لیے آپ نے اسے جادوئی قالین پر بٹھا کر ہندوستان بھجوانے کی حامی بھر لی۔ چند ہفتے بعد عزرائیل دوبارہ ملنے آئے۔ حضرت سلیمانؑ کو وہ واقعہ یاد تھا۔ آپ نے عزرائیل سے دریافت کیا کہ کیا واقعی آپ نے اس شخص کو گھور کر دیکھا تھا۔ عزرائیل نے جواب دیا کہ شاید ایسا ہی رہا ہو گا کیونکہ میں اسے آپ کے ہاں دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا کہ اسی روز مجھے حکم ہوا تھا کہ کل کو اس شخص کی روح ہندوستان میں قبض کر لوں۔

اللہ تعالیٰ ہی زندگی دیتا ہے اور وہی زندگی چھین بھی لیتا ہے لیکن اس کام کے لیے اس کے ہاں کچھ درمیانی واسطے ہیں۔ اس سے قریب ترین واسطے اس کے فرشتے ہیں۔ قرآن مجید میں عزرائیلؑ کا نام تو نہیں آیا لیکن انہیں ''موت کا فرشتہ'' کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔

بَلۡ هُمۡ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ كٰفِرُوۡنَ ۔ قُلۡ يَتَوَفّٰٮكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِىۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ (۳۲:۱۰-۱۱)

بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے آگے پیشی کے منکر ہیں۔ کہہ دو کہ تمہاری جان وہ فرشتہ ہی قبضہ کرتا ہے جو تم پر مامور ہے پھر تم اپنے رب کی طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔

بدن کے قالب کو اس دنیا میں چھوڑ کر نفوسِ انسانی کو ایک مختصر امتحان اور فیصلے سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد قبر ان کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ یہ چیز جسے قبر کہا گیا ہے نہ صرف وہ چوکور گڑھا ہے جس میں انسان کی جسدِ خاکی کو دفن کیا جاتا ہے نہ اس سے بالکل مختلف کوئی اور شے۔ احادیث کے بیان کے مطابق قبر کی پہلی رات کو دو فرشتے منکر اور نکیر لوگوں کی آزمائش کرتے ہیں اور ان سے اللہ، اللہ کے رسول اور کتابِ خداوندی کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ اگر ان کے جواب درست ہوں تو قبر کو کھلا اور آرام دہ بنا دیا جاتا ہے۔ جس میں وہ یومِ قیامت سے پہلے تک ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ اس لمحے تک جب اسرافیلؑ صور پھونکیں گے اور زمین و آسمان میں ہر شخص غش کھا جائے گا۔ اگر سوالات کے جواب غلط نکلے تو انسان کی قبر بہت تنگ کر دی جائے گی اور اس میں ہر وہ شے بھر جائے گی جس سے انسان کراہت کرتا تھا، ڈرتا تھا۔ اس کے گرد سانپ، بچھو، مکڑیاں ہوں گی جو اس روز تک اسے عذاب سے

دو چار رکھیں گی جب صور پھونکا جائے گا۔

اس دنیا کے خاتمے تک مرنے والے اپنی قبروں میں رہیں گے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ دنیا کب تک رہے گی۔ بہرکیف قبر میں انسان کی ہستی اس دنیا میں اس کی زندگی کے مانند نہیں ہے۔ پس قبر کے احوال اور وہاں کا قاعدہ کلیہ بھی اس دنیا سے کچھ الگ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہی دیکھیے کہ زمانہ اور وقت پہلے کی طرح ٹھوس اور خارجی نوعیت کا نہیں رہتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ اس دنیا میں آپ سورج اور چاند کے حساب سے یا گھڑی دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ کتنا وقت بیت گیا۔ لیکن قبر کی دنیا میں وقت کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ وہاں اس کا ایک زیادہ قریبی تعلق صاحبِ قبر پر گزرنے والے حالات کے داخلی احساس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ہماری دنیا میں بھی اگر دندانساز کا زنبور اور نشتر دانتوں کو کریدا کھیڑ رہا ہو تو پانچ منٹ بھی ایک گھنٹہ لگتے ہیں اور کسی یارِ خوش خصال کے ساتھ دل کی بات کرتے ہوئے گھنٹہ بھر کی گفتگو بھی چند منٹ کا وقفہ معلوم ہوتی ہے۔ اُس دنیا میں، قبر میں ''جیسا لگتا ہے'' جو محسوس ہوتا ہے وہی ہوتا بھی ہے۔ آپ پر جو بیت رہی ہوتی ہے اسی کے مطابق آپ کا طرزِ احساس ڈھلتا جاتا ہے لیکن وہی ایک چیز دوسرے کسی شخص کو کسی اور طرح لگے گی۔ اس کا انحصار اس کی اپنی فطرت پر ہے۔ وہ جیسا ہوگا ویسا ہی پائے گا۔ کسی کو قبر کا عرصہ بہت تھوڑا سا لگے گا اور کسی کو اتنا لمبا کہ گمان سے باہر جبکہ دونوں کی موت ایک ہی روز واقع ہوئی ہوگی۔

## اختتامِ عالم The End of the World

قرآن مجید نے جس طرح موت کے بعد پیش آنے والے واقعات سے انسان کو خبردار کیا ہے اسی طرح اس نے دنیا کی آخری ساعتوں کے بارے میں بھی

تنبیہ کی ہے، وہ وقت جب انسان کے گردوپیش کی دنیا، یہ زمین و آسمان سرے سے بدل جائیں گے۔ روزِ قیامت صرف اگلے جہان کا روزِ حشر ہی نہیں ہوگا، اس دن ہماری اس دنیا کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ قیامت اور یومِ آخر سے پہلے کئی واقعات سامنے آئیں گے جو روزِ آخرت کی آمد کی نشانیاں ہوں گی۔ احادیث میں قیامت کی نشانیوں کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا گیا ہے۔ آپؐ نے خبردار فرمایا تھا کہ قیامت کی گھڑی قریب آ چکی ہے۔ ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کے درمیان ذرا سا فاصلہ کرتے ہوئے فرمایا ''مجھ میں اور آخر (الساعۃ) میں بس اتنی دوری ہے''۔ ۶۰

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں میں سب سے آخری رسول ہیں، یہ خیال اور دنیا کے خاتمے اور قربِ قیامت کا خیال ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ آپؐ کا پیغام انسان کے لیے آخری پیغام ہے، اس کے بعد انسان کے پاس ہدایت پانے اور اپنی اصلاح کرنے کا اور کوئی موقع نہیں ہوگا۔ آغازِ اسلام کے زمانے میں کتنے ہی لوگوں کو یہ توقع تھی کہ دنیا کا خاتمہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی ہو جائے گا۔ سیدنا عیسیٰؑ کے ماننے والوں میں بھی پہلی نسل کے کتنے ہی لوگ اسی خیال کی پرورش کرتے رہے۔ یہ دنیا اگر ابھی تک گھسٹ رہی ہے تو اس سے قربِ قیامت کے عقیدے پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کے لیے ''ایک دن پچاس ہزار سال ہے'' (۷۰:۴) بلکہ ایک دوسری آیت میں یوں آیا ہے:

ان یوم عندربك كالف سنة مما تعدون (۲۲: ٤٧)

تمہارے رب کے ہاں کا دن تمہارے حساب سے ہزار برس کا ہے۔

پچاس ہزار سالہ دن کا صرف ایک گھنٹہ بھی اگر آپؐ کے اور روزِ قیامت کے

درمیان باقی تھا تب بھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ہمیں اس ''ساعت'' کے انتظار میں خاصا وقت کھینچنا ہے۔ قرآن مجید سے ہمیں اتنی بات یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ یہ دنیا کب ختم ہو گی۔ جو بھی اس گھڑی کا علم رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔

یاد رہے کہ اس دنیا کے خاتمے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ کائنات، یہ باہر کی دنیا ختم ہو جائے گی۔ عالِم صغیر microcosm کا بھی یہ لحۂ آخر ہو گا۔ اس جہانِ پیر کی موت جس طرح واقع ہو گی وہ فرد کی موت سے بہت مشابہ ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں کچھ آیات میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔ اس دنیا میں رہنے والوں کی موت اور دنیا کا اختتام۔ ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ ''من مات فقد قام قیامتہ''[61]

اسی بات کو بعد میں اسلامی روایت نے ''قیامتِ صغریٰ'' (چھوٹی قیامت) اور ''قیامت کبریٰ'' (بڑی قیامت) کی اصطلاحات سے یاد کیا ہے اور فرد کی موت (چھوٹی قیامت) کو آنے والی بڑی قیامت کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔ آیات ذیل میں ''السٰاعۃ'' کا لفظ آیا ہے۔ قرآن مجید میں جو الفاظ روزِ قیامت، روزِ آخرت کے لیے استعمال ہوئے ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْهُوَ اَقْرَبُ(١٦:٧٧)

اور قیامت کا معاملہ بس آنکھ جھپکنے کی طرح یا اس سے بھی جلدتر ہو گا۔

وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ(٢٢:٧)

اور قیامت آکے رہے گی، اس کے آنے میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ ان سب کو

ایک دن زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (۷:۱۸۷)

وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا۔ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں۔ وہ تم پر بس اچانک ہی آ دھمکے گی۔

يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (۳۳:۶۳)

لوگ تم سے قیامت کے وقت کو پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے اور تمہیں کیا پتہ شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔

قیامت کے دن یہ دنیا جس طرح مٹ جائے گی اسے قرآن نے تفصیل سے اپنے خاص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کی آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے دنیا کے نظام میں جو ربط و تنظیم ہمیں نظر آتا ہے اور جسے ہم پکے اور اٹل قوانینِ قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ سب آناً فاناً غائب ہو جائے گا۔ ساری کائنات کی بساط دوبارہ بچھائی جائے گی، اسے ازسرِ نو ترتیب دیا جائے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۴:۴۸)

اس دن کو یاد رکھو جب یہ زمین بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔ اور سب

اللہ واحد وقہار کے حضور پیش ہونگے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دَاخِرِيْنَ ۰ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ

(٢٧:٨٧-٨٨)

اور اس دن کا خیال کرو جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب گھبرا اٹھیں گے۔صرف وہی اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ چاہے گا۔اور سب اس کے آگے سر فگندہ ہوکر حاضر ہوں گے۔

اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرو گے کہ وہ لٹکے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۰ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۰ وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۰ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۰ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۰ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۰ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۰ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۰ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۰ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۰ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۰ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۰ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۰ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (٨١:١-١٤)

اُس وقت، اے لوگو! جب سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی، اور جب تارے ماند پڑ جائیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، اور جب

دس ماہہ گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی، اور جب وحشی جانور (اپنی سب دشمنی بھول کر، ایک ہی جگہ) اکٹھے ہوجائیں گے، اور جب سمندر ابل پڑیں گے، اور اُس وقت جب (اُس عالم میں) روحوں کے جوڑ (اُن کے عمل کے لحاظ سے) بندھیں گے، اور جب اُس سے، جو زندہ گاڑ دی گئی، پوچھا جائیگا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی؟ اور جب دفتر کھولیں جائیں گے اور جب بہشت قریب لے آئی جائے گی، اُس وقت (اے لوگو تم میں سے) ہر شخص یہ جان لے گا کہ وہ کیا لے آیا ہے۔

قرآن مجید میں روزِ آخرت کا بیان بہت سی آیات میں آیا ہے۔ ان سب میں زور اس بات پر ہے کہ جب قیامت کی گھڑی آن لگے گی تو انسان اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گا جو اس لمحے اس کے روبرو ہوگی۔ یہ شعور کی بیداری کا لمحہ ہوگا۔ اسی لیے اب ان آیات میں آیاتِ خداوندی اور اللہ کی نشانیوں کا ذکر نہیں ہے کہ اس گھڑی میں ان نشانیوں کے معانی، ان کا مفہوم و انشگاف ہو رہا ہوگا۔ انسان جان لے گا کہ یہ فانی دنیا جس میں وہ زندگی گزار رہا تھا اس کی ہستی صرف اس لیے تھی کہ اسے باقی رہنے والی دنیا کے لیے تیاری کی مہلت مل جائے۔

## قیامت The Resurrection

جب حضرت اسرافیل ؑ دوسری بار صور پھونکیں گے، سب انسان اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے اور اس وسیع و عریض میدان میں جمع ہو جائیں جہاں ان کو اپنے رب کے سامنے پیش ہونا ہے۔

وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ • قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ

الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۶:۵۱-۵۲)

اورصور پھونکا جائے گا تو وہ دفعتاً قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چلیں پڑیں گے۔وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی ہم کو ہماری قبر سے کس نے اُٹھا کھڑا کیا۔ یہ تو وہی چیز جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں کی بات سچی نکلی۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّ

اس دن کا خیال کرو جس دن ہم پہاڑوں کو چلا

حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا (۱۸:۴۷-۴۸)

دیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ بالکل عریاں ہوگئی ہے اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔

یہ واقعہ قیامت کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، عربی میں ''قیامۃ'' کے لفظ کا مطلب ہے ''اٹھ جانا، کھڑے ہو جانا''۔ اسے دوسرے لفظوں میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ''حشر'' (The Mustering) اور ''بعث'' (The uprising) قیامت میں جو واقعات بھی ہوں گے ایک دن سے زیادہ نہیں ہوں گے لیکن بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ یہ دن ہمارے حساب سے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن ہی میں یوں بھی آیا ہے کہ:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۷۰:۴)

فرشتے اور روح الامین (تمہارے حساب سے) پچاس ہزار سال کے

برابر ایک دن میں اس کے حضور پہنچتے ہیں۔

قبر سے نکل کر خدا کے سامنے پیش ہونا بھی تو ایک بعثت ہے۔لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر خدا کے حضور پہنچیں گے ایسے ہی جیسے فرشتے آسمانوں میں بلند ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے ملنے کے لیے خود نیچے آئیں گے۔ یہ بالکل درست ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ انسان کی طرف بڑھے تو انسان کو بھی لازماً اس کی جانب بڑھنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ الحق ہے، العلی، الرفیع، المتعالی اور الرحمٰن ہے۔انسان کی جانب اس کے آنے کا مطلب ہے کہ وہ انسان کو اپنی ان بنیادی صفات کی طرف بلند کر رہا ہے۔

اگر یہ زمین قیامت کے دن دگرگوں ہو جائے گی، زمین زمین نہیں رہے گی کچھ اور ہو جائے گی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب نورِ خداوندی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ شدت سے اپنا ظہور کرے گا۔نور اترے گا تو ظلمت مٹ جائے گا۔اب کسی نشانی کی ضرورت نہیں کہ نورِ خداوندی نے وہ تمام دھندلاہٹیں، وہ رکاوٹیں مٹا ڈالی ہوں گی جن کے کارن انسان غفلت کا شکار ہوتا تھا اور اسے یاددہانی اور پیغامِ خداوندی کی ضرورت ہوتی تھی۔ہم ذکر کر چکے ہیں کہ زمین کے کچھ اوصاف ہیں جو اسے آسمان سے الگ کرتے ہیں۔آسمان روشن ہے اور زمین تاریک۔اب اگر نورِ خداوندی سے زمین روشن ہو جائے گی تو پھر یہ وہ زمین نہیں رہے گی جو انسان کا مسکن تھا۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ

وَجِاۤیْءَ بِالنَّبِیّنَ وَالشُّھَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْحَقِّ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ • وُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَھُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (۳۹:۶۸-۷۰)

اور صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو کے گر پڑیں گے، مگر جن کو اللہ چاہے۔ پھر وہ دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا تو دفعتہً وہ کھڑے ہو کر تاکنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ اور رجسٹر رکھا جائے گا اور انبیاء اور گواہ حاضر کیے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا اور ہر جان کو جو کچھ اس نے کیا ہو گا پورا کیا جائے گا اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

روشنی چمکتی ہے تو انسان کی نظر کام کرتی ہے۔ جب نورِ خداوندی کا اجالا ہو گا تو انسان اپنے آپ کو اس صفائی سے آر پار دیکھے گا کہ اس سے پہلے اپنے آپ پر یوں نظر کرنا کبھی ممکن ہی نہ تھا۔ اب نہ انسان خود سے چھپ سکے گا نہ دوسروں کی نگاہ سے۔

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ ذٰلِكَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ • وَجَآءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَھَا سَآئِقٌ وَّشَھِیْدٌ لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ ھٰذَا فَکَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ

(۵۰:۲۰-۲۲)

اور صور پھونکا جائے گا۔ وہ ہماری وعید کے ظہور کا دن ہو گا اور ہر جان اس طرح حاضر ہو گی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہو گا اور ایک گواہ۔ تو اس

سے غفلت میں پڑا رہا تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے۔

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ ''نور'' صفاتِ خداوندی میں سے ایک ہے اور ''اللہ کے نور کے سوا کوئی نور نہیں'' قرآن مجید نور ہے، اللہ کی کتابیں نور ہیں تو اس لیے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے خود کو ظاہر کیا ہے۔ ہر مخلوق کی اصلی فطرت اس کی سرشت و نہاد میں جتنا نور ہے اسے مل جاتا ہے۔ انسان کے حصے میں از روئے سرشت جتنا نور آیا ہے اس میں البتہ اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے جس قدر وہ ہدایتِ خداوندی سے میسر آنے والے نور کی پیروی کرتا رہتا ہے اور اس کی اطاعت کو اپنا شعار بناتا ہے۔ اسلام کی نظر میں قرآن مجید کی وحی کا نور دیگر ہر نور سے بڑھ کر ہے۔ پس اگر نورانی بننا ہے تو اس کا سب سے سیدھا راستہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ قرآن مجید نے سیدنا محمدؐ کو ''سراج منیر'' (روشنی دینے والا چراغ) کہا ہے تو اس لیے کہ ''کان خلقہ القرآن''۔

قرآن مجید آپؐ کا جسم و جان بن چکا تھا، آپ کے لہو میں اتر چکا تھا۔ احادیث میں مندرجہ ذیل دعا نقل ہوئی ہے جو آپ نماز میں دہراتے تھے یا سجدہ کرتے ہوئے ضرور ادا فرماتے تھے۔[۱۱]

اَللّٰھُمَّ! اجْعَلْ فِی قَلْبِی نُوراً، وَفِی سَمْعِی نُوراً، وَفِی بَصَرِی نُوراً، وَعَنْ یَمِینِی نُوراً، وَعَنْ شِمَالِی نُوراً، وَأَمَامِی نُوراً، وَخَلْفِی نُوراً، وَفَوْقِی نُوراً، وَتَحْتِی نُوراً، وَاجْعَلْ لِی نُوراً، أَوْ قَالَ: وَاجْعَلْنِی نُوراً

خداوندا! میرے دل میں ایک نور ڈال دے، میری سماعت میں بھی، میری

بینائی کو نور دے دے۔ میرے دائیں ہاتھ کو ایک نور دے دے۔ ایک نور میرے سامنے، ایک نور میرے پیچھے۔ ایک نور میرے اوپر اور ایک نور میرے تلے اور میرے لیے ایک نور مقرر کر دیجیے۔

اس حدیث کے آخری حصے کے الفاظ دوسری طرح بھی نقل ہوئے ہیں اور باعث تعجب نہیں ہے کہ ان میں یوں کہا گیا ہے کہ "وَاجۡعَلۡنِیۡ نُوۡرًا" (مجھے ایک نور بنا دے) نبی علیہ السلام کی ایک اور دُعا میں یوں آیا ہے "اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الۡاَشۡیَاءَ کَمَا ھِیَ (خدایا چیزیں جیسی ہیں ہمیں ویسی ہی دکھائیں [۶۲] دیکھنے کے لیے روشنی ضروری ہے تبھی کچھ سجھائی دے گا۔ اسی طرح فہم و ادراک کے لیے، سمجھنے کے لیے بھی نورِ روحانی کی ضرورت ہے جو قرآن مجید اور اللہ تعالی کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ امام غزالی نے اس بات کو یوں کہا ہے کہ جیسے سورج کی روشنی سے چشمِ انسانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے اسی طرح قرآن مجید (کی روشنی سے) عقلِ انسانی کو راستہ سجھائی دیتا ہے۔

ان سب نکات سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ روزِ قیامت نورِ خداوندی کے چمکنے کی اہمیت کیا ہے؟ اس نور کی روشنی میں سب پردے اٹھ جائیں گے، پرچھائیاں چھٹ جائیں گی اور انسان ہر شے کو اس کی حقیقت میں دیکھے گا۔ اس کی نگاہ اگر اس دنیا میں غلط بینی کی عادی ہو گی، شے کی حقیقت کو دیکھنے سے محروم رہی ہو گی تو اگلے جہاں کی چکاچوند اور تابانی میں اس کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اگر ان کی چشمِ باطن نے وحی کی روشنی میں دیکھنا نہ سیکھا ہو گا اور اس سے ان کی بصارت کو تقویت نہ ملی ہو گی تو وہ قیامت کے دن بے بصر اٹھے گا، اس کچھ سجھائی نہ دے گا۔ ایسے انسانوں کی حالت بالکل ایسی ہی ہو گی جیسی اس شخص کی ہوتی ہے جو برسوں کسی

تاریک غار میں رہا ہو اور اسے اچانک بھری دوپہر میں سورج کی روشنی میں لا کھڑا کیا جائے:

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى

(۲۰:۱۲۵-۱۲۶)

وہ کہے گا: اے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اُٹھایا، میں تو بینا تھا۔ ارشاد ہوگا: اسی طرح دنیا میں ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو نظر انداز کیا۔ تو اسی طرح آج تو بھی نظر انداز کیا جائے گا۔

هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (۱۳:۱٦)

ان سے پوچھو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یا کیا روشنی اور تاریکی دونوں برابر ہو جائیں گے۔

هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (٦:٥٠)

کہہ دو: کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے، کیا تم غور نہیں کرتے؟

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ (٤٠:٥٨)

اور اندھے اور بینا اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور جو برائی کرنے والے ہیں دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ تم لوگ بہت کم سوچتے ہو۔

جن کی آنکھیں اس کی تاب لائیں گی ان کے لیے قیامت کے دن اس روشنی کی چمک ایک رحمت ہو گی وہ اپنے رب کے روبرو پہنچ کر خوش ہوں گے۔ لیکن منکرینِ حق نے تو اپنی ساری زندگی روشنیاں بجھانے میں گنوا دی تھی۔ اب وہ چمگادڑوں کی طرح روشنی سے منہ چھپاتے پھریں گے اور چھپنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۚ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۚ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ

(۲۴:۳۹-۴۰)

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی گمان کرے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا۔ البتہ اس کے پاس اللہ کو پائے گا، پس وہ اس کا حساب چکا دے گا اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے یا یوں خیال کرو کہ جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں ہوں، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں، تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہوں۔ اگر اپنا ہاتھ بھی نکالے تو اس کو بھی نہ دیکھ پائے۔ اور جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے بالکل کھلے واضح انداز میں بتا دیا ہے کہ انسان کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔علماء نے اس نکتے پر اکثر بحث کی ہے کہ انسان جب اپنے رب کے روبرو ہو گا تو کیا وہ اللہ کو دیکھے گا۔ان میں سے اکثریت کی رائے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا۔اس رائے کی تائید میں انہوں نے قرآنی آیات اور احادیث پیش کی ہیں۔عمومی رائے یہ ہے کہ دیدارِ خداوندی وہ نعمت ہے کہ اس سے بڑی اور کوئی نعمت اور انعام ہو نہیں سکتا اور جو بھی جنت میں جائے گا اسے یہ نعمت نصیب ہوگی۔جو لوگ دوزخ میں رہ جائیں گے وہ اس رویت سے محروم رہ جائیں گے اور اس کا مطلب ہوگا بدترین عذاب کا جھیلنا۔

دیدارِ خداوندی کے تصور کو سمجھنا ہو تو ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' کی مدد سے سمجھیے۔ اللہ کی صفاتِ قہر اور صفاتِ جلال کا تقاضا ہے اللہ سے بُعد اور اس کے غضب کا سامنا کرنا جبکہ اس کی صفاتِ جمال اور صفاتِ رحمت قربِ خداوندی اور انسان کی سعادت و مسرت کا باعث بنتی ہیں۔دیدارِ خداوندی نہ ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ سے دوری اور اس کے قہر کی آگ میں جلتے رہنا۔اس کا دیدار نصیب ہونے کا مطلب ہے اس کے قریب ہونا اور اس کے جمال و رحمت کی خنک روشنی سے بہرہ یاب ہونا۔مندرجہ ذیل آیات کا حوالہ عموماً اس فرق کو بیان کرنے کے لیے دیا جاتا ہے جو اللہ کا دیدار کرنے والوں اور اسے دیکھنے سے محروم رہنے والوں میں واقع ہوتا ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۔ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۔ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (۷۵:۲۲-۲۵)

کتنے چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی رحمت کے

منتظر اور کتنے چہرے، اس دن اترے ہوئے ہوں گے، اس اندیشے سے
کہ ان پر وہ ٹوٹنے والی ہے جو کمر توڑ ڈالے گی۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۔ ثُمَّ اِنَّهُمْ
لَصَالُوا الْجَحِيْمِ (٨٣: ١٥-١٦)

ہرگز نہیں، اس دن تو لاریب، یہ اپنے پروردگار سے روک دیے جائیں
گے۔ پھر جہنم میں جا پڑیں گے۔

دیدارِ خداوندی سے محروم ہونے کا مطلب ہے روشنی سے دور اور ظلمت میں گم۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ
مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ
قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ (١٠: ٢٧)

اور جنہوں نے بدیاں کمائی ہوں گے تو برائی کا بدلہ اس کے مثل ہے اور ان
پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ اللہ سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا ان
کے چہرے شب دیجور کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ یہی لوگ
اہل دوزخ ہیں، یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

قرآن مجید نے اور بھی کئی واقعات بیان کیے ہیں جو قیامت کے دن پیش آئیں گے۔ احادیث میں بھی اس کی تفصیل ملتی ہے۔ ان واقعات میں اعمال کا ترازو میں وزن کرنا بھی مذکور ہے۔ ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ اعمال کو درج کرنے والے فرشتے زندگی میں انسان کے کیے ہوئے عمل لکھتے رہتے ہیں۔ روزِ قیامت یہ فرشتے اپنے لکھے ہوئے کو میزان میں رکھ دیں گے اور امید ہے کہ نیک کام برے

کاموں پر بھاری رہیں گے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (٢١:٤٧)

اور قیامت کے دن ہم میزان عدل قائم کریں گے تو کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کا رائی کے دانہ برابر بھی کوئی عمل ہوگا اور ہم اس کو موجود کردیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ • فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ • وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (٩٩:٦-٨)

اُس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے، اِس لیے کہ اعمال انہیں دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرّہ برابر بھلائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی ہے، وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔

انسان کو قیامت میں ایک اور آزمائش میں سے گزرنا ہوگا یعنی 'صراط' پر سے گزرنا۔ قرآن مجید میں اسلام کو 'صراطِ مستقیم'' (سیدھا راستہ) کہا گیا ہے اور مسلمان جب فاتحہ پڑھتے ہیں تو اسی سیدھے راستے پر چلنے کی دعا مانگتے ہیں۔ قیامت میں یہی 'صراطِ مستقیم' ایک پُل کی صورت میں مجسم ہو جائے گا جو جہنم کے اوپر سے گزر رہا ہوگا۔ یہ پل بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا۔ لوگوں سے کہا جائے گا کہ اسے عبور کریں۔ کچھ لوگ اس پر سے اڑ کر گزر جائیں گے، کچھ چوکڑی بھرتے ہوئے گھوڑے کی طرح پار کرلیں گے لیکن بہت سے ایسے ہوں

جو پہلے قدم پر پھسل کر اپنی تباہی کے گڑھے میں جا گریں گے۔ اس 'صراط' کا سامنا قیامت میں کس طرح ہو گا اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ نے اس دنیا میں صراطِ مستقیم پر کس انداز میں سفر کیا تھا اور کس حد تک سیدھے راستے پر چلے تھے۔

قرآن و حدیث سے قیامت کا جو عمومی منظر نامہ سامنے آتا ہے اس کا تاثر یہ بنتا ہے کہ اس دن انسان کو ہیبت طاری کرنے والے جلالِ خداوندی کا پورا تجربہ ہو گا۔ روزِ قیامت کا بیان جہاں جہاں آیا ہے اس میں اکثر اللہ کے جلال، اس کی قدرت اور ہر معاملے میں اس کی فرمانروائی اور غلبے پر زور دیا گیا ہے اور ساتھ ہی انسان کے ہیچ اور ناچیز ہونے کا احساس بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ یہ صورتحال دنیا کی صورتحال سے بالکل برعکس ہو گی جہاں انسان کو یہ زعم تھا کہ وہ اپنی زندگی کا خود مالک ہے اور اپنے احوالِ زیست کی صورت گری کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (٣٩:٦٧)

اور ان لوگوں نے خدا کی صحیح قدر نہیں جانی! زمین ساری اس کی مٹھی میں ہو گی قیامت کے دن اور آسمانوں کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی ہو گی! وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں۔

ایک حدیث میں اس تمثیل کو کھول کر یوں بیان کیا گیا ہے:[۶۳]

يَطْوِي اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ السَّمَاوَاتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ثُمَّ يَأْخُذُهُنَّ بِيَدِهِ الْيُمْنَى، ثُمَّ يَقُولُ: أَنَا الْمَلِكُ، أَيْنَ

الْجَبَّارُوْنَ؟ أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟ ثُمَّ يَطْوِى الْاَرْضَ بِشِمَالِهٖ، ثُمَّ يَقُوْلُ: أَنَا الْمَلِكُ، أَيْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟ أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟

قیامت کے دن آسمان لپیٹ دیے جائیں گے۔ پھر یہ اللہ کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں ہوں مالک الملک، بادشاہ۔ کہاں ہیں وہ جو ستم ڈھاتے تھے؟ کہاں ہیں وہ جن کو بڑائی کے دعوے تھے؟ پھر وہ زمین کو لپیٹ دیں گے۔ یہ ان کے بائیں ہاتھ میں ہوں گی۔ پھر کہا جائے گا: میں ہوں مالک الملک، بادشاہ کہاں ہیں وہ جو ستم ڈھاتے تھے؟ کہاں ہیں وہ جن کو بڑائی کے دعوے تھے؟

روزِ حشر لوگوں کو ''برہنہ تن'' جمع کیا جائے گا۔ قدرت و اقتدار کی ہر پوشاک سے محروم، ہر قیمتی ملبوس اور مال و دولت دنیا سے تہی، ہر اس شے سے عاری جو دنیا میں ان کے لیے متاعِ غرور اور سرمایۂ افتخار ہوا کرتی تھی۔ رسولِ خدا ؐ کے فرمان کے مطابق سب سے پہلے جس شخص کو نیا لباس عطا ہوگا وہ حضرت ابراہیم ؑ ہوں گے۔ حضرت ابراہیم ؑ یہودیت، نصرانیت اور اسلام سبھی کے محترم اور بزرگ ہیں اور قرآن مجید نے انہیں کامل مسلمان کا لقب دیا ہے۔ رسول خدا ؐ نے فرمایا:[۲۴]

يَاَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ اِلَى اللّٰهِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا

اے لوگو! تم اپنے رب کے روبرو ننگے پاؤں، عریاں، مختون اٹھائے جاؤ گے۔ ''جیسا ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا اسی طرح اسے لوٹائیں گے'' (۲۱:۱۰۴) روزِ قیامت جسے سب سے پہلے لباس ملے گا حضرت

ابراہیمؑ ہوں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انسانوں کی جزا وسزا کا فیصلہ کرے گا۔ بہت سی احادیث میں یوں آیا ہے کہ لوگوں کی اکثریت جہنم واصل ہو جائے گی تاہم یہاں بھی عقائد کی اہم تفاصیل کی طرح خاصا ابہام باقی رہتا ہے کیونکہ دیگر احادیث اور قرآنی آیات میں اللہ کے غضب کی جگہ اس کی رحمت پر زور دیا گیا ہے۔

اللہ کی رحمت کا مظاہرہ شفاعت کے مسئلے میں جس طرح کھل کر ہوتا ہے اور کسی مسئلے میں نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔ (۲:۲۲۵) رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کے دن ''مقامِ محمود'' عطا کرے گا (۱۷:۷۹) اور اس مقامِ عالی ۶۵ کی نشانی یہ ہوگی کہ انہیں سب سے پہلے شفاعت کی اجازت ملے گی۔ جب آپؐ اپنی امت کی شفاعت فرما چکیں گے تو دیگر انبیاء کو اپنی اپنی امت کی شفاعت کا اذن ہو گا۔ اس کے بعد اولیاء اللہ اور اہلِ ایمان شفاعت کریں گے۔ جیسا جیسا کسی کا مقام ہوگا اسی قدر اس کی شفاعت مقبول ہوگی۔ ایک حدیث میں رسول خدا نے فرمایا: ۶۶

فرشتے شفاعت کریں گے، انبیاء شفاعت کریں گے، مومنین شفاعت کریں گے اور خدا الرحم الرحمین کے سوا کوئی باقی نہ بچے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ خود نارِ جہنم میں سے مٹھی بھر لوگ نکال لے گا اور ان لوگوں کو بھی نجات دیدے گا جنہوں نے عمر بھر کوئی اچھا کام نہ کیا تھا۔

بعض روایات میں اس طرح آیا ہے کہ دوزخ کا کام ہے تطہیر کرنا، پاک کرنا اور آلائش دور کرنا ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ''توحید'' کا اقرار تو کیا مگر بڑے

بڑے گناہوں میں مبتلا رہے۔ احادیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک ایک کر کے گناہگاروں کو دوزخ سے نکالا جائے گا۔ نارِ جہنم نے انہیں دہکتے کوئلے کی طرح کر رکھا ہوگا۔ انہیں "آبِ حیات" میں ڈبو دیا جائے گا۔ اس میں ڈوبتے ہی "وہ اس طرح پھوٹ نکلیں گے جیسے سیلاب کے ساتھ بہ کر آنے والے بیج سے اکھوا پھوٹتا ہے"۔۶۷

جو لوگ جہنم میں ہیں انہیں بھی ناامید نہ ہونا چاہیے بلکہ اور بلند آواز میں فریاد کرنا چاہیے۔ رسول خدا نے فرمایا: ۶۸

إِنَّ رَجُلَيْنِ مِمَّنْ دَخَلاَ النَّارَ اشْتَدَّ صِيَاحُهُمَا فَقَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَخْرِجُوهُمَا، فَلَمَّا أُخْرِجَا، قَالَ لَهُمَا: لِأَيِّ شَيْءٍ اشْتَدَّ صِيَاحُكُمَا؟ قَالاَ: فَعَلْنَا ذَلِكَ لِتَرْحَمَنَا، قَالَ: رَحْمَتِي لَكُمَا أَنْ تَنْطَلِقَا فَتُلْقِيَ أَنْفُسَكُمَا حَيْثُ كُنْتُمَا مِنَ النَّارِ، فَيَنْطَلِقَانِ، فَيُلْقِي أَحَدُهُمَا نَفْسَهُ فَيَجْعَلُهَا عَلَيْهِ بَرْدًا وَسَلاَمًا، وَيَقُومُ الآخَرُ فَلاَ يُلْقِي نَفْسَهُ، فَيَقُولُ لَهُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: مَا مَنَعَكَ أَنْ تُلْقِيَ نَفْسَكَ كَمَا أَلْقَى صَاحِبُكَ؟ فَيَقُولُ رَبِّ! إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ لاَ تُعِيدَنِي فِيهَا بَعْدَمَا أَخْرَجْتَنِي، فَيَقُولُ لَهُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: لَكَ رَجَاؤُكَ فَيَدْخُلاَنِ الْجَنَّةَ جَمِيعًا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ

جہنم میں جانے والوں میں سے دو شخص زیادہ بلند آواز میں آہ و فریاد کر رہے ہوں

گے۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ ان کو باہر نکال لاؤ۔ ان سے پوچھا جائے گا ''تم دوسروں سے بڑھ کر فریاد کیوں کر رہے تھے''؟ وہ کہیں گے، ''اس لیے کہ آپ کو ہم پر رحم آ جائے''۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''میری رحمت تمہارے لیے یہ ہے کہ تم جاؤ اور خود کو جہنم میں وہیں گرا دو جہاں تم تھے''۔ ان میں سے ایک اپنے آپ کو وہیں لے جا کر گرا دے گا اور اللہ تعالیٰ آگ کو ''خنکی و سلامتی'' (۲۱:۶۹) کر دیں گے۔ دوسرا شخص اٹھ کھڑا ہو گا مگر اپنے آپ کو آگ میں نہیں ڈالے گا۔ پوچھا جائے گا کہ ''تو نے اپنے ساتھی کی طرح خود کو آگ میں کیوں نہیں ڈالا''؟ کہے گا کہ ''مجھے امید تھی کہ ایک مرتبہ آگ میں سے نکال کر آپ پھر مجھے جہنم میں نہیں پھینکیں گے''۔ اس سے فرمایا جائے گا ''تو نے ہم سے جس بات کی امید رکھی وہ تیرے حصے میں آئی''۔ پھر ہر دو نفر رحمتِ خداوندی سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

رحمتِ خداوندی کو اکثر اللہ تعالیٰ کی حسِ مزاح سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کی مایوسی اور بے چارگی دیکھ کر خندہ فرماتے ہیں جس کا وقت بدلنے والا ہو اور وہ اس سے بے خبر ہو''

۷۹

یعنی یہ کہ اس کی صورتحال بس تبدیل ہونے والی ہے اور اس کی مایوسی خوشی میں بدل جائے گی۔ آنحضرتؐ سے سن کر صحابہ میں سے ایک صاحب نے پوچھا ''یا رسول اللہ، کیا اللہ تعالیٰ کو کبھی ہنسی آتی ہے؟'' آپؐ نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ خندہ فرماتے ہیں۔ اس پر صحابی نے کہا ''وہ خدا جو ہنستا بھی ہو اس سے ہر چیز کی امید رہنا چاہیے''۔

کئی احادیث میں اس شخص کا ذکر ہے جسے سب سے آخر میں جہنم سے نکالا

جائے گا۔ے

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اسے جہنم سے نکال کر جنت کے باہر جہنم کے رخ پر ڈال دیا جائے گا:

أَیْ رَبِّ! اصْرِفْ وَجْهِی عَنِ النَّارِ، فَإِنَّهُ قَدْ قَشَبَنِی
رِیحُهَا وَأَحْرَقَنِی ذَكَاؤُهَا، فَیَدْعُو اللّٰهَ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ
یَدْعُوَهُ، ثُمَّ یَقُولُ لله تَبَارَكَ وَ تَعَالَی: هَلْ عَسَیْتَ إِنْ
فَعَلْتُ ذَلِكَ بِكَ أَنْ تَسْأَلَ غَیْرَهُ! فَیَقُولُ: لَا أَسْأَلُكَ
غَیْرَهُ، وَیُعْطِی رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ عُهُودٍ وَمَوَاثِقَ مَا شَاءَ
اللّٰهُ، فَیَصْرِفُ اللّٰهُ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ، فَإِذَا أَقْبَلَ عَلَی
الْجَنَّةِ وَرَآهَا سَكَتَ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ یَسْكُتَ، ثُمَّ یَقُولُ:
أَیْ رَبِّ! قَدِّمْنِی إِلَی بَابِ الْجَنَّةِ فَیَقُولُ اللّٰهُ لَهُ: أَلَیْسَ قَدْ
أَعْطَیْتَ عُهُودَكَ وَمَوَاثِیقَكَ لَا تَسْأَلَنِی غَیْرَ الَّذِی
أَعْطَیْتُكَ، وَیْلَكَ یَا ابْنَ آدَمَ أَغْدَرَكَ! فَیَقُولُ: أَیْ رَبِّ!
-یَدْعُو اللّٰهَ - حَتَّی یَقُولَ لَهُ: فَهَلْ عَسَیْتَ إِنْ أَعْطَیْتُكَ
ذَلِكَ أَنْ تَسْأَلَ غَیْرَهُ! فَیَقُولُ لَا، وَعِزَّتِكَ فَیُعْطِی رَبَّهُ مَا
شَاءَ اللّٰهُ مِنْ عُهُودٍ وَمَوَاثِیقَ، فَیُقَدِّمُهُ إِلَی بَابِ الْجَنَّةِ،
فَإِذَا قَامَ عَلَی بَابِ الْجَنَّةِ انْفَهَقَتْ لَهُ الْجَنَّةُ، فَرَأَی مَا
فِیهَا مِنَ الْخَیْرِ وَالسُّرُورِ، فَیَسْكُتُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ

يَسْكُتَ، ثُمَّ يَقُولُ : أَيْ رَبِّ أَدْخِلْنِي الْجَنَّةَ، فَيَقُولُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى لَهُ : أَلَيْسَ قَدْ أَعْطَيْتَ عُهُودَكَ وَمَوَاثِيقَكَ أَنْ لَا تَسْأَلَ غَيْرَ مَا أُعْطِيتَ، وَيْلَكَ ابْنَ آدَمَ أَغْدَرَكَ! فَيَقُولُ: أَيْ رَبِّ! لَأَكُونَنَّ أَشْقَى خَلْقِكَ، فَلَا يَزَالُ يَدْعُو اللّٰهَ حَتَّى يَضْحَكَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْهُ، فَإِذَا ضَحِكَ اللّٰهُ مِنْهُ قَالَ : ادْخُلِ الْجَنَّةَ، فَإِذَا دَخَلَهَا قَالَ اللّٰهُ لَهُ تَمَنَّهْ، فَيَسْأَلُ رَبَّهُ وَيَتَمَنَّى، حَتَّى إِنَّ اللّٰهَ لَيُذَكِّرُهُ مِنْ كَذَا وَكَذَا، حَتَّى إِذَا انْقَطَعَتْ بِهِ الْأَمَانِيُّ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى : ذٰلِكَ لَكَ وَمِثْلُهُ مَعَهُ

وہ کہے گا: پروردگار میرا منہ جہنم کے رخ سے ہٹا دیجئے۔ اس کی بدبو مجھے اذیت دے رہی ہے اور اس کی آگ مجھے جھلسا دیتی ہے۔ کہا جائے گا ”اگر میں یہ کروں تو تم پھر کچھ اور مانگنے لگو گے“۔ وہ کہے گا ”آپ کی عزت کی قسم ایسا نہ ہوگا“۔ وہ اللہ سے عہد و پیمان کرے گا جیسا اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔ پھر اسے جہنم کے رخ سے ہٹا دیا جائے گا۔ جیسے ہی اس کا رخ جنت کی طرف کیا جائے گا اور وہ اس کی رونق، خیر و سرور دیکھے گا تو وہ اتنی ہی دیر چپکا رہ سکے گا جتنا اللہ کی مرضی ہوگی۔ پھر وہ بول اٹھے گا، ”پروردگار! مجھے جنت کے دروازے کے قریب کر دیجیے“۔ کہا جائے گا کہ ”کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ تو اس خواہش کے سوا اور کچھ نہیں مانگے گا؟“ وہ کہے گا ”اے میرے رب مجھے اپنی بد بخت ترین مخلوقات میں سے نہ بنا۔

آخر کار اللہ تعالیٰ اس کی درخواست قبول کر لیں گے لیکن اس سے پھر وعدہ لیں

گے کہ وہ اور کسی چیز کا تقاضا نہیں کرے گا۔ ہوتے ہوتے وہ شخص التجا کرے گا کہ اسے جنت میں بھیج دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اسے ڈانٹیں گے کہ تم وعدہ خلاف اور دھوکے باز ہو۔ لیکن وہ شخص چپکا رہے گا، مانگتا رہے گا۔

وہ اتنا واویلا کرے گا، ایسے مانگتا رہے گا کہ آخر کار اللہ تعالیٰ اسے دیکھ کر ہنس پڑیں گے۔ جب وہ خندہ فرمائیں گے تو اسے جنت میں جانے کی اجازت مل جائے گی۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ اپنی خواہش بیان کر۔ پھر جب وہ ساری آرزوئیں بیان کر چکے گا تو ارشاد ہو گا ''جا یہ سب تجھ کو دیا اور اتنا ہی اور بھی تیرا ہوا۔

## جنت اور دوزخ Hell and Paradise

شاید ہی کسی صحیفۂ خداوندی میں عذابِ جہنم اور جنت کی خوشیوں کو اس تفصیل سے بیان کیا گیا ہو جیسا قرآن میں کیا گیا ہے۔ جنت جہنم کے بارے میں قرآن کے آخر میں واقع چھوٹی سورتوں میں جس شان اور زور بیان سے بتایا گیا ہے وہ دوسرے مقامات پر نہیں پایا جاتا۔ یہ سورتیں رسولِ خداؐ کی نبوت کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھیں۔ ان سورتوں کو پڑھ کر اگر یہ تصور کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان لوگوں کے لیے ان سورتوں کی کیا اہمیت رہی ہو گی جو انسانی زندگی کی حتمی معنویت کے سختی سے قائل تھے تو یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ قرآن کے وعدو وعید، اس کی بشارتیں اور اس کی تنبیہ کوئی چیز بھی نری مجرد اور ذہنی نہیں ہے۔ قرآن نے جنت جہنم کے احوال کا جس طرح سے بیان کیا ہے اس سے انسان کی ذمہ داری اور اس کے عمل کے نتائج کا ایک نہایت موثر اور زوردار نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

جہنم کو قرآن مجید میں کئی ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر نام ذہن

میں وہ کچھ لے آتا ہے جس کا اہل جہنم کو اس میں پڑنے کے بعد سامنا کرنا ہوگا۔ان ناموں میں ''نار'' (آگ) ''ھاویہ''، ''جحیم'' ''جہنم'' (یہ عبرانی کا لفظ ہے اور وہاں بھی اس کا مطلب ہے دوزخ کی آگ) ''حطمۃ'' Crusher اور ''عذاب الیم'' chastisement عام طور پر قرآن مجید دوزخ کے بیان کے مقابل جنت کی نعمتوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔اس کے لیے جو لفظ قرآن میں آئے ہیں وہ ہیں ''الجنۃ'' (باغ) ''سلام'' Peace ''مأوی'' refuge ''نعیم'' bliss ''دارالخلد'' eternity.

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ(۴۷:۱۲)

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہ رہی ہوں گے۔اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ اسی طرح بہرہ مند ہو رہے اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں،اور دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ(۱۳:۳۵)

اس جنت کی تمثیل،جس کا متقیوں سے وعدہ ہے،یہ ہے کہ اس میں نہریں بہ رہی ہوں گی،اس کا پھل بھی دائمی اور اس کا سایہ بھی (دائمی)۔یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔اور کافروں کا انجام دوزخ

ہے۔

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۔ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۔ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۔ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۔ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۔ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۲: ۱۱-۱۹)

(اس دن کو یاد رکھو) جس دن آسمان ڈانواں ڈول ہو جائے گا اور پہاڑ چلنے لگ جائیں گے، پس بدبختی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ان کی جو سخن گستری میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں جس دن کہ وہ آتش دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لے جائیں گے کہ یہ وہ دوخ جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے! کیا یہ جادو ہے یا تمہیں سجھائی نہیں دے رہا ہے؟ اس میں داخل ہو جاؤ! اب صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے یکساں ہے! تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو کرتے رہے تھے! بے شک متقی بندے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے وہ محظوظ ہو رہے ہوں گے ان نعمتوں سے جو ان کے رب نے ان کو دے رکھی ہوں گی اور اس بات سے کہ ان کے رب نے ان کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا، کھاؤ اور پیو، بے غل وغش، اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے تھے۔

ان الفاظ میں سے ''جنت'' کا لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن

کے اکثر ترجموں میں اس کے لیے Paradise کا لفظ برتا گیا ہے۔انگریزی کا لفظ Paradise بھی تو ایک قدیم فارسی لفظ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے ''باغ''۔ایے قرآن کی کسی بھی اصطلاح پر غور کرنا ہو،اس سے متعلق تصورات پر نظر کرنا ضروری ٹھہرتا ہے تا کہ اس کے مفہوم و منطق کو سمجھا جا سکے۔انگریزی بولنے والوں کی گفتگو میں بھی اگر کسی بہت ہی خوبصورت باغ کا ذکر آ جائے تو عموماً یوں کہا جاتا ہے ''یہ تو نری جنت ہے''۔جنت بالآخر خوشی اور راحت کی جگہ ہی تو ہے۔وہ شخص بہت ہی درماندہ ہوگا،بہت ہی بے حس اور شل ہو چکا ہوگا جو رنگ برنگ خوبصورت پھولوں سے بھرے پُرے باغ کو دیکھ کر جھوم نہ اٹھے جب باغ میں پرندے چہچہا رہے ہوں،فوارے اچھل رہے ہوں،تتلیاں اڑتی پھرتی ہوں اور پھلوں سے لدی درختوں کی شاخیں جھکی پڑ رہی ہوں۔بہار کے موسم میں باغ میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔یہ وقت ایسا ہے جب غم و اندوہ دب جاتا ہے اور زمین اپنی آغوش آسمان کے لیے وا کر دیتی ہے۔

باغ کیا ہوتا ہے اور اس میں آخر انسانوں کے لیے کیا کشش ہوتی ہے،اس کی حکایت تا دیر کی جا سکتی ہے۔بہار کی رعنائی اور حسن کے بیان کے لیے شاعر کا قلم چاہیے اور اسلامی زبانوں کی شاعری،بالخصوص فارسی شاعری نے گلستان،باغ اور بہار کا جیسا شاعرانہ بیان پیدا کیا ہے وہ عالمی ادب کے شاہکار شعر پاروں میں شمار ہو سکتا ہے۔

کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ ان شعراء میں سے بہت سے شاعر اس دنیا کے باغوں کی بات کر رہے تھے،اگلے جہان کے باغوں کی نہیں۔لیکن ہماری اب تک کی تحریر کی روشنی میں قارئین پر واضح ہو چکا ہوگا کہ مسلمان کی نظر میں حسن و جمال اللہ کی

صفات میں سے ہے۔ رسول خداؐ نے فرمایا تھا ''اللہ جمیل یحب الجمال'' (اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور زیبائی کو پسند کرتا ہے) ۲؎ پہلے کلمۂ شہادت سے یہ نکتہ قدرتی طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے یعنی ''لا جمیل الا اللہ'' (اللہ کے سوا اور کوئی جمیل نہیں)۔ خاک سے اٹھی ہوئی چیزوں کو حسن و جمال مستعار ملتا ہے اور یہ متاع مستعار مالکِ جمال کو جلد ہی لوٹا دینا ہوتی ہے۔ ورنہ پھول اتنی تیزی سے مرجھایا نہ کرتے۔ شعراء نے ان باغوں ہی کا قصیدہ کیوں نہ لکھا ہو جو ظاہر کی آنکھ سے نظر آتے ہیں، ان کی شاعری کے پڑھنے والوں پر کوئی روک نہیں تھی کہ وہ باغ کے بارے میں لکھے گئے اشعار کو جنت کی خوبصورتی اور رعنائی کی نشانی کے طور پر نہ دیکھیں۔ اس کی گنجائش اس لیے بھی پوری طرح موجود رہتی ہے کہ بعض شعراء نے شعر کہتے ہوئے اس ضمن میں کسی طرح کا شک و شبہ رہنے ہی نہیں دیا۔ ان کے شعر خود بولتے ہیں کہ اس دنیا کے باغات کو یہ حسن اور رعنائی کہاں سے ملتی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا روم کو سنیے ۳؎

ای نوبهار خندان از لامکان رسیدی
چیزی به یار مانی، از یار ما چه دیدی
خندان و تازه رویی، سر سبز و مشك بویی
همرنگ یار مایی یا رنگ ازو خریدی
ای فضل خوش چو جانی، وز دیده ها نهانی
اندر اثر پدیدی، در ذات ناپدیدی
ای گل چرا نخندی، کز هجر باز رستی
ای ابر چون نگریی، کز یار خود بریدی ای
گل چمن بیارا، می خند آشکارا
زیرا سه ماه پنهان، در خار می دویدی
ای باغ خوش بیرور، این نو رسیدگان را
کاحوال آمد نشان از رعد می شنیدی
ای باد شاخها را در رقص اندر آور

بر یاد آن که روزی بر وصل می وزیدی
بنگر بدین درختان، چون جمع نیك بختان
شادند ای بنفشه، از غم چرا غمیدی
سوسن به غنچه گوید، هر چند بسته چشمی
چشمت گشاده گردد، کز بخت در مزیدی

ترجمہ:

اے کھلکھلاتی نوبہار! تو لامکاں سے اُتری ہے۔

تجھ میں ہمارے دوست کا رنگ پایا جاتا ہے، بتا تو ہی تو نے اُس میں کیا دیکھا؟

ہنستی کھلکھلاتی اور شاداب چہرے والی ہر سبزا ور مشک کی مہک میں لبی ہوئی۔

تو ہمارے دوست کی ہم رنگ ہے یا یہ رنگ اُس سے مول لیا ہے؟

اے دل کو نہال کر دینے والے موسم! تو روح کی طرح ہے اور آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

اپنی نشانیوں میں نمودار اور اپنی ذات میں مخفی۔

اے گلِ سرخ! بھلا تو کیوں نہ کھلکھلائے! آخر جدائی سے نجات پائی ہے۔

اے ابر! تو کیوں نہ آنسو برسائے، آخر اپنے دوست سے منقطع ہونا پڑا ہے۔

اے گل! چمن سجادے، کھل کر خندہ کر۔

کیونکہ تجھے تین ماہ تک کانٹوں میں چھپ کر تگ و دو کرنی پڑی۔

اے باغ! اِن نوواردوں کو خوب اچھی طرح پال پوس

جن کی آمد کا احوال تو نے بادلوں کی گرج سے سن رکھا تھا۔

اے ہوا: شاخوں کو رقص میں لے آ

اُس دن کی یاد میں جب تو باغِ وصال میں اٹھکیلیاں کیا کرتی تھی۔

ان درختوں کو دیکھ، جیسے طالع مندوں کا کوئی مجمع ہو۔

سب خوش ہیں، اے بنفشہ! تو کیوں سر یہوڑائے پڑا ہے؟

سوسن، غنچے سے کہتا ہے: ہرچند کے تیری آنکھ بند ہے۔

تاہم یہ بس کھلنے کو ہے کیونکہ تو نے خوش بختی کا مزہ چکھ لیا ہے۔

قرآن مجید میں جنت کا ذکر جہاں آیا ہے وہاں عموماً جنت کی نہروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ”جَنّٰتٍ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰر“ کے الفاظ تقریباً ۳۵ آیات میں آئے ہیں۔ کسی بھی باغ میں بہتا پانی اس کے حسن اور تازگی کو چار چاند لگا دیتا ہے لیکن قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ جنت کی یہ ”نہریں“ کوئی عام چیز نہیں ہیں:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِیْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ
وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ
لِّلشّٰرِبِیْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ
الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ
وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (۴۷:۱۵)

اس جنت کی مثال جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس میں نہریں ہوں گی پانی کی جس میں ذرا بھی تغیر نہ ہوا ہوگا، اور نہریں ہوں گی

دودھ کی جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہوگا، اور نہریں ہوں گی شراب کی جو پینے والوں کے لیے یکسر لذت ہوگی، اور نہریں ہوں گی صاف شفاف شہد کی اور اس میں ان کے لیے ہر قسم کے پھل بھی ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت بھی۔ (کیا یہ لوگ جن کو یہ نعمتیں حاصل ہوں) ان لوگوں کے مانند ہوں گے جو ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں اور جن کو اس میں گرم پانی پلایا جائے گا، پس وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر کے رکھ دے گا؟

تو پھر کیا تعجب ہے کہ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات جہنم سے متعلق بتائے ہیں وہ اسمائے جلال قہر اور غضب ہیں اور جو نام اور صفات جنت سے نسبت رکھتے ہیں وہ اسماء وصفاتِ جمال و رحمت ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَام (۳:۴)

جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔

وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى (۲۰:۸۱)

اور جس پر میرا غضب اُترا وہ تباہ ہوا۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْم (۹:۲۱-۲۲)"

ان کا رب ان کو خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغوں کی

جن میں ان کے لیے ابدی نعمت ہے۔

# نفس کی آشکارائی Unfolding of the Soul

## صورتِ الہیہ کا قیام Shaping the Divine From

قرآن مجید میں معاد اور آخرت کے بارے میں کیا بتایا گیا ہے یہ جاننا ہو تو کتاب الٰہی پڑھتے جایئے۔ آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آخرت میں ایک سلسلہ واقعات ہو گا جو پیش آئے گا اور انسانوں پر یہ واقعات جس طرح بیتیں گے اس کا تعلق کسی حد تک اس امر سے ہو گا کہ انسان کی اصلی ذمہ داری، اس کا منصب کیا ہے۔ تاہم اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ عالمِ صغیر microcosm اور صورتِ الٰہی پر خلق ہونے والی مخلوق کے طور انسان کے کردار سے معاد کا کیا تعلق ہے تو ہمیں اس موضوع پر ان تحریروں کا مطالعہ کرنا ہو گا جو مسلمان علماء نے قرآن وحدیث کی بنیاد پر بعد میں مرتب کیں۔ اس ضمن میں ہم جو عرض کرنا چاہتے ہیں اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ جس طرح "توحید و رسالت" کا جواز، انسان کے لیے ان کی معنویت، ان کا ثبوت اور دلیل اور ان کا تحقق و اثبات، معاد ہی کے ذریعے ہوتا ہے اسی طرح عالمِ کبیر macrocosm (یعنی کائنات) اور عالمِ صغیر microcosm (یعنی انسان) کے بارے میں، نظامِ عالم اور ہستی انسانی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی پوری معنویت اور صحیح مفہوم تبھی کھلتا ہے جب ان کو انسان اور تقدیر انسانی کے تناظر میں رکھا جائے اور اسی سیاق وسباق میں ان پر غور کیا جائے۔٦ے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر تخلیق کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو تمام اسماء کا علم دیا۔ سیدنا آدمؑ کو ان اسماء کا واقعی، سچا اور بالفعل علم حاصل

تھا۔ البتہ عارضی طور پر ان سے بھی بھول ہو سکتی تھی۔ باقی اولادِ آدم تو ایک ایسی غفلت و نسیان لے کر پیدا ہوئی ہے جو وقتی لحاتی بھول سے کہیں زیادہ ہے۔ صفاتِ خداوندی اس کے اندر خفتہ و خوابیدہ ہیں، ان صفات کو اس خفتگی سے باہر لانے کی ضرورت ہے اور انسان کے فکر و عمل، اس کے ذہن اور اس کے ہر کام پر ان کے نقش کو مجسم کرنا مطلوب ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ وہ اسماء جو آدمؑ کو تعلیم کیے گئے وہ تمام اشیاء کے اسماء تھے، تمام مخلوقات کے اسماء تھے۔ بہت سے علماء کے نزدیک ان اسماء میں اللہ کے اسماء بھی شامل تھے۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ اشیاء کے نام اللہ ہی کے اسماء ہیں کہ ہر وہ نام جس سے کسی حقیقت، کسی حقیقی چیز کو موسوم کیا جا سکے وہ الحق کے لیے بھی بطور اسم استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر یہ رائے قبول کی جائے تو پھر یہ کہنا ہو گا کہ ننانوے اسمائے حسنٰی کے سوا بھی اللہ تعالیٰ کے لاتعداد و بے شمار اسماء ہیں۔ اگر صرف اتنا ہی مانا جائے کہ سیدنا آدمؑ کو جن اسماء کا علم دیا گیا تھا وہ صرف مخلوقات کے اسماء تھے تب بھی یہ تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ ہر مخلوق اللہ ہی کی ایک نشانی ہے۔ ہر مخلوق اللہ کی حقیقت پر دلالت کرتی ہے اور اسے موسوم کرتی ہے۔ چونکہ مخلوقات کا کوئی شمار ہی نہیں پس اللہ کے ناموں کی تعداد بھی لامحدود ہے۔

سیدنا آدمؑ کو دیئے گئے اسماء کو کسی بھی مفہوم میں لیجیے اس سے ایک نکتہ بہر حال ابھرتا ہے کہ ان اسماء کے علم ہی سے سیدنا آدمؑ کو وہ فضیلت اور برتری ملی تھی جس نے ان کو ہر مخلوق پر فائق اور ہر شے سے بہتر بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم بعد میں دیا، پہلے آدمؑ نے ان کے سامنے اسماء کے علم کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور ایک موقع پر سیدنا آدمؑ سے اگرچہ ایک بھول بھی

ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کا مقام دوبارہ عطا کیا، انہیں اپنے خاص بندے کے طور پر چن لیا اور انہیں اپنا نبی اور رسول بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدمؑ کو اپنا خلیفہ بنانے کے لیے تخلیق کیا تھا۔ خلافت اولادِ آدم کا پیدائشی حق ہے۔ تاہم خلافت تک ان کی رسائی صرف اور صرف انبیاء کی پیروی کرنے سے ممکن ہوتی ہے۔ اس کے لیے اولادِ آدمؑ کو اس بات پر ایمان لانا ہے اور عمل کرنا ہے جو اسے اللہ کی کتابوں میں بتایا گیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ(۲٤:۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے۔

خلیفۃ اللہ ہونے کا مطلب ہے کہ دیگر باتوں کے علاوہ انسان میں ان تمام صفات خداوندی کا ظہور ہو جن کے پرتو میں انسان کو تخلیق کیا گیا تھا کہ صورت الٰہیہ انہی تمام صفات سے عبارت ہے۔ اللہ کی اپنی صفات کو انسان اگر اپنے فکر و عمل میں مجسم کرے گا تبھی اللہ کی نمائندگی کر سکے گا تبھی اس کا نائب کہلائے گا۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اکثر لوگ اس استعداد، اس چھپی ہوئی صلاحیت پر پورے نہیں اترتے۔ ایمان رکھتے ہوئے اور عمل صالح کرنے کے باوجود بھی وہ کبھی اللہ کے قابلِ اعتبار بندے نہیں بن پاتے کہ ہوا وہوس اور بھول چوک، نسیان ان کو اپنی اصل ذمہ داری، اپنے اصل منصب سے غافل کر دیتی ہے۔

اس گفتگو کو اگر کارِ خیر اور عملِ صالح کے مبحث سے الگ کر لیا جائے اور مسئلے پر کونیات cosmology اور نفسیات کے تناظر میں غور کیا جائے تو بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو معاملے کو پرکھنے اور سمجھنے کا ایک اور انداز میسر آتا ہے جو اخلاقیات سے بھی مختلف ہے اور اس حد تک انسان مرکز anthropomorphic بھی نہیں ہے۔

جب انسان کا رحمِ مادر میں حمل ٹھہرتا ہے تو اس مرحلے پر ہمارے سامنے وہ چیز ہے جسے ہم نے ''خاکِ آدم'' یا آب و گل کا آمیزہ کہا تھا، وہ مجموعۂ آب و گل جسے اللہ کے دو ہاتھوں نے گوندھا اور ڈھالا تھا۔ قرآن مجید میں کئی جگہ رحمِ مادر میں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی کا ذکر آتا ہے۔

هُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْآ اَشُدَّ کُمْ ثُمَّ لِتَکُوْنُوْا شُیُوْخًا وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْآ اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (٤٠:٦٧)

وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کی ایک پھٹکی سے۔ پھر وہ تم کو وجود میں لاتا ہے ایک بچہ کی صورت میں۔ پھر (وہ تم کو پروان چڑھاتا ہے) کہ اپنی جوانی کو پہنچو۔ پھر (وہ تم کو مہلت دیتا ہے) کہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض اس سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور (بعض کو مہلت دیتا ہے) کہ تم ایک مدت معین پوری کرو۔ اور یہ اس لیے ہے کہ تم سمجھو۔

حمل کے چوتھے مہینے تک یہ مشتِ خاک، یہ آمیزۂ آب و گل اتنا صورت

پذیر ہو جاتا ہے کہ نَفَسِ رحمٰن (اللہ کی پھونک) کو قبول کر سکے۔ تب فرشتہ بدن میں روح پھونکتا ہے۔ رحمِ مادر کے اندر سارا عرصہ ایسا ہے جس میں جنین وہ خواص اور اوصاف ظاہر کرتا ہے جو جمادات اور نباتات کے خواص ہیں۔ اس جنین میں اور بھی خواص ہوتے ہوں گے مگر ہمارے حواس کے سامنے ان میں سے کسی کی نمو نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ آلات کے ذریعے اس کا قریب سے معائنہ کرنے پر ایک مختلف صورت سامنے آ جائے۔

جب بچے کی ولادت ہوتی ہے تو پہلی خصوصیات جو اس سے ظاہر ہوتی ہیں وہ عالمِ حیوانات کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے بچے کے مقابلے میں جانور کہیں تیزی سے بڑھتا ہے اور اپنے پورے قد کاٹھ کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے جانور اپنی نسل کے جملہ خواص، سارے اوصاف پیدا ہونے کے چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کے اندر ظاہر کرنے لگتا ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ مختلف ہے۔ نسلِ انسانی کے افراد اپنی سرشت میں موجود صفات کو عملاً کبھی بھی پوری طرح ظہور میں نہیں لاتے کہ ان صفات کی تعداد لامحدود ہے، اولادِ آدمؑ کے اوصاف و صفات بے پایاں ہیں۔

جنین کی نباتی صلاحیت یا ملکۂ غاذیہ میں صفاتِ الٰہیہ بہت کمزور سی صورت میں اپنا ظہور کرتی ہیں۔ پودوں کی طرح جنین میں زندگی کے آثار ہوتے ہیں، یہ اپنی غذا حاصل کرتا ہے، اسے جذب کرتا ہے اور اس میں نمو اور بڑھوتری کی صلاحیت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ جنین میں انسانی خواص بیدار ہوتے ہیں۔ ماں کو اس کا پہلا احساس ہوتا ہے جب بچہ شکمِ مادر میں حرکت کرتا ہے۔ گزرے وقتوں میں جنین میں نمودار ہونے والی زندگی کے یہ آثار محسوس کرنے کو

''بیداریٔ رحم'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ حیوانی اوصاف جلد ہی نمودار ہو جاتے ہیں جو اس میں اور دوسرے جانوروں میں مشترک ہیں مثلاً بھوک اور غصہ۔ یہ دونوں صفات اصل میں ارادہ اور غضب کی دو صفات خداوندی کا ظہور ہوتی ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر ثقافت میں اس جادوئی، کرشماتی طاقت کا اعتراف کیا گیا ہے جو قوتِ گویائی، انسانی نطق و کلام کی صلاحیت کے ساتھ منسلک ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ تخلیق بھی کلام کے وسیلے سے کرتے ہیں اور وحی بھی کلام کے ذریعے نازل کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان اللہ کا فہم بھی گویائی کے ذریعے حاصل کرتا ہے اور اپنے اختیار سے اللہ کی طرف لوٹنے کا عمل بھی کلام کے ذریعے انجام دیتا ہے۔ قرآن کا سیکھنا، پڑھنا اور دین پر عمل کرنا کلام پر منحصر ہے۔ مسلمانوں نے جب یونانی سے ترجمے کیے اور اس فقرے کا ترجمہ کیا کہ The human being is a rational animal" تو ترجمے میں یونانی الفاظ کے معانی کی ایک ایسی سطح اور ایسے پہلو پر زور دیا جو انگریزی میں تقریباً فراموش ہو چکا ہے۔ ''حیوانِ ناطق'' کی عربی ترکیب کے لفظی معنی ہیں ''انسان ایک بولنے والا جانور ہے'' جس چیز کو آج rationality (ذی عقل ہونا، ذی شعور ہونا) کہتے ہیں وہ کیا ہے عقل کا اظہار و بیان گویائی کے وسیلے۔ اسی طرح نطق و گویائی کا مطلب ہے عقل جو اظہار میں آ جائے، بیان کی صورت اختیار کر لے۔ گویائی اور کلام اگر مبنی بر عقل نہ ہو تو اس میں اور کتے کے بھونکنے اور پرندے کے چہچہانے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

سو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلام وہ خاص صفتِ خداوندی ہے جس سے انسان اور

دیگر زمینی مخلوقات میں امتیاز قائم ہوتا ہے۔(فرشتے اور جن بھی گویائی رکھتے ہیں لہٰذا ان سے امتیاز اس بنیاد پر نہیں ہوسکتا)۔ہم نے عرض کیا تھا کہ گویائی اصل میں اس شخص یا ہستی کی ذات کا اظہار ہے جو خود آگاہ ہو،شعورِ ذات رکھتی ہو۔جب اللہ تعالٰی کلام فرماتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں کہہ رہے ہیں۔ بلاشبہ حیوانات بھی بہت کچھ کہتے ہیں لیکن ان کی گویائی اور خود آگاہی یا شعورِ ذات بہت ہی محدود ہے، اتنا محدود کہ شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ ان میں یہ اوصاف پائے ہی نہیں جاتے۔انسان کی قوتِ گویائی، اس کے برعکس، خود آگاہ ہونا چاہیے لیکن بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا۔انسان کے دیگر اوصاف کی طرح یہاں بھی وہی مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے کہ ''جو عملاً ہوتا ہے'' وہ اس کے الٹ ہے ''جو ہونا چاہیے''۔

انسان اپنی قوت گویائی ،ملکہ نطق وکلام کے وسیلے سے کیا کہہ سکتا ہے اور کیا جان سکتا ہے؟اس کی بلاشبہ کچھ حدود ہیں لیکن یہ حدود اس امر سے متعین نہیں ہوتیں کہ بولنے والا شخص کون ہے یا کونسی زبان بول رہا ہے یا تاریخ کے کس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ان حدود و قیود کا تعلق اس بات سے ہے کہ انسان ہونے کا مطلب کیا ہے۔ انسان کی گویائی پر پابندی و آزادی کو سمجھنا ہو تو ہمیں نسلِ انسانی کے ان عظیم اور مثالی افراد کو دیکھنا ہوگا جن کی ذات میں صفاتِ خداوندی مجسم ہوگئیں اور ان کا ظہور اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا۔بات گویائی یا قدرت کمال کی ہو تو ہمیں سب سے پہلے نسلِ انسانی کے عظیم ترین بولنے والوں پر نگاہ کرنی ہوگی،وہ جنہیں خطاب کرنے اور خوش کلامی کی استعداد سب سے زیادہ ملی تھی۔ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن پر اللہ کی کتاب اتاری گئی اور وہ بھی جن کے زورِ بیان سے عالمی ادب کے نفیس ترین شاہکار وجود میں آئے۔قصۂ آدم میں جو اس امر کا ذکر آیا ہے کہ سیدنا آدمؑ کو تمام اشیاء

کے نام دنیا کی تمام زبانوں میں سکھائے گئے تھے تو اس کے ایک معنی تو بالکل واضح ہیں۔ چونکہ انسان خلقی طور پر سب اسماء کا علم رکھتا ہے لہٰذا اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ ملکۂ گویائی کے تمام امکانات کو ظہور میں لا سکے۔

انسانی تاریخ میں قدرتِ کلام اور حسنِ بیان کا ظہور جس طرح ہوا ہے اس پر غور کیجیے۔ یہ بات فی الفور سمجھ میں آ جائے گی کہ قوتِ گویائی اور لطفِ سخن میں جیسے جیسے امکانات پوشیدہ ہیں ان کے مقابل ہم آپ تو اس کے بہت ہی ناقص اور ادھورے مظاہر شمار کیے جائیں گے۔ آج کا بڑے سے بڑا شاعر شیکسپیئر، دانتے یا حافظ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ہما شما کس شمار قطار میں آتے ہیں۔ دوسری طرف دنیا کا شاہکار ادب دیکھیے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیکسپیئر کا کوئی بھی ڈرامہ انجیل کی ہمسری کر سکتا ہے یا تاؤتی چنگ کی یا بھگوت گیتا کی؟

نومولود بچے کی مثال پر ذرا غور فرمائیے۔ اس دنیا میں آنے کے بعد کئی ماہ تک طفل شیرخوار میں انسان کی قوتِ گویائی کے پروان چڑھنے کا عمل شروع نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ امکاناتِ گویائی کے پنپنے اور بڑھنے کا عمل شروع ہو جائے تو پھر یہ تا دمِ مرگ جاری ہی رہتا ہے۔

گویائی کی اس قوت کو ایک عملی حقیقت بنانے کے لیے بچے کے سامنے اسے بڑھانے اور ترقی دینے کے جو امکانات ہیں ان میں سے سب سے بہتر راستہ کیا ہے؟ ہماری ثقافتی زندگی میں اس سوال کے جواب پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ جیسا اور جتنا کسی نے پڑھ رکھا ہے ویسا ہی جواب اس کے پاس فراہم ہوتا ہے۔ ہر شخص نے اس معاملے میں اکا دکا ماہرین کی رائے یاد کر رکھی ہے اور اسی کو فیصلہ کن بتاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اس سوال کا جواب نفسیات کے پاس ہے، دیگر

حضرات اس کے جواب کے لیے سماجیات کو موزوں جانتے ہیں یا فلسفہ، دینیات سے رجوع کرتے ہیں یا پھر اپنے بزرگوں میں سے کسی فرد مثلاً چچا جان سے پوچھتے ہیں ۔بچوں کی نفسیات کا ایک ماہر آپ کو جو مشورہ دیتا ہے دوسرے ماہر کا مشورہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور کسی بڑی بوڑھی سے پوچھیے تو وہ کہے گی کہ یہ جو بچوں کی نفسیات کے ماہر بنے بیٹھے ہیں ان کو سرے سے بچوں کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب کے تناظر میں یہ اختلاف رائے آج کے مقابلے میں بہت کم تھا۔سب لوگ یہ بات جانتے اور مانتے تھے کہ قوت گویائی اور ملکۂ نطق و کلام اللہ کی صفات میں سے ہے اور زبان کا، اعجازِ بیان کا، کامل ترین نمونہ قرآن میں پایا جاتا ہے اور انسانوں میں اگر کوئی شخص سب سے فصیح و بلیغ تھا اور قدرتِ کلام میں سب سے بڑھا ہوا تھا تو وہ رسول خدا کی ذات تھی۔حقیقی کلام تو کلام اللہ ہی ہے ''لا کلام الا کلام اللہ''۔اگر انسان نے واقعی اس صفتِ خداوندی کی اپنے اندر نشوونما دیکھنا ہے تو اسے وہیں سے اپنا آغاز کرنا ہوگا جہاں اس صفتِ خداوندی نے ایسی صورت اختیار کی ،ایسی شکل میں ظہور کیا جسے ہر انسان دیکھ سکتا ہے، اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور وہ صورت ہے قرآن مجید۔یہی سبب ہے کہ اسلامی ثقافت دنیا کے ہر خطے میں اس بات کو تسلیم کرتی ہے اور اس پر زور دیتی ہے کہ قرآن کو اپنے اندر سمونا، اسے مجسم کرنا اور اپنے آپ کو نورانی کرنا کتنا اہم ہے۔

## خیال Imagination

مسلم ماہرین نفسیات نے بتدریج قرآن و حدیث پر مبنی مختلف افکار اور نظریات مرتب کر لیے جن کی مدد سے اس امر کی توضیح ہوتی تھی کہ نفسِ انسانی ایک

بالقوہ صورتِ الٰہیہ کے مرحلے سے لے کر ایک مکمل اور فی الواقعہ حقیقی صورتِ الٰہیہ تک کیسے پروان چڑھتا ہے اور کن مراحل سے گزرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے سارے نظریات کی بنیاد نفس کے اس تصور پر استوار کی گئی ہے جس کا ذکر ہم نے "توحید" کی بحث میں کیا تھا۔ اس تصور کے مطابق نفس کی ماہیت دو رُخی نوعیت کی ہے اور اسے روح اور بدن کے درمیان کی چیز گردانا جاتا ہے۔ سابقہ گفتگو کو تازہ کرنے کی غرض سے اتنا مکرر عرض کر دیتے ہیں کہ انسان کی ہستی مرکب ہے نفخ روح اور آمیزۂ آب و گل سے۔ مشتِ خاک میں اللہ کی روح پھونکنے سے انسان کا وجود ہے۔ روح کی خلقی اور اصل صفات ہیں نور، حیات، علم (یا آگہی) ارادہ، قدرت، کلام وغیرہ۔ اس فہرست کو اللہ تعالٰی کے ننانوے اسماء تک وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس بدن جس حد تک خاکی ہے اس حد تک اس میں ان صفات میں سے کوئی صفت بھی ڈھنگ سے نہیں پائی جاتی۔

نفس وہ نقطہ ہے جہاں روح اور بدن کا اتصال ہوتا ہے، نور و ظلمت گھل مل جاتے ہیں، موت و حیات یکجا ہو جاتے ہیں اور بے خبری اور آگہی کا ملاپ ہوتا ہے۔ نسلِ انسانی کا ہر فرد علم اور لاعلمی، قدرت اور ناطاقتی، خواہش اور بے رغبتی سب صفات کے آمیزے کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اگر ہم مختلف صفاتِ خداوندی پر غور کریں تو جلد ہی ہم پر عیاں ہو جائے گا کہ یہ صفات مختلف لوگوں میں مختلف درجات میں پائی جاتی ہیں، کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ ہم نے چند صفحات قبل ذکر کیا تھا کہ صفتِ کلام، گویائی کا ملکہ انسانوں میں کیونکر پایا جاتا ہے اور اس کے کتنے درجات اور سطحیں ہیں۔ بچوں کی غوں غاں سے لے کر زبانِ رسالت کی فصاحت تک سب اللہ کی صفتِ کلام کا ظہور ہے۔ اسی طرح زندگی یا حیات کی صفت بھی یکساں انداز

میں سب جگہ نہیں پائی جاتی۔ ہم سب زندہ تو ہیں، اس میں شک نہیں۔ لیکن کچھ لوگ بیماری کا شکار ہیں، عمر رسیدہ ہیں یا دوسرے اشخاص کے مقابلے میں موت سے زیادہ قریب ہیں۔ قدرت Power کی صفت جس طور ظہور پذیر ہوتی ہے اس میں بھی بہت تنوع اور اختلاف ہے اور اس کے درجات کا یہ فرق بہت واضح ہے کیونکہ مغربی ثقافت نے صدیوں تک طاقت اور قدرت آزمائی کو خاص اہمیت دی ہے۔ قدرت سے ہماری مراد ہے معاملات اور اشیاء پر قابو یافتگی، بالا دستی، اقتدار۔ اس کی ایک سطح وہ ہے جو جسمانی طاقت سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں بھی انسان انسان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دوسرے پہلو سے قدرت کا ایک مظہر سماجی قوت ہے جس کا اطلاق اور استعمال اقتصادی قوت کے طور پر بھی ہو سکتا ہے اور سیاسی قوت کے طور پر بھی۔ نیز اس کے دیگر راستے بھی ممکن ہیں۔

ہر انسان ذی نفس ہے اور نفس کیا ہے، اللہ کی روح جو مشتِ خاک میں پھونکی گئی، روح جو بدن کے قالب میں آ گئی۔ انسان کو نہ تو روح سے براہ راست آگہی حاصل ہے نہ بدن کا بلاواسطہ شعور۔ ہمیں اپنے آپ کا جو تجربہ ہوتا ہے وہ نفس کے واسطے سے ہے، نفس ہی اس کا تعین کرتا ہے۔ اپنے بدن کا اور دوسرے جسموں کا جو تجربہ جو آگہی ہمیں ملتی ہے وہ نفس کے واسطے سے ہو کر آتی ہے۔ اسی طرح روح کی آگہی بھی نفس ہی کے وسیلے سے میسر ہوتی ہے۔ آگہی، شعور اور احساس ہمارے نفوس کی صفات ہیں۔ اور انہی سے ہم اپنے بدن کو جان پاتے ہیں۔ اس شعور و آگہی کا منبع روح ہے اور ذرا اور پیچھے جایئے تو خود اللہ تعالیٰ اس کا ماخذ ہے کیونکہ "لا عالم الا اللہ" اللہ کے سوا شعور و آگہی، علم و معرفت اور کس کو ہے۔

بدن بحیثیت بدن کوئی احساس و آگہی نہیں رکھتا کیونکہ یہ محض مجموعۂ آب و

رگل ہے۔دوسری جانب روح بطور روح ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہے کہ خود روح ہی تو ہمارے احساس و آگہی کی آخری اور حتمی بنیاد اور داخلی مرکز ہے۔آگہی اور شعور روح سے ہے لہٰذا خود روح سے آگاہ ہونا اس کا شعور و احساس حاصل کرنا ممکن نہیں جیسے نظر خود اپنی آنکھ کو نہیں دیکھ سکتی۔ہاں آنکھوں کو دیکھنے کے لیے آپ آئینے کے سامنے البتہ جا سکتے ہیں۔اسی طرح اگر روح کو دیکھنا ہو تو اپنے نفس میں جھانکیے کہ اس میں روح کا پرتو ہے، روح کی صفات کا عکس اس میں جھلک رہا ہے۔لیکن ''آپ'' جو اس دیکھنے کی تہ میں کارفرما ہے، آپ کا اپنا ''آپ''، اسے کبھی دیکھا نہیں جا سکتا کہ یہی روح سے عبارت ہے۔

ہم عرض کر چکے کہ نفس کی ماہیت بیان کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں سے ایک ''خیال'' کا لفظ بھی ہے۔کسی چیز کی تمثیل یا عکس میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ بیک وقت اس چیز سے مختلف بھی ہوتا ہے اور عین اس چیز جیسا بھی۔مثال کے طور پر فیصل مسجد کی شبیہ یا عکس کو لیجیے۔یہ فیصل مسجد ہی کا عکس ہے، سپریم کورٹ یا سینٹ کی عمارت کا نہیں لہٰذا، اپنے مشمولات کے اعتبار سے یہ شبیہ ایک مختلف چیز بھی ہے کیونکہ یہ کاغذ پر کیمیاوی طریقے سے ایک عکس کو ثبت کرنے کا نام ہے۔روایتی طور پر عکس و شبیہ کی جو مثال عام طور پر پیش کی جاتی تھی وہ تھی آئینے میں عکس کی مثال۔اب ذرا نفس کی طرف واپس آیئے۔نفس میں روح اور بدن دونوں کا عکس موجود ہے۔روح کا عکس، اس کا نقش جتنا زیادہ ہو گا اتنا ہی نور، حیات، علم، ارادہ، قدرت اور دیگر صفات نفس میں جا گزیں اور غالب ہوں گی۔اسی طرح بدن کا عکس نفس کے اندر ظلمت و تیرگی، موت، بے علمی اور عجز و ناطاقتی کو جنم دے گا۔

نفس، روح و بدن کے درمیان کی شے ہے لیکن یہ درمیانی حیثیت کوئی ساکن اور جامد مقام نہیں ہے۔ خواب میں آنے والی شبیہ کی طرح نفس بھی ایک انقلابِ پیہم کی زد میں رہتا ہے۔ اس کی صورت و ماہیت ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ اس نکتے پر غور کرنا ہو تو کبھی کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر باہر کی دنیا سے قطع نظر کر کے ذرا اپنی نگاہ کا رخ اندر کی جانب کر لیجیے، اپنے نفس پر نظر کیجیے۔ آپ کو احساس ہوگا کہ آپ کے اندر ہر لحہ بدلتی ہوئی ایک شعور کی رو ہے جس میں یادیں، محسوسات، خیالات، عکس اور شبیہیں پل پل نیا روپ لیتی رہتی ہیں۔

زندگی کے روزمرہ معمولات میں انسان ان صفاتِ خداوندی کو ظاہر کرتا ہے جو اس کے اندر خوابیدہ اور چھپی ہوئی ہیں۔ ایک لحہ وہ مائل بہ کرم ہوتا ہے (الکریم کی صفت کا مظہر) اور دوسرے لمحے اس سے المانع اور القابض (روک لینے والا، واپس لے لینے والا) کی صفاتِ ربانی کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی خود آگہی اور خلق آگہی بھی کبھی یکساں نہیں رہتی۔ مثالی صورت تو یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں سے معاملات کرتے ہوئے اس علم کو زیادہ سے زیادہ عمل میں لائے، حقیقت واقعہ بنائے جو سیدنا آدمؑ کو دیا گیا تھا۔ دین کے پانچ ارکان اور دیگر اعمال مثلاً ذکرِ الٰہی کا مقصد یہی ہے کہ انسان کی آگہی کو اس چیز پر مرکوز کیا جا سکے جو فی الواقعہ اللہ تعالٰی نے انسان میں رکھی ہے جو اللہ کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے اور اس طرح انسان کے اندر جو صورتِ الٰہیہ ہے وہ الحق کی صفات کے مکمل ظہور کے مطابق بڑھے، پروان چڑھے اور اپنی پوری دمیدگی تک پہنچے۔ تاہم ایک چیز یقینی ہے۔ نفس چونکہ عالمِ خیال کی ایک حقیقت ہے پس متواتر دو لمحے کے لیے بھی ایک سا نہیں رہتا۔ پل پل بدلتا رہتا ہے۔

نفس کی ماہیت اور روح و بدن کے درمیان ایک مبہم حقیقت کے طور پر اس کے مرتبہ وحیثیت کو بیان کرنے کے لیے اور بھی لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اسے روح کی تجسیم کہا گیا ہے۔ نفس میں آ کر بدن کے خدوخال اختیار کر کے ہی روح اپنی صفات مثلاً کلام اور قدرت وغیرہ کو ظاہر کر سکتی ہے۔ بدن کا وسیلہ نہ ہو تو روح کلام نہیں کر سکتی۔ نفس وہ نقطۂ وصال ہے جہاں روح اور وہ الفاظ یکجا ہو جاتے ہیں جو ہم بولنے والے کی زبان سے سنتے ہیں۔ اللہ کے کلام کی طرح روح کا کلام بھی اس وقت اظہار و بیان میں آتا ہے جب اسے لفظ کے وسیلے سے ایک خارجی قالب میسر آتا ہے۔ بلا لفظ آگہی یا بے آواز سوچ سے لے کر لفظ اور فقرے کا سفر جادۂ نفس پر ہی طے ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ ہم میں سے ہر شخص کو ہوگا۔

مثال کے طور پر اگر آپ ایک ریاضی دان ہیں اور کوئی آپ سے آپ کے موضوع پر ایک مشکل اور الجھا ہوا سوال کر دیتا ہے۔ آپ کو اس کا جواب معلوم ہے اور سوچے بغیر فوری طور پر آپ کے ذہن میں آ گیا ہے لیکن اس جواب کو سامنے لانے، بیان کرنے کے لیے آپ کو دس منٹ تک گفتگو کرنا پڑتی ہے۔ یہ ہے وہ عمل جس میں بے حرف و آواز اور غیر مجسم روح یعنی آپ کا فہم و آگہی نفس کی وساطت سے الگ الگ لفظوں اور فقروں کا قالب اختیار کرتا ہے اور جامۂ حرف وصوت میں آ جاتا ہے۔ لفظ بذات خود ''خیال'' کے عالم سے متعلق ہے۔ اقلیمِ گویائی میں لفظ ہی نفس کی ماہیت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لفظ نہ تو آگہی و شعور ہے نہ کوئی مادی جسمانی شے۔ نفس کے مانند الفاظ بھی روح وبدن کے درمیان کے حقائق ہیں۔

روح کی صفات میں سے ایک صفت اس کی وحدت و یکتائی بھی ہے۔ اللہ نے جو روح پھونکی وہ ایک نا قابلِ تقسیم حقیقت ہے، نورانی، ذی شعور، صاحبِ ارادہ

اور قدرت رکھنے والی۔ روح کے برعکس بدن کو جتنا چاہے تقسیم کر لیجیے۔ بدن اور اجزائے بدن میں سے کوئی بھی اپنے آپ میں ایک مکمل کل نہیں ہے۔ بدن اگر یکجا اور ایک وحدت میں بندھا ہوا ہے تو اس کا سبب روح کی قدرت ہے جس نے منتشر اجزاء کو ایک ایک کر کے جوڑا ہے۔ روح نہ ہو تو بدن مٹی میں مل کر، بکھر کر، مٹی ہو جاتا ہے۔ پس روح واحد ہے جبکہ بدن کثیر۔

نفس وحدت و کثرت ہر دو کا اسیر ہے۔ ایک بھی ہے اور متعدد بھی۔ واحد اس لیے ہے کہ ہم میں سے ہر انسان ایک منفرد اور یکتا شخصیت ہے جو اس امر کا انکار نہیں کر سکتا کہ "میں، میں ہوں"۔ نفس میں تعدد اس لیے ہے کہ ایک ہی نفس کے کتنے ہی کردار اور حیثیتیں ہیں جو بدن میں ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نفسِ واحد یہ "انا" یا "خودی" ذی حیات ہے، علم رکھتی ہے، صاحبِ ارادہ ہے، گویائی، سماعت، بصارت، ذائقہ، لمس کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی یادداشت بھی ہے۔ نفس کی ان صلاحیتوں یا قوتوں میں سے کئی ایسی ہیں جن کا بدن کے خاص خاص اعضاء سے تعلق ہے۔ خلاصہ یہ کہ نفس روح کی تجسیم کا نام ہے۔ روح نہ ہو تو ہر وحدت مٹ جاتی ہے، بدن نہ ہو تو کثرت ظہور میں نہیں آتی۔

ہمارے تجربے میں آنے والی دنیا میں نفس بطور روحِ مجسم کے لیے اگر قریب ترین مثال کوئی ہو سکتی ہے تو وہ نورِ مرئی کی مثال ہے۔ مطلب یہ کہ نفس کو اگر روح کی تجسیم مانا جائے تو اس کی مثال اس روشنی کی ہو گی جو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ یہ روشنی ایک حقیقتِ واحدہ ہے۔ لیکن جیسے ہی نور کی یہ حقیقتِ واحدہ مادی، جسمانی اشیاء سے ٹکراتی ہے اس میں رنگ ابھرنے لگتے ہیں۔ یہ رنگ اس روشنی میں شروع ہی سے موجود تھے تاہم بالقوہ موجود تھے، لیکن یہ رنگ ہائے خفتہ اس وقت تک نمودار نہیں ہو

سکتے اور فی الواقع سامنے نہیں آ سکتے تاوقتیکہ یہ روشنی کسی چیز کی سطح سے نہ ٹکرائے یا اس کو کسی اور مادی طریقے سے، مثلاً منشور Prism کے ذریعے رنگوں میں بکھیرا نہ جائے۔ اسی طرح زندگی، علم اور قدرت روح کے اندر موجود ہوتے ہیں لیکن بدن کے بغیر ان صفات کا خارج میں ظہور نہیں ہوتا، یہ امرِ واقعہ نہیں بنتے۔ سو ہماری تمثیل کے مطابق روشنی نور ہوئی، اس کے رنگ نفس کے مترادف ٹھہرے اور مادی اشیاء جن پر روشنی پڑ رہی ہے بدن کی مثال قرار پائے۔

خیال Imagination کی تعریف اکثر تجسّدِ رواح یعنی ''روحانی امور کی تجسیم'' کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح عموماً اس کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ''خیال'' کا کام ہے جسمانیات کو روحانیات میں تبدیل کرنا۔ اس بحث میں نفس کی حقیقت کی ایک اور جہت، ایک اور پہلو عموماً پیش نظر ہوتا ہے۔ غور فرمایئے کہ خارج کی دنیا میں جو چیزیں موجود ہوتی ہیں ہم ان کی آگہی حاصل کر کے، ان کو اپنے حواس کی گرفت میں لا کر کیونکر اپنے نفس میں منتقل کر لیتے ہیں! ہم ایک درخت یا ایک مکان یا کسی شخص کو دیکھتے ہیں یہ دیکھنا بذات خود نفس کا ایک عمل ہے۔ ایک جسمانی، مادی شے یعنی درخت، مکان یا کوئی شخص، اب مبدل بہ روح ہو گیا ہے، یعنی ایک ایسی چیز میں بدل گیا ہے جو ہماری آگہی کے نورانی حلقے میں شامل ہو گئی ہے۔ یہ چیز اب ہماری ذات کا، ہمارے نفس کا حصہ ہے۔ یہ ہماری زندگی سے زندہ ہے۔ جو پہلے مردہ تھی (یعنی جس حد تک وہ صرف آب و گل سے عبارت تھی) اب ہمارے اندر، ہماری وساطت زندہ ہے۔ چنانچہ اپنی پہلی حیثیت کے مقابلے میں اسے روحانیت حاصل ہو گئی۔

یاد رہے کہ روح اور بدن کے تصورات کوئی مطلق تصورات نہیں ہیں۔ ان میں

ایک اضافیت پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر روح کے مقابلے میں نفس ایک جسمانی چیز ہے، روح کے لیے نفس بدن کی طرح ہے کیونکہ روح کے برعکس اس میں بدن کے سارے خواص، ظلمت و تیرگی ، موت، جہل اور کمزوری وغیرہ سب پائے جاتے ہیں ۔لیکن اگر نفس کا موازنہ بدن سے کیا جائے تو نفس ایک روحانی چیز ہو گا کہ اس میں روح کی ساری صفات ، نور، حیات، علم، قدرت وغیرہ پائی جاتی ہیں ۔سوہم پھر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ نفس ایک دورُخی اور مبہم شے ہے۔یہ ''خیال'' ہے، روح کی شبیہ بھی ہے اور بدن کی شبیہ بھی ہے لیکن ساتھ ہی یہ نہ تو نرا بدن ہے اور نہ محض روح۔

''خیال'' کے اس تصور کو پس منظر میں رکھیے اور پھر از سرِ نو نفس کی نشو ونما پر غور کیجیے۔نفس میں جتنی بھی صفاتِ خداوندی موجود ہیں وہ ''خیال'' کی چیزیں ہیں (یہاں ''خیال'' وہمی ،فرضی اور تخیلاتی کے معنی میں نہیں ہے )یعنی یہ کہ ان میں عکس و شبیہ کے خواص پائے جاتے ہیں ۔پس نفس کی زندگی اصل میں زندگی کا عکس ہے۔ اصلی، حقیقی زندگی تو حیاتِ خداوندی ہے جبکہ بے آلائش حیاتِ مخلوقہ فرشتوں کی زندگی ہے۔انسانی زندگی، حقیقی زندگی کا پرتو ہے یعنی یہ حیاتِ خداوندی سے مشابہ بھی ہے اور اس سے مختلف بھی ۔جس حد تک اس کی مشابہت حیاتِ خداوندی سے ہے (تشبیہ کا اصول ) انسانوں کو حقیقی زندگی میسر ہے۔جس حد تک یہ حیاتِ خداوندی سے مختلف ہے، انسان فی الاصل مردہ ہے۔تو پھر کیا کہا جائے گا، انسان مردہ ہے یا زندہ ہے؟ زندہ مردہ ہر دو یا پھر نہ زندہ نہ مردہ؟ یا پھر اس کے جواب کا دارومدار اس امر پر ہے کہ آپ نے سوال کس نقطۂ نظر سے کیا ہے۔پتھر کے مقابل انسان ذی حیات ہے جبکہ فرشتوں کے مقابلے میں انسان مردہ ہے۔یہ عکس جس

چیز کا عکس ہے یعنی حیاتِ خداوندی کا تو اگر یہ اس کے مطابق ہے تو نفس کی زندگی سچی اور حقیقی ہے۔ اب اسی نہج پر گفتگو دیگر صفاتِ خداوندی مثلاً علم، ارادہ، قدرت، کلام، جودوکرم اور عدل وغیرہ کے بارے میں بھی کی جا سکتی ہے لیکن ہماری مذکورہ بالا بحث پر اگر غور کر لیا جائے تو کوئی بھی قاری اس بحث کی تکمیل خود سے کر سکتا ہے۔ سو ہم صرف ایک نکتے پر مزید گفتگو کریں گے اور اس کے بعد دوسرے مبحث کی جانب رجوع کرنا چاہیں گے۔

نفسِ انسانی کا ارتقاء اور نشوونما ''خیال'' کی اقلیم میں واقع ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر، صورتِ الٰہیہ میں مضمر تمام صفات، وہ تمام اسماء جو آدم کو تعلیم کیے گئے، روح اور بدن کے مابین معلق رہتے ہیں۔ تاہم جیسے جیسے کوئی صفت نشوونما پاتی ہے وہ اپنی اصل کی قوی سے قوی تر شبیہ بنتی جاتی ہے، اصل یعنی صفتِ خداوندی کی شبیہ۔ انسانی نشوونما کے آغاز میں تنزیہ کو انسان کے دروبست پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ سے بے انتہا دور ہوتا ہے کہ نومولود بچے میں صفاتِ خداوندی کی بس ایک رمق ہی پائی جاتی ہے لیکن جوں جوں انسان پیغمبروں کے لائے ہوئے پیامِ ہدایت سے ہم آہنگ ہو کر نشوونما حاصل کرتا ہے اس کے اندر صفاتِ خداوندی قوی سے قوی تر ہوتی جاتی ہیں۔ وہ مدھم سی روشنی جو آغازِ کار میں ٹمٹما رہی تھی اب زیادہ واضح طور پر محسوس ہونے لگتی ہے۔ علم اور آگہی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جسم کی زندگی آگے بڑھتی ہے اور گویہ زندگی ایک بار پھر کم ہوتی ہوئی مرجھا جاتی ہے لیکن سچی زندگی جو نفس کی زندگی ہے اس میں کمی نہیں آتی۔ جسم پر موت طاری ہونے کے باوجود نفس کی زندگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ روح کو نور سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور بدن کو چیزوں کی سطح سے جن سے روشنی ٹکراتی ہے۔ اسی طرح نفس کی

مثال ان رنگوں کی ہوگی جو روشنی کے کسی چیز کی سطح پر پڑنے سے ابھرتے ہیں۔ اسی تمثیل کو آگے بڑھایا جائے تو اس امر کی وضاحت ہو سکے گی کہ جب نفسِ انسانی اپنی تمثالِ ربانی، صورت الہیہ کے الوہی نمونے کے مطابق نشوونما پاتا ہے تو اس کو کون سے مراحل درپیش ہوتے ہیں۔

عہدِ طفلی میں بدن کی ظلمت کا غلبہ ہوتا ہے اور روح کا نور ابھی مخفی ہوتا ہے اور ایک اجمالی صورت میں رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے رنگ ابھرتے ہیں سب سے پہلے بنیادی رنگ ظاہر ہوتے ہیں ان کی مثال حیات، علم و آگہی، ارادہ اور قدرت سے دی جا سکتی ہے۔ لیکن ابھی یہ رنگ بہت دھندلے ہیں کیونکہ روشنی مدھم ہے۔ بتدریج روشنی تیز ہوتی ہے اور رنگ نکھرنے لگتے ہیں لیکن اب بنیادی کے ساتھ دیگر رنگ بھی نمودار ہوتے ہیں۔ آخر کار رنگا رنگی اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ ظاہر ہونے والے گوناگوں رنگوں کی تعداد پر کوئی قید نہیں لگا سکتے بالکل ایسے ہی جیسے ظہور پذیر ہونے والی صفاتِ خداوندی کی تعداد پر کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ روشنی کی نمود کے امکانات بے شمار ہیں، اس کی رنگا رنگی بے پایاں ہے اسی طرح روح کے امکانات بھی بے حد و حساب ہیں کہ روح اللہ تعالیٰ کا غیر مرئی نور ہی تو ہے۔

ہر وہ رنگ جو نور میں سے الگ الگ ظاہر ہوتا ہے وہ اسی نور میں مخفی تھا۔ جب اس کی نمود ہوتی ہے تو یہ نور کا ایک عکس، اس کی شبیہ بن جاتا ہے یعنی اب یہ رنگ بیک وقت نور ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ نور اس لیے ہے کہ نور کے سوا اور کس چیز کا ظہور ہوا ہے اور اسے عینِ نور اس لیے نہیں کہا جاتا کہ ہر رنگ اپنی جگہ نور کے جملہ امکانات میں سے صرف ایک خفیف سے جزو کا نمائندہ ہے۔ مزید براں، رنگ اگر نمودار ہوتے ہیں تو صرف اس لیے کہ نور مدھم پڑ جاتا ہے۔ اگر نور اپنی پوری تابانی

کے ساتھ درخشندہ ہوتو اس کی چمک میں کوئی کچھ نہ دیکھ سکے۔ ہم اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے مجبور ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہی پردۂ نور اور اس کی خیرہ کن چمک نگاہ کا حجاب بن جاتی ہے۔ جیسا کہ رسول خداؐ نے فرمایا 'حِجَابُہٗ النُّور' ۵ے (نور اللہ کا حجاب ہے) مذکورہ تصورات میں سے کئی مندرجہ ذیل حدیث میں مضمر ہیں۔ یہ حدیث نفسیات اور کونیات cosmology پر لکھی گئی تحریروں میں اکثر نقل کی جاتی ہے۔ ۶ے

اللہ تعالیٰ کے نور و ظلمت کے ستر پردے ہیں۔ اگر چہ یہ حجاب اٹھ جائیں تو روئے یزدانی کی درخشندگی سے ہر وہ شے جل کر خاک ہو جائے جسے مخلوقات کی نگاہ دیکھ سکتی ہے۔

## عالمِ رؤیا The Dream World

نفس کی نشو و نما کیونکر ہوتی ہے اور موت کے بعد اسے کیا پیش آتا ہے اس پر لکھتے ہوئے کئی مسلمان مصنفین نے خوابوں کی مثال پیش کی ہے اور خواب کو ایک طرح کا پیشگی تجربہ قرار دیا ہے۔ خواب میں ہم جس دنیا کا تجربہ کرتے ہیں وہ خیال کا عالم ہے۔ خواب دیکھتے ہوئے نفس کو عکس و شبیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ شبیہیں نہ تو عینِ نفس ہیں نہ نفس سے الگ کوئی دوسری چیز کیونکہ خواب میں جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ نہ تو عین وہ اشیاء ہوتی ہیں جو نظر آ رہی ہیں نہ ادراکِ خواب میں آنے والی اشیاء سے الگ کوئی چیز۔ عالمِ خواب سارے کا سارا ابہام اور تحیر کی دنیا ہے۔

اگر آپ خواب میں اپنی ہمشیرہ کو دیکھیں تو وہ سچ مچ آپ کی ہمشیرہ ہی ہوں گی کیونکہ نہ تو وہ آپ کی والدہ ہیں نہ آپ کا فرزند۔ دوسری طرف خواب میں نظر آنے

والی شخصیت آپ کی ہمشیرہ اس لحاظ سے نہیں ہیں کہ آپ کی ہمشیرہ آپ کے نفس میں مقیم نہیں ہیں نہ ان کے خدوخال اور خواص عین اس عکسِ خواب کے سے ہیں جو پردۂ خواب پر نمودار ہوا ہے۔ آپ کی یادداشت میں ہمشیرہ کا جو نقشہ ہے اسے آپ ایک ایسی صورت میں دیکھ رہے ہیں جو خواب دیکھنے والے کی نفسیاتی حالت کے لیے مناسب ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی ہمشیرہ کا تشخص نہیں بدلتا، وہ آپ کے چچا سے بہر حال مختلف ہوں گے۔

عکسِ خواب کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ شبیہیں روحانی چیزوں کی جسمانی صورت ہوتی ہیں یا ان میں مادی چیزیں روحانی شکل اختیار کر لیتی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ پردۂ خواب پر نظر آنے والی چیزیں روحانی بھی ہو سکتی ہیں، جسمانی بھی اور روحانی جسمانی ہر دو بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کس لحاظ سے، کسی نقطۂ نظر سے ان کو دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے ادراک و آگہی میں ان شبیہوں کو چونکہ جسمانی صورت ملتی ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ روحانی اشیا نے جسمانی صورت اختیار کر لی۔ لیکن اگر اس پہلو سے غور کیا جائے کہ ہمارے ذہن نے خارجی دنیا کے عکس و شبیہ کا ادراک کر کے انہیں قبول کیا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ مادی اشیاء نے روحانی قالب اختیار کر لیا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث دونوں میں نیند اور موت کے مابین ایک گہرا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ روایتی طور پر مسلمان نیند اور موت کو ایک ہی حقیقت کے ظہور کے دو پہلوؤں کے طور پر سمجھتے رہے ہیں۔ موت میں بھی اور عالمِ خواب میں بھی باہر کی دنیا کی براہ راست آگہی منقطع ہو جاتی ہے جبکہ ہر دو صورتوں میں نفس کی خود آگاہی باقی رہتی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نیند کے بعد

اللہ تعالیٰ نفس کو پھر سے بدن کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ (۳۹:۴۲)

خواب کا بیشتر تعلق نیند ہی سے ہے۔ خواب بھی نیند کے دوران خودآ گاہی کا ایک انداز ہے۔ تو پھر کیا جو کچھ ہم نیند کے دوران خواب دیکھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اس کی کوئی مشابہت اس سے بھی ہے جو موت کے بعد محسوس ہو گا، مرنے کے بعد پیش آئے گا؟ بہت سے مسلمان مفکرین کا جواب یہ ہے کہ موت کی ہر چیز خواب سے مشابہت رکھتی ہے۔ سو اگر یہ جاننا ہو کہ نفس کو موت کے بعد جن واقعات کا سامنا کرنا ہو گا ان کی نوعیت کیا ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ خواب اور عالمِ خواب کے بارے میں غور کیا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

خوابوں کو اور خواب دیکھنے کے عمل کو سمجھنے کا طریقہ کیا ہو؟ جس شخص نے بھی اپنے خوابوں کے بارے میں کچھ سوچا ہے بخوبی جانتا ہے کہ خواب عام طور پر خاصے الجھے ہوئے اور مبہم ہوتے ہیں اور خواب دیکھنے والے کو بھی بکھرا ہوا اور بے چین چھوڑ جاتے ہیں۔ اسلام میں خوابوں کی تعبیر کا ملکہ ایک خاص عنایتِ خداوندی شمار کیا جاتا ہے اور یہ ملکہ انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے مشہور مثال سیدنا یوسفؑ کے قصے میں ان کے زندانِ مصر کے زمانے میں پیش آئی۔ قرآن مجید کی بارہویں سورت میں یہ قصہ آیا ہے اور قرآن مجید نے اسے ''احسن القصص'' (سب سے اچھا قصہ) کہا ہے۔ سیدنا یوسفؑ کا سارا معاملہ شروع ہی ایک خواب سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے سامنے سجدہ کرتے دیکھا۔ جب انہیں مصر میں اسیری سے رہائی ملی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے بادشاہ کے خواب کی صحیح تعبیر دی تھی۔ اس کے بعد جب انہوں نے مصر کو قحط کے چنگل سے بچا لیا اور اپنے خاندان کو بھی محفوظ کر لیا تب اللہ تعالیٰ نے ان کے خواب کے معنی ان

پر آشکار کیے۔ان کے والدین اوران کے گیارہ بھائی ان کے سامنے سجدۂ شکر کے لیے جھک گئے۔

بہت سی احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملکۂ تعبیرِ رویاء کا ذکر آیا ہے۔آپؐ کے صحابا اپنے خواب آپ سے بیان کیا کرتے اور آپؐ ان کے خوابوں کی تعبیر ان کو بتاتے۔

سو اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ خوابوں کی تعبیر کے علم کو اسلام میں ہمیشہ ایک مقبول علم کی حیثیت حاصل رہی ہے۔اسلام میں تعبیر رویاء یا خوابوں کے معنی بتانے کا علم کئی لحاظ سے خوابوں کی تعبیر کی آجکل کی مروجہ کتب اور نفسیات کی کتابوں میں پائے جانے والے طریقہ کار سے مشابہ ہے۔ہر دو میں اس تصور پر ہمیشہ زور دیا جاتا ہے کہ پردۂ خواب پر ہمارے ادراک میں آنے والا ہر عکس اور ہر شبیہ ایک علامت اور نشانی ہے کسی اور چیز کی جو اس علامت کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ خوابوں کی تعبیر کا سارا ہنر ہی یہ ہے کہ آپ یہ شناخت کرلیں کہ کسی خاص شبیہ یا عکس کے پردے میں اصل میں کیا چیز، کیا حقیقت نمودار ہو رہی ہے۔لیکن اس کام کے لیے تعبیر دینے والے کو عام انسانی نفسیات کا بھی بخوبی علم ہونا چاہیے اور اس شخص کے بارے میں خاص طور پر پتہ ہونا چاہیے جس کے خواب کی تعبیر کے لیے وہ کوشاں ہے۔

اسلامی روایت میں، آنحضرتؐ کے بعد جو لوگ تعبیرِ رؤیا کے مستند ماہر ہو گزرے ہیں ان میں بعض اہل اللہ اور مقدس ہستیاں شامل ہیں۔ عام طور پر یہ بات مانی جاتی ہے کہ انسانی نفسیات پر گرفت اور اس کا وافر علم ہر ایک کو عطا نہیں ہوتا۔آخر انسان صورتِ الٰہیہ پر بنا ہے، پس اگر خواب میں آنے والی شبیہوں کی صحیح

اور اصلی معنویت کا سمجھنا درکار ہو تو اس کے لیے تعبیر کرنے والے کے پاس خدا کا عطا کردہ علم ہونا ضروری ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک خاص حد تک ہر شخص فہم حاصل کر سکتا ہے۔ تعبیرِ رویاء کے علم کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ خواب میں نظر آنے والے عکس یا شبیہ اور اس چیز کے درمیان مناسبت اور رشتہ تلاش کیا جائے جس کی علامت کے طور پر یہ عکس پردۂ خواب پر نمودار ہوا ہے۔ خواب کی اگر صحیح تعبیر دینا ہو تو لازم ہے کہ پہلے ان اوصاف اور صفات کو سمجھا جائے جو خواب میں ابھر رہی ہیں اور پھر یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ان خاص اوصاف کا اس ''چیزے دگر'' سے کیا تعلق ہے، اس چیز کی صفات سے کیا نسبت ہے جو خواب دیکھنے والے کے آئینہ ادراک پر عکس تو ڈال رہی ہے لیکن خود اس کے دائرہ ادراک سے مخفی ہے۔

امام غزالی نے عکس و حقیقت اور پردۂ خواب پر ظاہر ہونے والے عکس کی صفات اور جس شے کی یہ علامت ہے اس کی صفات کے درمیان مناسبت تلاش کرنے کے بارے میں ایک مثال نقل کی ہے جو دوسری صدی کی مشہور شخصیت محمد بن سیرین (۱۱۱/۹۔۷۲۸) کے بارے میں بیان کی جاتی ہے۔ ایک شخص نے خواب دیکھا کہ اس نے ایک مہر والی انگوٹھی ہاتھ میں پہن رکھی ہے۔ مہر والی انگوٹھی خطوط پر مہر ثبت کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ لفافے پر پگھلی ہوئی موم ڈال کر انگوٹھی سے مہر لگا دی جاتی تھی۔ اگر مہر ٹوٹی ہوئی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ خط کو کھولا نہیں گیا۔

اس شخص نے خواب دیکھا کہ وہ خطوط کو مہر لگا کر لفافے میں بند کرنے کی بجائے لوگوں کو مہر بلب کر رہا ہے اور مردوں عورتوں کی شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے۔ وہ شخص ابن سیرین کے پاس آیا اور ان سے اپنے خواب کے معنی دریافت کیے۔

ابن سیرین نے جواب دیا کہ سیدھی صاف بات ہے۔تم مسجد کے مؤذن ہو اور رمضان شروع ہو چکا ہے۔خواب ایک مناسب صورت اور علامت میں یہ بتا رہا ہے تم صبح کی اذان دے رہے ہو۔ادھر تم نے اذان دی ادھر سب لوگوں کے لیے یہ اعلان ہو گیا کہ روزہ شروع ہوا اور اب کھانے پینے اور جنسی تعلقات سے رک جانا ہو گا۔

سرِ دست ہمارا موضوع خوابوں کی تعبیر نہیں ہے لہٰذا ہم مزید تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں نے خوابوں کو کس طرح سمجھا ہے۔اتنا عرض کرنے کا مطلب بھی صرف یہ تھا کہ یہ جان لیا جائے کہ مسلمان خواب اور اس کی علامتی معنویت سے بخوبی آگاہ تھے۔انہیں معلوم تھا کہ خواب کے معنی کو سمجھنا ہو تو اس کے ظاہر پر نہ جانا چاہیے بلکہ خواب میں نظر آنے والی شبیہ اور اس کے معنی، اس کی حقیقت کے مابین مناسبت اور معنوی رشتے کی تلاش کرنا چاہیے۔پردۂ خواب پر نمودار ہونے والا عکس اس معنی کی تجسیم ہوتا ہے۔اس طرح ہر مسلمان یہ بھی جانتا ہے کہ نیند اور موت کے درمیان ایک طرح کی مشابہت ہے۔اسی لیے بہت سے مسلمان مفکرین کے لیے یہ ایک سامنے کی بات ہے کہ موت کے بعد کے واقعات پر روشنی ڈالنا ہو، ان کی نوعیت کو سمجھنا ہو تو خوابوں کی ماہیت پر غور کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ خواب میں جس شبیہ یا عکس کا ہم ادراک کرتے ہیں اس میں اور اس معنی میں کیا تعلق اور مماثلت ہے جو اس شبیہ کے وسیلے سے نمودار ہو رہا ہے۔

## برزخ The Barzakh

ہم نے عرض کیا تھا کہ قبر انسان کے سفرِ ہستی کا ایک مرحلہ ہے۔یہ مرحلہ لمحۂ مرگ سے لے کر روزِ حشر تک پھیلا ہوا ہے۔قبر کو اکثر برزخ کا نام دیا گیا ہے۔

برزخ کے معنی ہیں ''رکاوٹ'' (barrier) یا ''ایسی چیز جو دیگر دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے''۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جہاں آیا ہے اس مقام سے اقتباس درج ذیل ہے:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۔ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَآئِلُھَا وَمِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۲۳:۹۹-۱۰۰)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ اے رب! مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں۔ ہرگز نہیں! یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہنے والا بنے گا اور آگے ان کے ایک پردہ ہوگا اس دن کے لیے جب وہ اٹھائے جائیں گے۔

دو اور آیات میں بھی قرآن نے کھارے اور میٹھے دو سمندروں کے درمیان حائل ہونے والے پردے، ان کے درمیان آنے والی روک کے لیے ''برزخ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَھُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا

(۲۵:۵۳)

اور وہی ہے جس نے ملایا دو دریاؤں کو۔ ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار اور دوسرے کا نہایت شور و تلخ۔ اور ان کے درمیان اس نے ایک پردہ اور ایک مضبوط بند کھڑا کر دیا۔

بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۵۵:۲۰)

لیکن ان کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے

بعض مفسرین قرآن نے لکھا ہے کہ یہاں ''بحرین'' (دوسمندر) علامت ہیں عالمِ ارواح کے لیے اور عالمِ اجسام کے لیے۔ یہ دو عالم سمندر سے مشابہ اس لیے ہیں کہ سمندر کی طرح ان میں بھی جانداروں کی اقسام، اتنی رنگارنگی اور اتنی کثیر تعداد پائی جاتی ہے جن کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں اور سمندر آخرالامر پانی ہے اور ''پانی سے ہم نے بنایا ہر جاندار'' وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱:۳۰) میٹھا پانی پاکیزگی ہے، صاف، شفاف، نورِ سیال، ملکوتی تازگی angelic freshness۔ کھارے پانی میں ہر طرح کی کثافت اور ناخالص چیزیں ملی رہتی ہیں جیسے وہ نہایت مدہم روشنی جو مادی اجسام کی دنیا میں منعکس ہوتی ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۳۵:۱۲)

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک شیریں، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے خوشگوار ہے اور ایک کھاری کڑوا ہے۔

اگر ''بحرین'' (دوسمندروں) کو روحوں اور اجسام کی طرف اشارے کے معنی میں لیا جائے تو پھر برزخ کیا ہوگی؟ ان دونوں کے درمیان کا ''عالمِ خیال'' World of Imagination جو دوسمندروں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتا ہے۔ لیکن خود اس برزخ میں تو میٹھے اور کھاری کا ملاپ ہوسکتا ہے۔ سو اسلامی فلسفے اور کونیات میں ''برزخ'' کا لفظ کسی بھی ایسی دنیا یا ایسی حقیقت کے لیے استعمال ہونے لگا جو دو دنیاؤں، دو اقالیم کے درمیان ہو۔

علمِ کونیات کے سیاق و سباق میں اس اصطلاح کے دو بنیادی معانی ہیں۔ کائنات کی دو تصویروں میں سے جو بھی پیشِ نظر ہو گی اسی کے مطابق اس کے معنیٰ کا تعین ہوگا۔

اگر اس کائنات پر زمانے اور وقت کے حوالے سے غور نہ کیا جائے اور اسے ایک غیر حرکی، سکونی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ نورِ محض سے لے کر درجہ بدرجہ ظلمت و تاریکی تک کا منظر نامہ دکھائی دے گا۔ عالمِ خلق کے مراتب میں سب سے اوپر خلق کردہ نورِ محض یا نورِ خالص کا عالم ہے جو فرشتوں، ارواح اور عقول کا مسکن ہے۔ سب سے نیچے وہ دنیا ہے جو قریب قریب ظلمتِ محض کی اقلیم ہے، یہ عالمِ اجسام ہے۔ ان دو کے درمیان ایک بہت وسیع دنیا آباد ہے جس میں، جن، شیطان اور نفوس رہتے ہیں۔ یہ درمیانی عالم، کائناتِ خیال یا برزخ ہے کیونکہ یہ عالمِ روحانی کے بحرِ شیریں اور مادی دنیا کے کھارے سمندر کے درمیان ایک فصیل اور روک کا کام کرتا ہے۔ یا پھر اس لیے کہ ان میں سے ہر دو کے اوصاف اور خصوصیات اس میں بھی پائی جاتی ہیں۔

اگر اس کائنات پر زمانی اعتبار سے غور کیا جائے اور اسے ایک حرکی تناظر میں دیکھا جائے تو ہمارے سامنے دو عالم ہوں گے، دو جہان ہوں گے۔ یہ دنیا اور اگلا جہان۔ یہ دنیا، یہ جہان سیدنا آدمؑ کے زمانے سے لے کر روزِ قیامت تک جاری رہے گا اور اس روز اگلے جہان کا آغاز ہوگا۔ لیکن پھر یہ بتانا ہوگا کہ وہ لوگ جو موت کے گھاٹ اترے وہ کہاں ہیں، اس دنیا میں یا اگلے جہان میں؟ اکثر اوقات اس کا جواب ہوتا ہے نہ یہاں نہ وہاں۔ مرنے والے برزخ کے مکین ہو جاتے ہیں جو اس دنیا کی ناخالص اور دھندلی اقلیم (کھارا سمندر) اور نور کی اقلیم خالص (بحرِ شیریں)

یعنی اگلے جہان کے درمیان کا ایک مرحلہ ہے۔ اس تفسیر کی تائید اور دلیل میں مفسرین نے مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت پیش کی ہے "ومن وراء ھم برزخ الی یوم یبعثون" (۲۳:۱۰۰)۔

جن مفکرین نے عالمِ برزخ کی خصوصیات اور اس کی نوعیت پر بحث کی ہے ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ خیال کا عالم ہے Imaginal World۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ نفس کو برزخ میں جو کچھ پیش آتا ہے اس کا سامنا اسے ایک ایسی صورت میں کرنا ہوتا ہے جو عالمِ برزخ سے مناسبت رکھتی ہے اور جو نہ تو خالص روحانی ہوتی ہے اور نہ پوری طرح مادی اور ٹھوس صورت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں نفس کی نشوونما جن اعمال، افکار اور صفات و اوصاف کی آغوش میں ہوئی تھی برزخ کے احوال اور برزخ کا تجربہ عین اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ "خیال" کی حرکی اور ہر دم متغیر نوعیت کے پیشِ نظر یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ برزخ ایک جامد اور متعین حالت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک سیلانِ پیہم ایک مسلسل بہاؤ ہے، ہر لحہ بدلتے ہوئے تجربات کا ایک دریائے رواں۔

ان باتوں کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد نفس اپنے آپ کو ان صورتوں میں پاتا ہے، ان تجربات سے گزرتا ہے جو اس کی نوعیت، اس کی ماہیت سے مناسبت رکھتے ہیں۔ لیکن موت کے بعد نفس کی ماہیت اور نوعیت کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کی نشوونما کیونکر ہوئی تھی۔ اگر نفس کی پرورش سرشت و نہادِ انسانی (الفطرت) کے مطابق ہوئی تھی اور اس میں وہ سب صفاتِ خداوندی رچ بس چکی تھیں جو صورتِ الٰہی پر خلق ہونے کی وجہ سے اس کے اندر مخفی تھیں، اس میں رکھی گئی تھیں تو پھر برزخ میں بھی نفس کو صحت، توازن، تناسب

، یکتائی اور یکجائی کی حالت میسر ہو گی۔ بالفاظِ دگر نفس کی پرداخت ''توحید'' کے مطابق ہوئی ہو گی۔

اس کے برعکس اگر نفس کی زندگی انکارِ حق میں، کتمانِ حق میں بسر ہوئی ہو گی اور اس نے الحق سے سازگاری اور اس کے مطابق خود کو ڈھالنے سے روگردانی کی ہو گی تو پھر ایسا نفس وحدت و یکرنگی سے دور ہو گا۔ اس میں چند صفاتِ خداوندی تو جزوی طور پر نمودار ہوئی ہوں گی لیکن باقی صفات مرجھا کر رہ گئی ہوں گی۔ یہ نفس ایسا ہو گا جو، آشفتگی، بکھراؤ، وحشت اور بے ترتیبی کا شکار ہو گا۔ بالفاظ دگر اس پر حقیقت کے روحانی پہلو (بحرِ شیریں) کا غلبہ ہونے کے بجائے اس کے جسمانی پہلو (کھارے سمندر) کا غلبہ ہو گا۔

نفس کی حالت کے بیان کے لیے ہم نے جو الفاظ ہم آہنگی، توازن، یکرنگی و وحدت وغیرہ استعمال کیے ہیں وہ ذرا مجرد قسم کے ہیں۔ ان کے ٹھوس معنی کیا ہیں؟ ان سے ہماری مراد کیا ہے؟ نفس کو مرنے کے بعد اصل میں کس چیز کا سامنا ہو گا؟ اس کو پیش آنے والے واقعات کیا ہوں گے؟ اسلامی روایت کا جواب یہ ہے کہ موت کے بعد کے عالم میں روحانی اور مادی تجربہ مل کر ایک ہو جاتا ہے جیسا کہ عالمِ خواب میں ہوتا ہے۔ خواب دیکھتے ہوئے بھی بدن اور نفس میں امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہے کیونکہ خواب کے سارے عکس اور شبیہیں بیک وقت جسمانی بھی ہوتی ہیں اور نفسیاتی بھی۔ ہم اپنی نفسیاتی کیفیات اور احوال کو ایک مادی اور محسوس صورت میں ''دیکھتے'' بھی ہیں اور ان کا ''تجربہ'' بھی کرتے ہیں۔ عین یہی نوعیت ''خیال'' کی بھی ہے۔ برزخ میں ہم آہنگی یا راحت کا تجربہ کسی مجرد، نامجسم ملکوتی صفت کے طور پر نہیں ہو گا بلکہ اس کا انداز ویسا ہی ہو گا جیسا اس ہماری دنیا میں ہوتا ہے۔ کسی خوشنما

اور حسین باغ میں گھومتے ہوئے، خوبصورت چہرے کا مشاہدہ کرتے ہوئے، اچھی موسیقی پر سر دھنتے ہوئے۔

خیال کا عالم، نفس کا عالم ہے بلکہ کچھ لوگ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ نفس سے سوا اور کچھ نہیں۔ نفس کے سارے حواس ہوتے ہیں۔ دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا اور چھونا۔ یہ خیال غلط ہے کہ دیکھنے اور سننے کے لیے نفس کو جسم کی آنکھ اور جسمانی کان درکار ہیں۔ خواب کی دنیا میں نفس کان اور آنکھ کے بغیر بخوبی دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ اسی طرح عالمِ برزخ میں بھی نفس کو اپنی حقیقت کا تجربہ ایک محسوس صورت میں تو ہوتا ہے لیکن یہ تجربہ جسمانی اعضاء اور حواس کے بغیر ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، برزخ میں ''جیسا لگتا ہے'' وہی سب کچھ ہوتا ہے۔ نفس اگر پورا، مکمل اور ہم آہنگ ہے تو اسے برزخ کا ادراک بھی تکمیل اور ہم آہنگی کی صورت میں ہوگا۔ لیکن اگر نفس پارہ پارہ اور بکھرا ہوگا تو اسے برزخ کا تجربہ بھی جزوی اور پراگندہ ہوگا۔ نفس کی حقیقت جس قدر آشفتہ اور بگڑی ہوئی، مسخ شدہ ہوگی اسی قدر اسے اپنا برزخ کا ''عالِم خواب'' ہولناک محسوس ہوگا۔

بعض علماء کی رائے یہ بھی ہے کہ برزخ اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفس کا اندرون، اس کا باطن نکل کر باہر آ جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس دنیا میں بدن ظاہر کی چیز ہے اور نفس مخفی ہے۔ بدن نسبتاً پختہ اور متعین بھی ہے جبکہ آگہی کا عمل دم بہ دم بدلتا رہتا ہے۔ ہر لحظہ ذہن میں سوچیں آتی ہیں اور جاتی ہیں، خیالات کی آمد و رفت میں ہمارے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ سوچ اور خیالات کیا ہیں، ہم ہی ہیں۔ بالکل ایسے جیسے خواب میں نظر آنے والی شبیہیں ہمارے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

وہ صفات جو اس دنیا میں بدن سے خاص تھیں، برزخ میں جا کر گویا ان کا رخ اندر کی جانب ہو جاتا ہے جہاں وہ اس ہستی کے اندرونی مرکز میں نسبتاً ایک معین اور مستقل چیز کی نمائندگی کرتی ہیں۔لیکن نفس کا اندرون خارج میں آ جاتا ہے اور ان صورتوں میں مجسم ہو جاتا ہے جو اس کی اپنی نوعیت سے مناسبت رکھتی ہیں۔نفس کا اپنا ادارک شبیہوں اور عکس کی ایک دنیا کی صورت میں ہوتا ہے جیسا کہ خواب کے عالم میں ہوتا ہے۔برزخ اور عالمِ خواب میں ایک بڑا فرق ہے اور وہ یہ کہ برزخ اس عالم کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقی اور مستقل ہے۔عالمِ برزخ میں داخل ہوں گے تو لوگوں کو احساس ہوگا کہ جس دنیا میں وہ رہتے آئے تھے وہ ایک خواب کی دنیا تھی۔یہی اس مشہور قول کا مطلب ہے جس کی اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی جاتی ہے "الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا" ۷ے (لوگ سو رہے ہیں، موت آن لے گی تو جاگیں گے)۔قرآن بھی یہی بات اس آیت میں کہتا ہے جہاں یہ ذکر آیا ہے کہ جو لوگ مر جاتے ہیں ان کی نظر "چیر جانے والی" بن جاتی ہے "وَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ" (۵:۲۲) (تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے)

برزخ کے عالمِ خیال ہونے کے بارے میں قرآن مجید نے کئی جگہ اشارات کیے ہیں لیکن ان کو سمجھنے کے لیے اسلامی روایت کی فراہم کردہ بصیرت کی ضرورت پڑتی ہے۔تاہم اس ضمن میں قرآن کی نسبت احادیث میں کہیں زیادہ کھل کر وضاحت کی گئی ہے۔مرنے کے بعد کے واقعات کے بارے میں رسولِ خداؐ نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں سے کئی احادیث کو صرف ایک ایسی اقلیمِ خیال کے بیان کے طور پر سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے جہاں انسان کا ہر تجربہ اور پیش آنے والا ہر واقعہ اس کے اپنے اعمال و افکار سے مناسبت رکھتا ہے۔

اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ بے دھیانی سے پڑھی ہوئی نماز پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر انسان کے منہ پر مار دی جائے گی۔سرکشوں کے اعمال کتوں کی صورت اور شک وشبہ میں پڑے ہوئے انسانوں کے عمل سُوروں کی شکل میں نمودار ہوں گے۔قبر میں کارِخیر کشتیوں کی صورت میں مجسم ہو جائیں گے جس میں لوگ بیٹھیں گے۔شراب نوشی کرنے والوں کی گردنیں شراب کے مٹکوں کے وزن سے جھکی پڑرہی ہوں گی جوان کے گلے میں لٹکا دیئے جائیں گے۔"کافر کی کچلی احد پہاڑ کی طرح ہوگی اوراس کی چمڑی اس قدر موٹی ہوجائیگی کہ تین رات کی مسافت میں پار کی جائے۔"۸ے "کافر اپنی زبان میلوں کھینچے گا، یوں کہ لوگ اسے روندتے ہوئے گزریں گے۔"۹ے

انسان کے اعمال وافکار کی کسی مناسب صورت میں یہ تجسیم کچھ برزخ سے خاص نہیں ہے۔بہت سی روایات میں آیا ہے کہ یہی صورت قیامت کے دن بھی واقع ہوگی۔اسی طرح جنت کے مزے اور جہنم کا عذاب بھی عالمِ خیال سے مناسبت رکھنے والی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔متاخرین میں سے کئی مسلم مفکرین نے جنت اور جہنم کو عالمِ خیال ہی میں رکھا ہے اوراس کا نقشہ ایک بے انتہا وسیع عالم کے طور پر کھینچا ہے۔اس طرح برزخ "خیال" کی صرف ایک صورت ٹھہری۔ایک عارضی صورت جوصرف قیامت تک باقی رہے گی۔

## فرشتوں کا سامنا Meeting the Angels

اس بحث کو سمیٹنے کے لیے اور یہ سمجھانے کے لیے کہ رسولِ خداؐ نے جوطرزِ بیان استعمال فرمایا ہے اسے عالمِ خیال کے حوالے کے بغیر سمجھنا مشکل ہے،ہم مندرجہ ذیل حدیث کی جانب توجہ دلائیں گے۔حدیث خاصی طویل ہے لیکن اس اقتباس

سے ہمیں یہ آسانی ہو جائے گی کہ قبر کے بارے میں مسلمانوں کے بنیادی عقائد ایک منطقی اور مرتب شکل میں سامنے آ جائیں گے۔ کہیں کہیں ہم اپنا تبصرہ بھی کر دیں گے تا کہ قاری پر واضح ہو جائے کہ سابقہ بحث سے اس اقتباس کا ربط کیا ہے۔

اگلے جہان کے بارے میں دیگر کئی احادیث کی طرح اس حدیث میں بھی دو بیانات برابر برابر آئے ہیں۔ پہلا ایک صاحبِ ایمان کے نفس کا ہے اور دوسرا ایک کافر کا۔ واقعات ایک سے ہیں لیکن مومن کو اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ کی رحمت اور جمال نصیب ہوتا ہے جبکہ کافر کو اللہ کے بائیں ہاتھ کے غضب و انتقام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اول الذکر نفس اللہ کے قرب میں لے آیا جاتا ہے جبکہ دوسرے کو دوری نصیب ہوتی ہے۔ پہلے نفس کا تجربہ خوشی، رحمت اور تکمیل کا ہوتا ہے جبکہ دوسرے پر جو گزرتی ہے وہ اس کے لیے آشفتگی اور بدحالی پیدا کرتی ہے۔ دو متضاد صفاتِ خداوندی جن کا اس حدیث میں ذکر آیا ہے رضائے الٰہی Good Pleasure اور غضب Anger کی صفات ہیں۔ اس حدیث سے اس امر کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ رسولِ خداؐ یہ دعا کیوں مانگا کرتے تھے کہ ''میں تیرے غضب سے تیری رضا کی پناہ میں آتا ہوں''

حدیث کے شروع میں وہ صحابی جو اس حدیث کے راوی ہیں بتاتے ہیں کہ وہ دیگر صحابہ کے ساتھ آنحضرتؐ کی معیت میں ایک جنازے کے ساتھ گئے۔ قبر کھودنے والوں نے ابھی اپنا کام مکمل نہیں کیا تھا۔ سب لوگ انتظار میں بیٹھ رہے۔ کچھ دیر بعد رسولِ خداؐ نے سر اٹھا کر فرمایا ''قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو''۔ آپؐ نے دو یا تین مرتبہ اس بات کو دہرایا۔ اس کے بعد آپ گویا ہوئے: ۸۰ے

جب بندۂ مومن اس دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے اور اس کا رشتہ اس دنیا سے کٹ

کر دوسرے جہان سے جڑ تا ہے تو اس پر آسمان سے فرشتے اتر تے ہیں۔ ان کے چہرے سفید ہوتے ہیں، سورج کی طرح چمکتے ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ جنت کے ملبوسات میں سے ایک اور وہاں کی خوشبو میں سے ایک لے کر آتے ہیں۔ تا حدِ نظر وہ اس شخص کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں پھر فرشتۂ اجل آ کر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''اے نفسِ مطمئنہ، اللہ کی رضا اور اس کی مغفرت کے لیے نکل آ''۔ اس شخص کی جان یوں نکلتی ہے جیسے مشکیزے سے پانی کا قطرہ۔ موت کا فرشتہ اسے لے لیتا ہے۔ دوسرے فرشتے اس راضی و مطمئن نفس کو لمحہ بھر کے لیے بھی فرشتہ اجل کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے اور اسے فوراً اس میں لپیٹ کر اس خوشبو میں بسا دیتے ہیں جو اس دنیا کی عمدہ ترین مشک کو مات کرتی ہے۔

پھر وہ اسے اوپر لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کے جس مجمع کے پاس سے وہ گزرتے ہیں وہ یہ ضرور پوچھتا ہے کہ ''یہ اتنی اچھی خوشبو کیا ہے''؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ ''یہ فلاں ابن فلاں ہے''۔ اسے وہ ان بہترین ناموں سے پکارتے ہیں جن سے اس دنیا میں اسے یاد کیا جاتا تھا۔ جب وہ آسمانِ دنیا پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے لیے دروازے کھول دیے جائیں۔

اس کے لیے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ پھر ہر آسمان پر مقرب فرشتے اس کے ساتھ چلتے ہیں اور اگلے آسمان تک لے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ ساتویں آسمان تک لے جایا جاتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''میرے بندے کا اعمال نامہ علیین میں لکھواور اسے واپس زمین پر لے جاؤ جس سے میں نے اسے خلق کیا تھا۔ اسی کی طرف میں لوٹا دیتا ہوں اور وہیں سے میں انہیں دوسری مرتبہ اٹھاؤں گا''۔

پھراس کی روح اس کے جسدِ مردہ کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔دوفرشتے اسے آ کر پوچھیں گے ''تمہارا رب کون ہے''؟وہ کہے گا''میرا رب اللہ ہے''۔پھر وہ کہیں گے''تمہارادین کیا ہے''؟وہ جواب دے گا''اسلام''پھروہ کہیں گے کہ''تم میں کون مبعوث کیا گیا تھا''؟وہ کہے گا''وہ اللہ کا رسول ہے''۔پھر پوچھا جائے گا''تمہارا علم کیا ہے''؟وہ جواب میں کہے گا کہ''میں نے کتابِ خداوندی پڑھی ہے اورمیرا اس پر ایمان ہے اورمیں اس کی حقانیت کی تصدیق کرتا ہوں''۔

پھر آسمان سے ایک اورندا دی جائے گی کہ''میرے بندے نے سچ کہا جنت سے ایک قالین اس کے لیے اتارا جائے،اسے بہشتی لباس پہنایا جائے اوراس کی قبر میں جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جائے''۔پھر جنت کی راحت اوراس کی مہک کچھ کچھ اس تک پہنچنے لگتی ہے اوراس کی قبر وہاں تک وسیع کردی جاتی ہے جہاں تک اس کی نظر جاسکتی ہے۔

پھرایک شخص اس کے پاس آئے گا،حسین چہرہ،لباس زیبا اورعطر خوشگوار۔وہ کہے گا ''میں تجھے وہ خوشخبری دوں گا جو تجھے نہال کردے گی۔آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ تھا''۔

وہ پوچھے گا،''تم کون ہو؟ کہ تمہارا چہرہ بشارت دینے والے کا چہرہ ہے''۔وہ کہے گا ''میں تمہارا کارِخیر ہوں،عملِ صالح''۔

وہ مرد درگذشتہ کہ اٹھے گا''میرے پروردگار،اب قیامت آجائے،یارب اب قیامت آجائے کہ میں اپنے خاندان اوراپنے مال واسباب میں لوٹ جاؤں''۔

اس حدیث میں نفسِ صالح کی جو خصوصیات بتائی گئی ہیں ان پر غور فرمائیے۔

نورانیت کے جلو میں فرشتے اس کے لیے اترتے ہیں، گویا سورج نکل رہا ہو اور اپنے ساتھ جنت سے ایک لبادہ اور ایک خوشبو لاتے ہیں۔فرشتۂ اجل ایسے نفس سے خطاب کرتے ہی اسے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رضا کی خوشخبری دیتا ہے۔یہ دونوں صفات اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت و جمال میں سے ہیں۔پھر فرشتے اس نفس کو ساتھ لائے ہوئے بہشتی لبادے میں لپیٹ دیتے ہیں۔اس طرح نفس کے جسمانی پہلو چھپ جاتے ہیں کہ یہ جسمانی پہلو ملکوتی اور جنتی نورانیت کے مقابل تاریک اور بے کیف ہیں۔

یہ فرشتے اس نفس کو جنت کی مہک میں بسا دیتے ہیں۔خوشبو لگانے کے اس عمل کی معنویت کو سمجھنا ہو تو اسلامی شعور میں عطر اور اچھی خوشبو کی جو اہمیت ہے اسے یاد کیجیے۔مثال کے طور پر رسولِ خدا ؐ پیاز اور لہسن نہیں کھاتے تھے گو اس کا استعمال آپ ؐ نے ممنوع نہیں کیا تھا۔آپ ؐ کا ارشاد تھا کہ فرشتے اس کی بو سے کراہت کرتے ہیں۔آپ ؐ کا ایک معروف قول ہے جس میں آپ ؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کی تین چیزوں کی پسندیدگی آپ ؐ کے دل میں ڈالی: عورت، خوشبو اور نماز۔۸۱ اسلامی راویت میں محبت کا مقصود ہمیشہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو مرقعِ جمال ہوں، حسین ہوں، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے "اللہ جمیل و یحب الجمال" (اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال پسند ہے)۔جو تین چیزیں آنحضرت ؐ کے لیے محبوب بنائی گئیں وہ اس دنیائے دنی کے سب سے حسین و جمیل اور بنا بریں سب سے زیادہ الوہی عناصر کی نمائندگی کرتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے جمال، رحمت اور عفوو درگزر کی صفات کا اس دنیا میں اگر سب سے واضح اور براہ راست مظہر ہے تو نسوانی حسن۔خوشبو وہ لطیف اور غیر مرئی حسن ہے جو عالمِ خیال اور عالمِ روحانی میں سرایت کیے ہوئے

ہے۔ نیز یہ کہ خوشبو اپنے ساتھ جنت کی خوشی اور راحت کا ایک احساس بھی لاتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اکثر خوشبویات پھولوں سے کشید کی جاتی ہیں اور آنحضرتؐ کی مرغوب خوشبو عطرِ گلاب بتایا گیا ہے۔ تیسری چیز یعنی نماز جو آپؐ کے لیے محبوب بنائی گئی، علامت ہے قرآن کے مجسم ہو جانے کی یا حسنِ عمل اور حسنِ کردار و اخلاق کی نمائندہ۔

تین محبوب چیزوں کے بارے میں جو حدیث ہم نے درج کی اس میں خوشبو کے لیے ''طِیب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح پہلے مذکور ہونے والی طویل حدیث میں نفسِ سلیم کے لیے، اچھے نفس کے لیے ''طیّب'' کا لفظ آیا ہے جو ''طِیب'' ہی کی ایک صورت ہے اور بطور اسمِ صفت برتا گیا ہے۔ نفسِ سلیم شروع ہی سے ''طیّب'' ہے جس کا مطلب ہے ''خوشبو دار، پرکشش، خوشگوار، اچھا اور خوبصورت'' ۔ اس کے حسن وخوبی کا اقلیمِ خیال میں ادراک دیکھنے کی حس بھی کرتی ہے اور قوتِ شامہ بھی کیونکہ لبادہ اور خوشبو جو فرشتے ساتھ لے کر آتے ہیں اسی پر دلالت کر رہے ہیں۔ یہ اس دنیا کا کپڑا اور یہاں کی خوشبو نہیں ہے بلکہ جنت سے لائے گئے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس نفس کو فرشتوں نے خوبصورت کیوں جانا ہے۔

فرشتے سوال کرتے ہیں کہ ''یہ اتنی اچھی خوشبو کیسی ہے؟'' یہاں خوشبو کے لیے لفظ ہے ''رَوح'' ۔ ''رَوح'' اور ''رُوح'' کی املا ایک سی ہے اور رُوح کے معنی آپ جانتے ہیں۔ یہاں ''رَوح'' کا لفظ خود بول رہا ہے کہ یہ خوشبو کوئی دنیاوی خوشبو نہیں ہے۔ بلکہ ایک ملکوتی اور روحانی مہک ہے جو آسمانوں یعنی عالمِ بالا ہی کے لیے زیبا ہے۔

فرشتے اس نفسِ سلیم کو ایک ''معراج'' پر لے جاتے ہیں اور اس کا راستہ وہی

ہے جو رسول خداؐ کی معراج کا تھا۔ اگر آنحضرتؐ نے اس زندگی ہی میں آسمانوں کا سفر فرمایا تو اہل ایمان سے وعدہ یہ ہے کہ وہ موت کے بعد آسمانوں کی جانب عروج کریں گے۔ آسمانوں سے آگے بڑھ کر اہلِ ایمان قربِ خداوندی میں پہنچتے ہیں۔ اللہ سے قریب ہونے کا مطلب ہے الحق کے، الاحد کے، الکامل، النور اور الجمیل کے قریب ہونا۔ ان صفات سے جو نفس قریب ہوگا وہ ان میں سے حصہ پائے گا اور اس طرح وہ صفاتِ خداوندی، وہ صورتِ الٰہیہ جس پر نفسِ انسانی خلق کیا گیا، زیادہ مکمل طور پر حقیقی اور واقعی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

اچھے اور نیک لوگوں کے اعمال "علیّون" میں درج کیے جاتے ہیں۔ اسے عموماً ساتویں آسمان میں ایک جگہ یا کتاب کے طور پر لیا جاتا ہے۔ "علیّون" کے لفظی معنی "اقلیم بالا" یا "بلند ترین مقامات" کے مترادف ہیں۔ خود یہ لفظ "علی" سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے "اونچا، بلند و بالا" اور "العلی" اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک ہے۔ اس سے یہ اشارہ بالکل واضح ہے کہ اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ سے کسی نہ کسی صورت میں قرب۔

اس حدیث کے پہلے حصے کے آخر میں رسولِ خداؐ کا ایک قول آیا ہے جس میں اس نکتے کی صراحت آپؐ کے ارشاد سے ہوگئی ہے کہ اس دنیا میں انسان کے کیے ہوئے عمل عالمِ خیال سے مناسبت رکھنے والی ایک صورت میں مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔ مرنے والے کو ایک شخص کی صورت دکھائی دے گی جو خوشرو اور خوش لباس ہوگا اور اس کے پاس سے اچھی خوشبو پھوٹ رہی ہوگی۔ پوچھے گا تو پتا چلے گا کہ اس کے اپنے اعمال اس صورت میں مجسم ہو کر نمودار ہوئے ہیں۔ عمر بھر جو کارِ خیر اس نے انجام دیا وہ ایک ایسی صورت میں اس کے سامنے لے آیا گیا جو برزخ میں

اس کی حالت سے مناسب رکھتی ہے۔

حدیث کے دوسرے حصے میں رسولِ خداؐ نے ایک منکرِ حق، کافر کی موت کا منظر بیان کیا ہے۔غور فرمائیے کہ حدیث کے الفاظ اور اندازِ بیان تقریباً یکساں تاہم سبھی اسمائے صفت بدل گئے ہیں کیونکہ حق کے انکار میں گڑا ہوا یہ نفس ایک مومن، ایک صاحبِ ایمان کے نفس کی ہر لحاظ سے سراسر ضد ہے، اس کا بالکل الٹ ہے۔ آغازِ کلام ہی میں نفس کو ''نفسِ خبیث'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو ''نفس طیّب'' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔مسلمان جب اس حدیث کو پڑھتے ہیں تو ان کا ذہن فوراً ان متعدد قرآنی آیات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن میں ''طیّب'' اور ''خبیث'' کا تقابل کیا گیا ہے۔مندرجہ ذیل آیت بالخصوص قابل ذکر ہے:

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ أُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (٨:٣٧)

تا کہ اللہ خبیث کو طیب سے چھانٹ کر الگ کرے اور خبیث کو ایک دوسرے پر ڈھیر کرے، پھر اس کو جہنم میں جھونک دے۔یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔

قبر کے احوال کی حدیث کا باقی حصہ یوں ہے:

جب بندۂ کافر اس دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے اور اس کا رشتہ اس دنیا سے کٹ کر دوسرے جہان سے جڑتا ہے تو اس پر آسمان سے فرشتے اترتے ہیں۔ان کے چہرے سیاہ ہوتے ہیں، وہ اپنے ساتھ کھردرے کپڑے کے ٹکڑے لے کر آتے

ہیں ۔تا حدِ نظر وہ اس شخص کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں پھر فرشتۂ اجل آ کر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ''اے نفسِ خبیث اللہ کے غضب کے لیے نکل آ ''۔اس شخص کی جان سارے بدن میں بکھر جاتی ہے ۔مگر موت کا فرشتہ اسے یوں کھینچتا ہے جیسے گیلی روئی میں سے سوا۔موت کا فرشہ اسے نکال لیتا ہے ۔دوسرے فرشتے اس نفسِ خبیث کو لمحہ بھر کے لیے بھی فرشتہ اجل کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے اور اسے فوراً اس کھردرے کپڑے میں لپیٹ دیتے ہیں ۔اس سے سڑی ہوئی لاش کی بدترین بدبو پھوٹتی ہے ،ایسی ناگوار کہ اس جیسی کریہ بدبو اس روئے زمین پر اور کہیں نہ ہوگی ۔پھر وہ اسے اوپر لے جاتے ہیں ۔فرشتوں کے جس مجمع کے پاس سے وہ گزرتے ہیں وہ یہ ضرور پوچھتا ہے کہ ''یہ مکروہ تعفّن کیا ہے''؟وہ جواب دیتے ہیں کہ ''یہ فلاں ابن فلاں ہے''۔اسے وہ ان نفرت انگیز ناموں سے پکارتے ہیں جن سے اس دنیا میں اسے یاد کیا جاتا تھا۔جب وہ آسمانِ دنیا پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے لیے دروازے کھول دیئے جائیں ۔

اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا ۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اس کا اعمال نامہ سجّین میں لکھو،زمین کے سب سے پست درجے میں''پھر اسے اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے ۔

پھر اس کی روح اس کے جسدِ مردہ کی طرف لوٹا دی جاتی ہے ۔دو فرشتے اسے آکر پوچھیں گے ''تمہارا رب کون ہے''؟وہ کہے گا ''آہ،آہ مجھے تو پتہ نہیں''۔پھر وہ کہیں گے ''تمہارا دین کیا ہے''؟وہ جواب دے گا ''آہ،آہ مجھے تو پتہ نہیں''پھر وہ کہیں گے کہ ''تم میں کون مبعوث کیا گیا تھا''؟وہ کہے گا ''آہ،آہ مجھے تو پتہ نہیں''۔

پھر آسمان سے ایک اور ندا دی جائے گی کہ "اس نے جھوٹ بولا، سو جہنم سے ایک قالین اس کے لیے بچھا دو اور اس کی قبر میں دوزخ کا ایک دروازہ کھول دو"۔ پھر دوزخ کی آگ کی لپٹ اور جھلستی ہوا اسے آن لے گی اور اس کی قبر ایسی تنگ کر دی جائے گی کہ اس کی پسلیاں بھنچ کر رہ جائیں گی۔

پھر ایک شخص اس کے پاس آئے گا، بدصورت، لباس بدنما، ناگوار بدبو لیے ہوئے۔ وہ کہے گا "میں تجھے وہ خبر دوں گا جو تجھے بدحال کر دے گی۔ آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ تھا"۔

وہ پوچھے گا، "تم کون ہو؟ کہ تمہارا چہرہ منحوس خبر دینے والے کا چہرہ ہے"۔ وہ کہے گا "میں تمہاری برائی ہوں، تمہارے اعمالِ بد"۔

وہ مردِ درگذشتہ کہ اٹھے گا "میرے پروردگار، قیامت سے بچائیو۔ قیامت آ ہی نہ جائے"۔

قرآن مجید نے کائنات کا جس طرح نقشہ پیش کیا ہے وہی اس حدیث کی اکثر تفصیلات میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ کافر کو پہلے آسمان میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔ یہاں آسمان اور جنت کو خلط ملط نہ کیجیے۔ یہ درست ہے کہ حدیث میں جنت اور جہنم کا تذکرہ موجود اور حقیقی چیزوں کے طور پر کیا گیا ہے لیکن یہاں ان کے محلِ وقوع کو متعین نہیں کیا گیا۔ "توحید پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ "آسمان" ہر اس شے کی طرف اشارہ ہے جو اونچی، بالاتر، نورانی، روحانی، ذی عقل اور اچھی ہے۔ وہ اشیائے بلند و بالا جو ان آسمانوں میں ہیں ان کے کئی درجات ہیں، سات آسمان اسی کی علامت ہیں۔ ان

سب آسمانوں سے وراء اور ان سے باہر اللہ تعالیٰ ہے اور اصل بلندی اور عالی مرتبہ اسی کا ہے۔ اہلِ ایمان کے نفوس موت کے بعد آسمانوں میں اس لیے اٹھائے جاتے ہیں کہ انہوں نے اس دنیا کی زندگی میں آسمانی چیزوں کے اوصاف اور صفات کو اپنے اندر واقعی بیدار اور راسخ کر لیا تھا اور یہ وہی صفات تھیں جو اس روح کی صفات ہیں جسے خاکِ آدم میں پھونکا گیا تھا۔

اس کے برعکس کافروں کے نفوس آسمان میں نہیں اٹھ سکتے۔ بلکہ ان کو ''سجّین'' میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ''علّیین'' کے لفظ کی طرح ''سجّین'' کے لفظ کی بھی کئی تفاسیر کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں کافروں کی کتابِ عمل رکھی جاتی ہے، یا جہنم کی ایک گھاٹی ہے، یا ساتویں زمین کے نیچے شیطانوں اور ابلیس کی آماجگاہ ہے۔ ''سجّین'' کے لفظ کے معنی ہیں ''محبوس کرنا' قید میں ڈالنا''۔ ''علّیین'' کی بلند اقلیم آزادی اور تکمیلِ آرزو کا مقام ہیں، ''سجّین'' کی اقلیمِ پست قید و بند اور صعوبت و تکلیف کی جگہ ہے۔ ایک اور بات پر غور فرمائیے۔ کافر یہ کہتا ہے کہ وہ نہ خدا کو جانتا ہے نہ کتابِ خدا کو، نہ رسول خداؐ کو۔ جواب ملتا ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قبر میں پڑنے کے بعد بھی حق کو چھپا رہا ہے، کفر کر رہا ہے۔

## روزِ جزاء Final Judgment

اللہ کی طرف لوٹنے یعنی ''معاد'' کے بارے میں قرآن مجید نے جو کچھ کہا ہے اس کی تہ میں ایک تصورِ مستقل کارفرما ہے کہ انسان کو بالآخر ایک روز اپنے آخری حساب کے لیے حاضر ہونا ہے اور اس بات کی جوابدہی کرنی ہے کہ وہ اس دنیا میں کیا کرتا رہا۔ اس سے اس کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسے جوابدہی

کرنا ہوگی جب اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ تم جو کچھ کرتے رہے وہ کیوں کرتے رہے؟ جیسا کہ آنحضرتؐ کے صحابی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تھا، لوگوں سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے ''کیا'' کیا۔ اعمال تو ان کے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے موجود ہوں گے جو وہ پڑھ سکتے ہیں۔ ان سے پوچھا یہ جائے گا کہ جو کچھ کیا وہ ''کیوں'' کیا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پرسشِ اعمال کرنے کے بعد ان کے اعمال کو میزان میں تولیں گے۔ اس کے بعد اللہ کا فیصلہ سامنے آئے گا۔ کچھ لوگ جنت میں بھیج دیئے جائیں گے کچھ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ بہت سے جدید لوگوں کو حساب کتاب، اللہ کا فیصلہ اور لوگوں کو آگ میں جھونکنے کا یہ سارا معاملہ خاص طور پر شاق گزرتا ہے۔ سامی ادیان کے نقطۂ نظر کے مقابلے پر ہندو یا بدھ مت کے تناظر کو ترجیح دینے کی عام طور پر جو وجوہات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ موخرالذکر مذاہب میں انسان کی تقدیر کا فیصلہ کسی من مانی کرنے والی، متلون مزاج الوہی ہستی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ ''کرموں'' Karma کے تصور کے تحت ہر مرد و زن اپنے کیے کا خود ذمہ دار اور اس کے بھگتنے پر مجبور ہے۔

قرآن مجید میں جو خدا ہم سے کلام کرتا ہے وہ بلا شبہ ایک موجود فی الخارج ذات ہے، الٰہِ شخصی Personal God ہے۔ اور یہ خدا امر کرتا ہے، انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن اکثر مسلمان مفکرین ایسے رہے ہیں جو انسان نما، شخصی تمثیلوں اور لفظیات سے ہمیشہ پہلو بچا کر چلے۔ کسی مسلمان نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے، اس کی قضا اس طرح کی ہوگی جیسے کسی انسانی عدالت میں بیٹھے ہوئے قاضی کی ہوتی ہے۔ کیونکہ آخر الامر، ''لیس کمثلہ شئ'' (اس کی

مثل کوئی شے نہیں )۔اور اس میں وہ قاضی اور منصف بھی شامل ہیں جنہیں انسان نے دیکھا ہے یا جن کے بارے میں سن رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حَکَم ہونے ، فیصلہ کرنے کا مطلب ، دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ حقیقت خود کو ظاہر کر دیتی ہے۔ ہر شے وہی نظر آنے لگتی ہے جو وہ اصل میں ہے، کائنات پر فریب اور دھوکے کا سکہ نہیں چلتا، ہر شے بالآخر اپنی مناسب جگہ پر پہنچ کر رہتی ہے۔ جو چیز اللہ کی وحدت ، سالمیت ، توازن ، عدل ، جمال ، ہم آہنگی اور رحمت کا ظہور کرتی ہے وہ الاحد The One الجمیل اور الرحیم کے قرب میں بار پائے گی لیکن وہ چیز جو کثرت ، ژولیدگی ، انتشار ، جزویت ، بے اعتدالی ، قباحت اور قہر سے مغلوب ہوگی وہ الاحد سے دور رہ جائے گی۔

کائناتی اسلام کے نقطۂ نظر سے ہر شے اللہ تعالیٰ کی حقیقت کی مکمل بندگی اور فرمانبرداری میں اپنے آپ کو الگ کر لیتی ہیں۔ ہر شے پوری پوری نپی تلی اور بہ اندازۂ تقدیر ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اسلامِ خاص بھی تو ہے یعنی انسان کی وہ آزاد اور اختیاری اطاعت اور بندگی جو وہ رسولوں کے لائے ہوئے پیغامِ خداوندی کے وسیلے سے کرتے ہیں۔ تجزیہ کرتے جایئے تو آخر کار مسلمانوں کو بھی یہ جاننا ہی پڑتا ہے کہ اسلامِ خاص بس کائناتی اسلام کا ایک پہلو ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ اختیاری فرمانبرداری بھی پیمانۂ تقدیر کے مطابق ہی ہوتی ہے۔ ہاں یہ تسلیم کرتے ہوئے وہ ''توحید'' کا تصور ملحوظ رکھتے ہیں اور یہ بھی کہ الحق ہی حتمی اور قطعی حقیقت ہے اور اس سے انسان کی اس آزادی پر کوئی زد نہیں پڑتی جس کا اسے ادراک حاصل ہے۔

یہاں آ کر بات کا رخ پھر ایک مرتبہ جبر و قدر کے مبحث کی طرف ہو جاتا

ہے۔ مسلمان منکرین کے لیے جو تصور نا قابلِ قبول ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف تو انسان کو کفر پر مجبور کرتا ہے اور دوسری جانب اس کی پاداش میں اس کو سزا دینے کا حکم صادر کرتا ہے یا یہ کہ وہ انسان کو ایمان پر مجبور کر کے پھر اس نیکی کی اسے جزا عطا کرتا ہے۔ اس سارے معاملے میں انسان کی آزادیٔ اختیار کا جو حصہ ہے وہ اس امر کے لیے کفایت کرتا ہے کہ انسان اپنی مرضی سے جو عمل کرے اس کی ذمہ داری بھی قبول کرے اور اس کے لیے جواب دہی کرے۔

انسان جو کچھ کرتا ہے اس کے لیے اس کے پاس دلیل موجود ہوتی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ انسان اس لیے عمل نہیں کرتا کہ اسے کچھ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی مرضی اور اختیار سے ایک عمل منتخب کرتا ہے۔ قیامت کے دن جب خدا کا سامنا ہو گا اور انسان سے کہا جائے گا کہ ''اقراء کتابک'' (اپنی کتاب پڑھ) تو انسان دیکھے گا کہ ''رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی شے'' (۲۱:۴۷) اس کے دفترِ عمل سے باہر نہیں رہی ہو گی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہیں کیا تو انسان کے پاس جواب تو ہو گا لیکن اسے بخوبی معلوم ہو گا کہ اس کے پاس اصل میں کہنے کو ہے کچھ نہیں۔ اس کے اکثر جواب ادھورے ہیں اور محض بات بنانے کے لیے کہے جا رہے ہیں۔

معاملے کو اس انداز میں پیش کرنے کا مطلب ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر مسئلے کو تجسیمی انداز میں اور انسان پر قیاس کر کے پیش کر رہے ہیں۔ اسی استدلال کو دوسرے ڈھب سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ تجسیمی اسلوبِ بیان لوگوں کے لیے عام طور پر سب سے زیادہ قابلِ فہم ہوتا ہے۔ تاہم اس وقت جو گفتگو ہم کر رہے ہیں اس کے لیے ضروری نہیں کہ ہم اس چیز کی تہ تک پہنچنے کی سعی کریں

جسے مسلمان منکرین نے ''سر القدر'' (تقدیر کا بھید) کہہ کر کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص کمالِ روحانی کی راہ پر خاصا آگے نہ نکل جائے اسے اس راز کی سمجھ نہیں آ سکتی۔۸۲

عدلِ خداوندی کا مسئلہ قرآن مجید میں اکثر جزاءوسزا کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔عام طور پر اس کو یوں کہا گیا ہے کہ انسان کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جواب لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔اس ضمن میں قرآن نے جو عمومی اصطلاح استعمال کی ہے وہ ہے ''جزاء''۔اس کا مطلب ہے ''اسی شے میں ادا کرنا، بدلہ دینا'' خواہ خیر ہو یا شر۔نیکی بدی دونوں کا بدلہ ملے گا۔مندرجہ ذیل آیات دیکھیے۔

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا (۱۸:۸۸)

رہا وہ جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا تو اس کے لیے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (۲۰:۷۵)

اور جو اس کے پاس باایمان ہو کر جائیں گے، انہوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے، جن میں نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِى النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا وَذٰلِكَ جَزٰؤُا الظّٰلِمِيْنَ (۵۹:۱۷)

پس انجام کار دونوں ہی دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے بن کر پڑیں گے۔
اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا بدلہ یہی ہے۔

قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِىْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ (۶:۱۵۷)

جو لوگ ہماری آیات سے اعراض کررہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت برا عذاب دیں گے۔

جزاء کے علاوہ قرآن مجید میں ''ثواب'' اور ''عقاب'' کے لفظ بھی آئے ہیں۔ ثواب وعقاب کا بشارت دینے اور خبردار کرنے سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور زیادہ عمومی معنی میں ثواب وعقاب کا تعلق بنتا ہے رحمتِ خداوندی اور غضبِ الٰہی سے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے رحمت اور جمالی ناموں سے موسوم کیجیے تو وہ نفس کو جزاء دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بطور اسمائے قہر وغضب کے نفس کو سزا دیتا ہے۔ اسی بات کو قدرے کم تجسیمی انداز میں بیان کرنا ہو تو یوں کہیں گے کہ وہ نفس جس نے ہستی کی نورانی اور روحانی جہت سے اپنا رشتہ مضبوطی سے استوار کر رکھا ہے ہوگا وہ اس رشتے کے وسیلے الحق کے قرب میں داخل ہوگا لیکن وہ نفس جو ہستی کی نورانی جہت سے گریزاں ہوگا اور اس کی ظلمانی اور جسمانی جہت کو آغوش میں لیے ہوگا اس پر بے حقیقتی کا غلبہ طاری ہو جائے گا۔

قرآن وحدیث میں اس بدحالی اور ابتلاء کا ہولناک نقشہ کھینچا گیا ہے جو جہنم

میں کفار کو در پیش ہوگی۔ اسی طرح جنت کی نعمتوں، خوشگوار اور لذت بخش چیزوں کا بھی قرآن و حدیث میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ بہت سے مسلمان علماء نے جہنم کے خطرے اور اس سے بچنے پر اتنا زور دیا ہے کہ جنت کا وعدہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ اگر یہ امر نظر میں رہے کہ اسلامی تعلیمات کی پہلی ترجیح یہ ہے کہ زندگی کے لائحہ عمل کے طور پر شریعت کو قائم کیا جائے تو پھر اللہ کے قہر اور جلال پر زور دینے کا مذکورہ بالا انداز باعثِ تعجب نہیں معلوم ہوگا۔ انسان کچھ بھی بننا چاہے اسے سب سے پہلے اس بات کا شعور ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے (خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے) اور یہ اس کی اخلاقی اور وجودی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ارادے و اختیار سے اللہ کی بندگی کرے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، وہ خدا جس کی بندگی اور چاکری کی جاتی ہے خدائے ''تنزیہ'' ہے، وہ بادشاہِ عالم جو انسان سے دور، ماوراء رہتا ہے اور اپنے احکامات بھیجتا ہے۔ اس سلطانِ زمان کے غضب اور قدرتِ قاہرہ سے ڈرنا چاہیے۔

اسلام میں اگرچہ ''تنزیہ'' بندگی اور عبودیت اور انذارِ خداوندی پر عمومی طور پر زور دیا گیا ہے تاہم اسلامی روایت میں بہت سے علماء و مفکرین نے اس امر کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ رحمتِ خداوندی اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے غضب پر حاوی ہے۔ رحمت ہر مخلوق، ساری خلقِ خدا پر پھیلی ہوئی ہے، سب کے لیے عام ہے جبکہ اس کا غضب اس کی مخلوق میں سے کچھ کے لیے، کچھ حالات میں واقع ہوتا ہے۔ نظامِ عالم کا رخ رحمت کی سمت ہے اور آخر الامر جیت رحمت ہی کی ہوگی۔

بالفاظِ دگر، قربِ خداوندی، وحدت، توازن، اعتدال اور جمال و رحمت کے

سب نام حقیقت کی ماہیتِ اصلی کا تعین کرتے ہیں۔ اللہ سے دوری، ژولیدگی، تخریب، عدمِ توازن اور اسمائے قہر وغضب سے جو آثار و نتائج مخلوقات میں پیدا ہوتے ہیں یہ سب نابودی، عدمِ ہستی اور فقدانِ حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں کوئی ثبات حاصل نہیں۔ آخر الامر، کثرت اپنے آپ کو عدم میں مٹا دے گی، ایسے ہی جیسے اپنے منبعِ نور سے دور ہوتے ہوئے روشنی کی چمک مدھم ہوتی جاتی ہے۔ پس مخلوقات میں جو شے حقیقی ہے وہ باقی رہتی ہے اور جو کچھ بے حقیقت ہے وہ مٹ کر رہتا ہے۔ ''کل شیَ ھالک الا وجہہ'' (۱۸:۸۸) روئے یار کے سوا ہر شے مٹنے والی ہے۔ اسی کی بنیاد پر بعض مسلمان علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جہنم اس طرح ابدی نہیں ہو سکتی جس طرح اللہ تعالیٰ ابدی ہے۔ جس معنی میں اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس معنی میں جہنم کو ہمیشگی حاصل نہیں ہے۔ جنت البتہ ہمیشہ رہے گی کیونکہ جنت کا تعلق رحمتِ خداوندی سے ہے لیکن جہنم کا درد و اذیت آخر کار مٹ جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے غائب ہونے میں اتنے طویل زمانے صرف ہو جائیں کہ ان کی موت کا تصور کرنا ہمارے بس سے باہر ہو۔

حقیقت میں رحمت کے غالب ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ نیک اعمال کی جزاء کئی گنا بڑھا کر دی جاتی ہے جبکہ بدعملی کی سزا صرف عمل کے برابر ہوتی ہے۔ عملِ صالح سے انسان کا الحق سے تعلق مضبوط تر ہوتا جاتا ہے چنانچہ ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر حقیقی محو ہوتا رہتا ہے۔ تاریکی ہو تو ذرا سی روشنی بھی بہت ہوتی ہے۔ حق کی جزا حق سے ملتی ہے اور ناحق، بے حقیقتی کی بے حقیقتی سے۔ لیکن بے حقیقتی کے مقابل حقیقت، لاشے کے سامنے شے کے مترادف ہے۔ ان میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ رہا وہ عمل، وہ کام جس کی جڑیں ایمان کی زمین میں پیوست نہیں ہیں تو وہ محض اس روشنی

کی طرح ہے جو تاریکی، انتشار اور ژولیدگی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہو۔

تجسیمی انداز میں بیان کیجیے تو یوں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہر عملِ صالح کو ایک موقع بنا لیتے ہیں انسان کو اپنی جانب کھینچ لینے کا۔ عملِ صالح وہ عمل ہے جو نبوت سے حاصل ہونے والی رہنمائی کی بنیاد پر اللہ کی بندگی کی نیت سے انجام دیا گیا ہو۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ" (۲:۱۵۲) مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے یاد کرنے اور کسی انسان کے اللہ کو یاد کرنے کو ایک دوسرے کے برابر کیونکر رکھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ الحق ہے، حقیقت ہے اور انسان بے حقیقت ہے۔ پس اس میں اصل اہم بات یہ ہوئی کہ ایمان رکھنے والے انسان کے عمل کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا فعل صادر ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس برے کام کو اللہ تعالیٰ یونہی چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس شخص پر اپنے بد اثرات پھیلاتا چلا جائے جس نے یہ عملِ بد انجام دیا تھا۔ اشیاء کی حقیقتیں اپنے وقت پر ظاہر ہو جائیں گی اور پھر انسان کو سمجھ آئے گی کہ اس نے کیا کیا تھا:

جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا (۲۷ : ۱۰)

برائی کا بدلہ اس کے مثل ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲ : ۲۶۱)

ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کی مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑی گنجائش والا اور

علم والا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا (۴۰:۴)

اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتے گا۔اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گناہ بڑھائے گا اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

انسانی عمل اور اللہ تعالیٰ کا فعل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ان میں جو فرق ہے اس کو ایک معروف حدیث میں آنحضرتؐ نے یوں ظاہر کیا ہے:۸۴

جو بھی اعمالِ حسنہ لے کر آئے گا اسے ہر اچھے عمل کا دس گنا ملے گا بلکہ ہم (اور بھی) بڑھا دیں گے۔ جو اعمالِ بد لے کر آئے اس کے ہر عملِ بد کا اس کے برابر بدلا ملے گا یا پھر ہم اسے معاف کر دیں گے۔ جو شخص میری طرف ہاتھ برابر بڑھتا ہے میں اس کی طرف بازو برابر بڑھتا ہوں۔ جو میری جانب بازو برابر بڑھتا ہے میں اس کی جانب گزوں بڑھتا ہوں۔ جو میرے رخ گامزن ہوتا ہے میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔ جو میرے روبرو ایسے گناہ لیے ہوئے ہوتا ہے کہ جن سے زمین روپوش ہو جائے لیکن اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا ہوتا تو میں اسے وہ مغفرت لیے ہوئے ملتا ہوں جو اس کے سارے گناہوں کو کافی ہوتی ہے۔

# باب ششم

# مسلم فکریات

ایمان کے تین اصولوں کے مضمرات کیا ہیں۔ انہیں ہم نے کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ بحث ابھی اختتام کو پہنچی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ ہم نے جو لکھا ہے وہ تمام مسلمانوں کے عقائد کی نمائندگی کرتا ہے یا کسی خاص طبقے کے معتقدات کا بیان کر رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ ''اللہ کے بارے میں یا رسول اللہ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کی حقیقی نوعیت کیا ہے''؟ تو اس کا تفصیل سے ایسا جواب دینا ناممکن ہوگا جو ہر مسلمان کو مطمئن کر سکے خواہ مسلمان سے مراد آج کل کے مسلمان ہوں یا وہ مسلمان جن کی تحریریں ہم تک پہنچی ہیں۔ ایمان کن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے اس کا تعین ان بنیادی ارکان سے ہوتا ہے جن سے ہم نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ قرآن مجید میں ان ارکان کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اللہ، فرشتے، مقدس کتابیں، انبیاء اور رسول، روزِ آخرت، تقدیر۔ بلکہ یہ فہرست بھی کئی اعتبار سے مسائل پیدا کر سکتی ہے لہٰذا اگر عقائدِ اسلام کو اس طرح بیان کرنا مقصود ہو کہ انہیں عالمگیر طور پر ہر کوئی تسلیم کر لے تو ہمیں مجبوراً فہرست کو مختصر کرنا ہوگا اور یوں کہنا ہوگا کہ اسلام کا مسلمہ، عالمگیر عقیدہ ہے ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''۔

تاہم ہوتا یہ ہے کہ جونہی آپ ''اللہ''، ''رسول''، ''قرآن''، ''فرشتے''، ''روزِ آخرت'' جیسے الفاظ کے مفہوم و معنی کی بحث شروع کرتے ہیں اختلافِ رائے نمودار ہونے لگتا ہے۔ ایمان کے تین ارکان کو اسلام کی فکری تاریخ میں کس طرح

سمجھا گیا ہے، اس سوال پر غور کیا جائے تو یہ چیز سامنے آتی ہے کہ مختلف لوگوں نے ان کے بارے میں الگ الگ آراء قائم کی ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان جو ان مسائل پر غور کرتے رہے ہیں ان کے ہاں عمومی باتوں پر، اجمال میں، اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے۔ اختلاف صرف تفصیلات کا ہے۔ اختلافِ رائے یوں بھی گہرا ہو جاتا ہے کہ اسلام میں کئی مکاتبِ فکر قائم ہوئے اور ہر مکتبِ فکر نے ارکانِ ایمان کی شرح و تعبیر کا ایک مخصوص اسلوب اپنا لیا۔

شریعت، شرعی قوانین اور اسلام کے ارکانِ پنجگانہ (کلمہ، نماز، روزہ، زکوۃ، حج) اگر اس طبقۂ علماء کا خاص میدان تھا جسے "فقہاء" کہا گیا ہے تو ایمان کے ارکان، اس کے اجزاء بھی علماء کے تین طبقات یا گروہوں سے خاص ہو گئے۔ ان کو ایک ابتدائی تقسیم کے مطابق ہم متکلمین (علمِ کلام کے ماہرین)، نظریاتی تصوف یا عرفانِ نظری اور فلسفے کے تین طبقات میں بانٹ سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر طبقے میں کئی کئی ذیلی مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں۔ اس سے ایمان کی شرح و تعبیر کا سارا عمل اور اس کی نشوونما کی تاریخ سب مل کر ایک خاصا پیچیدہ معاملہ بن جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے علماء جو ان تین مکاتبِ فکر سے یکساں واقفیت رکھتے ہوں خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ اکثر مسلم علماء بلکہ غیر مسلم ماہرین بھی ان تین مکاتبِ فکر میں سے کسی ایک کو اپنی خصوصی مہارت کے لیے چن لیتے ہیں بلکہ یہ بھی کم ہوتا ہے۔ زیادہ امکان یہ رہتا ہے کہ ہر اہلِ علم ان تین مکاتبِ فکر میں سے کسی ایک کی ایک شاخ یا اس شاخ کے مشاہیر میں سے کسی ایک کو اپنے مطالعہ کے لیے منتخب کر لیں گے۔

ان تینوں مکاتبِ فکر کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے ان میں امتیاز کرنا

ہمیشہ ممکن نہیں رہتا۔ اسلامی تاریخ میں بہت سے اہلِ علم افراد ایسے ہو گزرے ہیں جن کو بیک وقت ان مکاتبِ فکر میں سے دو یا تین کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے یا پھر ان کی انفرادی علمی حیثیت ایسی تھی کہ انہیں کسی بھی مکتبِ فکر یا طبقے کی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم ان تینوں مکاتبِ فکر پر الگ الگ بحث کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ سب سمتیں ہماری نگاہ میں آ جائیں گی جن کی جانب مسلم فکر نے ''توحید''، ''رسالت'' اور ''معاد'' کے تصورات کی نشوونما کے دوران سفر کیا۔ روایتی طور پر بھی ان مکاتبِ فکر کا مطالعہ اسی طرح جداگانہ طور پر کیا جاتا تھا۔ جدید علمی دنیا میں بھی یہی رواج ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ ان تینوں اسالیبِ فکر کا موضوع ایک ہی ہے۔ یہ تینوں اندازِ جستجو، اپنے اپنے ڈھب سے تلاشِ حق کرتے ہیں۔ تلاش کا ہدف اور مقصد مشترک ہے طریقے اور راستے جدا جدا ہیں۔ ان سب کا ہدفِ اولین اور مشترک موضوع ہے ''حقیقت'' جو ہمارے سامنے ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی اسلام کے نقطۂ نظر سے تلاشِ حقیقت۔ سو اس طرح ایمان کے ارکان ثلاثہ (توحید، رسالت، آخرت) سے ان تمام افکار اور مباحث کی ایک وسیع حد بندی عمل میں آ جاتی ہے۔

ان میں سے ہر مکتبِ فکر پر ہم مختصراً الگ الگ تبصرہ کریں گے۔ اس سلسلے میں ایک بات شروع ہی میں سمجھ لینا چاہیے کہ ان تینوں کے طریقِ کار میں فرق ہے۔ اسلام کے مذکورہ بالا تین اصولوں کا مطالعہ کرنے کے لیے، ان پر غور و فکر کرنے کے لیے ان تین مکاتبِ فکر نے ایک دوسرے سے مختلف اسلوب اور جداگانہ منہاجِ تحقیق اپنایا ہے۔ ان مکاتبِ فکر میں جو بنیادی اور مرکزی فرق بتایا جا سکتا ہے، جس

سے ان کا امتیاز قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی فہم، انسان کے حصولِ علم کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ علم کی ماہیت کیا ہے، علم کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ یہ ایک ایسا بنیادی سوال ہے جو ہر اس شخص کے سامنے آتا ہے جو ذرا ٹھہر کر دائی اہمیت کی حامل کسی بھی چیز کو غور و تامل کا موضوع بنانا چاہتا ہو۔ ''مجھے جو معلوم ہے اس کا علم مجھے کیسے حاصل ہوتا ہے''؟ حقیقت اصل میں کیا ہے، یہ سمجھنے اور جاننے کے کس طرح کا علم چاہیے؟'' یہاں یہ نکتہ سامنے رہے کہ تمام مسلمان مفکرین ایک بات متفقہ طور پر مانتے تھے اور وہ یہ کہ کوئی ایک حتمی اور آخری حقیقت وجود رکھتی ہے۔ یہی شہادتِ اوّل (لا الہ الا اللہ) کا تقاضا ہے۔ اسے تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان مفکر نہ رہتے۔ چنانچہ جدید مغربی دنیا کے برعکس، مسلمانوں میں شاذونادر ہی کوئی ایسا مفکر ملے گا جو ایک حقیقتِ عظمیٰ کے وجود کا منکر ہو یا جو اس بارے میں تشکیک کا شکار ہو کہ حتمی معنویت رکھنے والی کسی شے کے علم کا امکان ہے یا نہیں۔

اس معاملے پر اگر بحیثیتِ عمومی نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دیگر بہت سے مذہبی اسالیبِ فکر کی طرح اسلام میں بھی یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ الحق کا علم حاصل کرنے، کائنات کی ساخت اور ماہیت کو سمجھنے اور نفسِ انسانی کے جاننے کے لیے یہ تین طریقے، تین انداز و اسالیب ہو سکتے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ انسان اپنی عقلِ خداداد، اپنی خلقی عقل کو استعمال میں لائے۔ یہ تو ہوا طریقِ عقلی۔ قرآن بار بار لوگوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ اپنی عقل استعمال کریں۔ اس ضمن میں بعض مسلمانوں نے یہ سوچا کہ عقل کو برتنے کا سب سے بہتر انداز یہ ہے کہ اسے اس ڈھب سے استعمال میں لایا جائے جو یونانی فلسفیوں بالخصوص ارسطو اور افلاطون نے رواج دیا

تھا۔حقیقت کو سمجھنے کا یہ فلسفیانہ اور منطقی اندازکئی اعتبار سے مغربی فلسفے کی اس روایت سے مشابہ ہے جو ڈیکارٹ سے پہلے مغرب میں پائی جاتی تھی۔

الحق کو جاننے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انبیاء کے لائے ہوئے پیغامات کو بے چون و چرا مان لیا جائے۔یہ ''وحی'' کا راستہ ہے۔یہ ایمان کا عمومی راستہ ہے۔مسلمان اسے نہایت قابلِ تعریف گردانتے ہیں۔اگر اس مؤقف کو اختیار کرنے والے اس کی تعمیم نہ کرنے لگیں اور اس دعویٰ پر نہ اتر آئیں کہ ہر شخص پر (فکروفہم) کی انہی قیود کو بلا استثناء لاگو کیا جائے گا جو ان کے حصے میں آئی ہیں۔دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر آپ یہ کہیں کہ ''میں یہ بات مانتا تو ہوں مگر میں اصل میں اسے سمجھا نہیں ہوں'' تو یہ ایک چیز ہے لیکن اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ ''چونکہ میں اسے سمجھ نہیں پایا لہٰذا کوئی بھی اسے سمجھ نہیں سکتا'' تو پھر بات کچھ اور ہو جاتی ہے۔تمام مسلمان وحی کو تسلیم کرتے ہیں۔شہادتِ دوم (محمد رسول اللہ) کے معنی ہی یہی ہیں۔تاہم مسلمانوں میں سے کچھ لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآن کی آیات کو لفظی معنی ہی میں قبول کرنا اہم ہے جبکہ دوسرے لوگوں کی نگاہ میں لفظی معنی پر اس درجہ اصرار کرنا لازمی نہیں۔ماہرینِ علمِ کلام پر اگر نظر کیجیے تو بحیثیتِ عمومی ان کی اکثریت کو ''وحی'' کے راستے پر گامزن پائیے گا۔

الحق کو جاننے کا تیسرا راستہ یہ ہے کہ حقیقت کو عقلِ جزوی یا وحی کی وساطت کے بغیر اپنا تجربہ بنایا جائے۔اس راہ کے یوں تو بہت سے نام ہیں مگر لیکن ہم اس کے لیے یہاں وہ اصطلاح استعمال کریں گے جو سب سے زیادہ معروف ہے یعنی ''کشف'' (کھولنا، بےنقاب کرنا)۔اس لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ ایک دوسرے خیال سے جڑا ہوا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے پردے میں ہے،اس کے اور

مخلوق کے درمیان حجابات ہیں۔ایک حدیث میں ہم نے یہ تصور پہلے بھی دیکھا تھا۔۸۴

اللہ تعالیٰ کے نور وظلمت کے ستر پردے ہیں۔اگر یہ پردے اٹھ جائیں تو روئے خداوندی کی درخشندگی سے ہر وہ شے جل کر خاک ہو جائے جس کا درک خلقِ خدا اپنی بصارت سے کرسکتی ہے۔

کشف تب واقع ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنی مخلوق میں سے کسی شخص کے درمیان پردوں میں سے کچھ حجاب اٹھا دیتے ہیں۔جس شخص کو کشف کا تجربہ ہوتا ہے اس کی بینائی خاکستر بھی ہوسکتی ہے اور بچ بھی سکتی ہے لیکن اس تجربے کے بعد اس کے لیے پردوں کی اوٹ میں الحق کے بارے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔مغربی زبانوں میں mysticism کا لفظ اکثر جس معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ اسلامی زبانوں میں ''کشف'' کے لفظ کے قریب تر ہیں۔مقام افسوس یہ ہے کہ سرّیت mysticism کے لفظ سے کچھ ایسے منفی تلازمات وابستہ ہو گیے ہیں کہ اس سے معاملے کی وضاحت ہونے کی جگہ الجھنوں میں اضافہ ہی ہوتا دیکھا گیا ہے۔لہٰذا ہم اس لفظ کو برتنے سے گریز کریں گے۔۸۵ الحق کو جاننے کے جو تین اسالیب یا راستے ہم نے بیان کیے وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔یہ تینوں ایک دوسرے سے گھلے ملے رہتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ تاریخِ اسلام میں کچھ ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جن کا دعویٰ یہ تھا کہ ان میں سے صرف ایک ہی راستہ یا ایک ہی اسلوب جائز اور قابلِ عمل کہا جاسکتا ہے۔

قاعدہ کلیہ یہ رہا ہے کہ اسلام کے تینوں مکاتبِ فکر نے وحی کو کسی نہ کسی درجے میں اپنا رہنما اور حَکَم تسلیم کیا ہے۔اگر آپ یہ تسلیم نہ کریں کہ قرآنِ مجید علمِ خداوندی

ہے جو انسانوں کے لیے نازل کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے شہادتِ دوم کا انکار کر دیا اور مسلمان نہیں رہے۔ وہ لوگ جو راہِ کشف کے مسافر ہیں وہ قرآن کے عطا کردہ علم کو اپنا ہادی و رہنما بنانے کے سلسلے میں خاص طور پر بہت محتاط رہے ہیں۔ ان کے خیال میں کشفِ صحیح صرف اور صرف اس وقت واقع ہوتا ہے جب انسان رسول خدا کی سنت کی پیروی کرتا ہو۔

عمومی طور پر دیکھیے تو کہا جا سکتا ہے کہ جاننے سمجھنے کے یہ تین اسلوب انسانوں کے ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ ہر انسانی تہذیب البتہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر عیسوی تہذیب میں اگر چہ وحی پر زور دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ روایت پر ایک عقلی اسلوب میں غور کرنے کا رویہ بھی خوب پھلتا پھولتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے مسیحی بھی ہمیشہ رہے ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ سچی عیسائیت وہ ہے جس میں ایمانی حقائق ہمارا ذاتی تجربہ بن جائیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے مسلمان کشف کہتے ہیں۔ رہی جدید مغربی تہذیب تو اس میں صدیوں سے جو اسلوبِ فہم غالب ہے وہ ہے عقلیاتی یا استدلالی۔ فہمِ انسانی کے باقی دونوں طریقے بھی سرے سے مفقود کبھی نہیں ہوئے۔ حالیہ زمانہ میں یوں لگتا ہے کہ یہ دونوں دبے ہوئے اسالیب پھر سے ابھرنے لگے ہیں۔

## اسلام کے ابتدائی عہد میں ایمان کا بیان کیسے ہوا؟

بہت سے جدید اہلِ علم نے اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے علمِ کلام پر غیر معمولی توجہ صرف کی ہے۔ یہ رویہ اتنا بڑھا کہ عام قاری جو اس موضوع پر زیادہ معلومات نہ رکھتا ہو بہ آسانی اس مغالطے میں پڑ جاتا ہے کہ علمِ کلام ہی اسلامی فکر کی سب سے اہم شکل ہے۔ ان لکھنے والوں کا محرک ہر صورت میں یہ جاننا نہیں رہا کہ اسلام اپنے

آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ان کے اغراض و مقاصد اکثر کچھ اور رہے ہیں۔اسی کارن ان کے ہاں علمِ کلام کے عقلی اسلوبِ فہم کو زیادہ اہم قرار دینے یا دیگر اسالیب سے دلچسپ تر جاننے کا رویہ نظر آتا ہے۔

یہ درست ہے کہ علمِ کلام کو اسلامی تہذیب میں ایک اہم حیثیت حاصل رہی ہے لیکن اس اصطلاح کو انگریزی میں Theology کے لفظ سے ترجمہ کرنے کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیے کہ اسلام میں علمِ کلام کا وہی کردار رہا ہے جو مسیحیت میں Theology (الٰہیات) نے انجام دیا تھا۔اسلام میں مرکزی اہمیت شریعت کو حاصل ہے۔علمِ کلام کو نہیں۔اسلام پر عمل کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت کو علمِ کلام کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا اگرچہ ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی حد تک شریعت سے شناسائی حاصل ہوتی ہے۔علمِ کلام کے بغیر بھی انسان اچھا مسلمان ہو سکتا ہے لیکن شریعت کے بغیر کسی بھی طرح کا مسلمان ہونا ایک امر محال ہے۔بہت سے عظیم مسلم علماء، جیسے امام غزالی نے علمِ کلام کا مطالعہ کرنے سے مسلمانوں کو منع کیا ہے کیونکہ علمِ کلام کچھ ایسے عقلی مسائل پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے جن کی اکثر لوگوں کے لیے کوئی عملی اہمیت نہیں ہوتی۔

سوال یہ ہے کہ پھر اسلام میں علمِ کلام کی نمود ہوئی کیوں؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اشاعتِ اسلام کے اوّلین عہد میں مسلمانوں کو کن حالات کا سامنا تھا۔

اپنے آغاز کے پہلے سو سال کے اندر اندر اسلام ایران کے بڑے حصے، شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے عرب علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ان علاقوں میں جو ادیان پہلے سے موجود تھے ان میں عیسائیت، یہودیت، زرتشتیت اور تھراویت،

مانویت اور حران کے صابئین شامل تھے۔ان میں سے بعض ادیان کے اندر ایک دوسرے کے حریف مکاتبِ فکر یا فرقے بھی موجود تھے۔اس کے علاوہ ان علاقوں کے بہت سے لوگ یونانی فلسفے بالخصوص نوفلاطونیت سے آشنا تھے اور یہ فلسفیانہ نظام اکثر ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔

مسلمانوں نے جب ان لوگوں کے ساتھ رہنا بسنا شروع کیا جو مسلمان نہیں تھے تو کچھ مسلمان قدرتی طور پر دین کے بارے میں ان سے تبادلۂ خیال بھی کرنے لگے۔مسلمانوں کے پاس قرآن تھا اور حدیث جن پر وہ بات کرتے تھے۔دوسری روایتوں کے نمائندوں، بالخصوص عیسائی حضرات کے ہاں صدیوں پر پھیلے ہوئے الہیاتی مباحث تھے جن کے نتیجے میں فکری تراش خراش کے عمل سے بہت سے سوالات نکھر کر سامنے آئے تھے۔یہاں یہ یاد رہے کہ عیسائیت اس علاقے میں پروان چڑھی تھی جہاں یونانی فلسفہ ہی سب سے بڑی فکری قوت تھی۔اپنی ابتداء ہی میں عیسائیوں نے یونانی فلسفیوں کے بعض افکار کے خلاف ایک مناظرانہ موقف اختیار کر لیا تھا لیکن فلسفے پر بحث کرنے کے لیے انہیں فلسفے ہی کا سامانِ جنگ استعمال کرنا لازم تھا۔ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے جو صدیوں سے فسلفیانہ مباحث پر کلام کرتے رہے ہوں عیسائیوں کے لیے ضروری ٹھہرا کہ وہ منطقی اور فلسفیانہ مباحث کی ساری پیچیدگیوں اور نزاکتوں پر عبور حاصل کریں۔

دوسری روایتوں کے ایسے نمائندوں سے جب مسلمانوں کا سابقہ پڑا تو بعض مسلمان تو ان کو ''کافر'' اور ''منکرِ حق'' کہہ کر الگ ہو گئے۔لیکن یہ روّیہ ان لوگوں کا نہیں تھا جن کو اسلام سے پہلے آنے والی وحیِ خداوندی اور عقلِ انسانی کا کچھ بھی پاس لحاظ تھا۔جس جس مسلمان میں عقلی مباحث کا میلان تھا اسے یہ فکری سوالات

اہم دکھائی دینے لگے۔ان میں دین کی اصل و اساس، اس کی نوعیت، نبوت اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں دوسرے ادیان کے ایسے لوگوں سے تبادلۂ خیال کے عمل کا آغاز ہوا جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔پہلے قدم پر ہی انہیں یہ احساس ہو گیا کہ منظم انداز میں سوچنے والے ان منکرین کے مقابل کامیابی سے گفتگو کرنا آسان نہیں جو فلسفے اور الہیات کے مباحث میں باضابطہ تربیت یافتہ ہوں۔

پھر یہ بھی قدرتی بات تھی کہ وہ مسلمان جن کی افتادِ طبع عقلیات کی طرف میلان رکھتی تھی یہ سوچنے لگے ہوں کہ کیوں نہ ہم اپنا موقف اس انداز میں بیان کرنے میں مہارت حاصل کر لیں جو دوسرے ادیان کے پیروکار لوگوں کو اسلام کی بات انہی کی زبان میں سمجھا سکے۔ان کے پاس اس کے سوا چارۂ کار تھا بھی نہیں کہ وہ اپنے مخاطبین کے طرزِ کلام کو اختیار کر لیں اور اسی میں ان سے کلام کریں۔قرآن سے انہیں یہ بات معلوم تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کی زبان کو ان لوگوں کے لیے ڈھال دیتے ہیں جن کی طرف وحی بھیجی جا رہی ہو۔"وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم" (۱۴:۴) (اور ہم نے جو رسول بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ ان پر اچھی واضح کر دے) وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسولِ خداؐ کی ہدایت ہے کہ لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کی جائے (کلموا الناس علی قدر عقولھم)۔ سو جب انہوں نے اپنے حلقۂ شناسائی میں داخل ہونے والے نئے لوگوں کو اللہ کے بارے میں، کائنات کے بارے میں یا کلامِ الٰہی کے بارے میں ایسی کوئی بات کہتے سنا جو قرآن میں بتائی ہوئی کسی چیز کے خلاف جاتی تھی تو انہوں نے ان لوگوں کے دلائل کا انہی کی زبان میں ایسا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی جو قابلِ فہم بھی ہو اور قرآنی حقائق پر مبنی بھی ہو۔

اسلام نے جن علاقوں کو فتح کیا تھا وہاں یونانی فلسفہ پڑھنے کے سارے وسائل میسر تھے۔ اسکندریہ کی مثال سامنے کی ہے جو یونانی فلسفے کی روایت بالخصوص نوفلاطونیت کا سب سے بڑا وارث تھا۔ جو مسلمان شروع میں ان مباحث میں شامل ہوئے وہ یونانی فلسفے اور مقامی ادیان سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھے لیکن یہ فکری روایتیں ان کے فکری ماحول اور ذہنی فضا کی صورتگری میں معاون ضرور رہی تھیں۔

جو لوگ اسلامی تعلیمات کو اپنے زمانے کے معاصر عقلی اسلوب میں بیان کرنے کا آغاز کر رہے تھے ان کے بنیادی مقاصد میں سے ایک یہ تھا کہ غیر مسلموں کے اعتراضات کے سامنے ارکانِ ایمان کا دفاع کیا جائے۔ یوں رفتہ رفتہ مسلمانوں نے بنیادی مسائل پر کچھ ایسے موقف قائم کر لیے جو الٰہیاتی اور فلسفیانہ فکر کے لیے اہم تھے۔ وہ مسلمان جو متکلمین (یعنی ماہرینِ علمِ کلام) کے نام سے معروف ہوئے ان کے ہاں قرآن مجید کو بحیثیتِ کلامِ الٰہی پیش کرنے کے لیے ایک دفاعی موقف متعین ہو گیا۔ جو لوگ فلسفی کہلائے ان کی دلچسپی ایسے مباحث میں زیادہ رہی جو یونانی فلاسفہ مثلاً افلاطون، ارسطو اور فلاطینوس نے پیش کیے تھے۔ فلسفیوں کے اندازِ نظر پر ہم الگ سے گفتگو کریں گے۔

یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے کہ ابتدائی عہد کی کچھ ایسی تحریریں ہمارے سامنے ہیں جن میں وہ مباحث جو بعد کو علمِ کلام کے مرکزی مباحث بن گئے ایک بلند فکری سطح پر نہایت صفائی سے بیان ہوئے ہیں۔ ان تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم کے مشرقِ وسطیٰ کی فکری فضا کسی حد تک مکہ اور مدینہ میں بھی پائی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر رسولِ خداؐ کے چچا زاد اور داماد سیدنا علیؓ کے اقوال کو چوتھی/دسویں صدی

میں ''نہج البلاغہ'' کے عنوان سے یکجا کیا گیا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے ان اقوال کی جمع وتدوین کا کام انجام دیا اس کی رائے پر اس کی اپنی صدی کے فکری مباحث بھی اثر انداز ہوئے ہوں گے۔ان مباحث میں علمِ کلام کے بہت سے مناظرے بھی شامل رہے ہوں گے اور انہی کے زیر اثر انتخاب کرنے والے نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ کن اقوال کو شاملِ انتخاب کیا جائے اور کون سے اقوال چھوڑ دیئے جائیں۔یہ تو ممکن ہے کہ انتخاب میں بعض موضوع اقوال بھی در آئے ہوں لیکن بعض جدید اہلِ علم کی یہ رائے قبول کرنا ناممکن ہے کہ یہ سارے اقوال حضرت علیؓ سے غلط طور پر منسوب کیے گئے ہیں۔اس مجموعے کا عمومی اسلوبِ بیان یکساں ہے اور تحریر کی روحانی اور فکری سطح اتنی بلند ہے کہ اسے جعلسازی نہیں کہا جا سکتا۔مزید براں ''نہج البلاغہ'' سے پہلے کی کچھ کتب اور بھی ہیں جن میں ان میں سے بہت سے اقوال مل جاتے ہیں۔

''نہج البلاغہ'' کو پڑھیے تو سیدنا علیؓ، قرآن اور رسول خداؐ کے بعد، ''توحید'' کے سب سے بڑے ترجمان نظر آتے ہیں۔لیکن قرآن کا اپنا ایک یکتا و بے مثل اسلوب ہے۔اس کی اثر انگیزی کی نقل کرنا محال ہے۔یہ اسلوب زیادہ تر پند و نصیحت، فہمائش اور ترغیب و ترہیب پر مبنی ہے اور نفسِ انسانی کی عمیق ترین جہات پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔قرآن خدا کے لہجے میں کلام کرتا ہے جس میں فرمانروائے جہان کا حکم و اختیار گونجتا ہے۔قرآن آغاز ہی سے مسلمانوں کے دل میں اتر گیا تھا۔احادیث کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے جو قرآن سے مختلف ہے۔قرآن اور حدیث کے اسالیب سے جو شخص ایک مرتبہ شناسا ہو جائے اس کے لیے ناممکن ہے کہ پھر وہ کبھی ان دونوں کو خلط ملط کر سکے۔رسولِ خداؐ کے لہجے میں ایقان و

اذعان تو ہوتا ہے لیکن ایک خلیق انسان کا انکسار اور مروت بھی ساتھ رہتی ہے۔ قرآنی آیات کے مقابلے میں احادیث میں بات کو زیادہ کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔آپؐ کے کلام میں تفصیل ہوتی ہے اور ایک ہی فقرے کو یا تراکیب کو قدرے تبدیلی کے ساتھ دہرانے کا خوشگوار عمل نظر آتا ہے جو کہ لفظوں کے تقابل سے بات کے مدعا کو بالکل واضح کر دے۔رسولِ خداؐ کے الفاظ محسوس اور عملی ہوتے ہیں مجرد نہیں ہوتے۔بطور کلیہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپؐ اپنی گفتگو میں روزمرہ کے الفاظ کے سوا اور الفاظ نہیں برتتے تھے۔

سیدنا علیؓ کی ''نہج البلاغہ'' ایک تیسرے اسلوبِ بیان کی نمائندگی کرتی ہے جو قرآن اور حدیث سے بالکل الگ ہے۔اگر رسولِ خدا کا کلام روزمرہ اور زمینی عبارت کے لطف سے مملو ہے تو حضرت علیؓ کا طرزِ کلام آسمانی اور مرعوب کن اسلوب کی جانب مائل دکھائی دیتا ہے۔ان کی زبان رسولِ خداؐ کی زبان سے کہیں مشکل ہے۔رسولِ خداؐ کے کلام میں بھی کہیں کہیں ایسے الفاظ آتے ہیں جو عام فہم نہیں ہوتے لیکن یہ الفاظ عام طور پر وہ اسماء ہوتے ہیں جو اگرچہ ٹھوس اشیاء کو موسوم کرتے تھے لیکن کسی وجہ سے بعد کے زمانوں میں متروک ہو گئے۔حضرت علیؓ کے ہاں لفظوں کا ایک ذخیرہ ہے جو مختلف فکری اور مجرد بیانات کے سیاق و سباق میں استعمال ہوتے ہیں۔اس کے لیے انہوں نے عربی زبان کے بھرے پُرے خزانے میں پائے جانے والے وافر ذخیرۂ الفاظ کو اس طرح برتا ہے کہ اس کی ان سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔انہیں ایک اور چیز کا خاص طور پر ملکہ حاصل تھا، بات کو ایسے پر معنی اور جامع انداز میں سمیٹ کر کہنا کہ فقرہ ضرب المثل بن جائے۔اسی اسلوب کی وجہ سے حضرت علیؓ کا ایک مقولہ کتابوں اور دفتروں پر پھیلے ہوئے مباحث پر

بھاری ثابت ہوتا ہے۔

"نہج البلاغۃ" سے سیدنا علیؓ کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک ایسے آدمی کی ہے جو حکمتِ قرآنی اور دانشِ نبوی کی گہرائیوں سے واقف ہو۔ ذرا مزید عمومی انداز میں پھیلا کر کہیے تو حضرت علیؓ آپؐ کے وہ صحابی ہیں جو وحیِ خداوندی کے سب سے گہرے معانی اور مخفی گوشوں کے شناسا تھے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ "ومن یؤتی الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیرا" (۲:۲۶۹) (جسے حکمت عطا ہوئی، اسے خیرِ کثیر کا خزانہ مل گیا) اس لحاظ سے حضرت علیؓ مردِ دانا اور حکیم دانشمند کے مثالی نمونے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ حضرت علیؓ رسولِ خداؐ سے زیادہ دانائی رکھتے تھے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ آنحضرتؐ کے اقوال میں بسا اوقات حکمت کی بات روزمرہ کی تفصیلات کی اوٹ میں آ کر نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کی حکیمانہ باتیں سرتاسر دوسری دنیا سے متعلق ہوتی ہیں۔ عام دنیا داری کی سطح پر اس اسلوب کی کمزوری چوتھے خلیفہ راشد کے طور پر ان کے دورِ خلافت سے عیاں ہے۔ سیاسی طور پر یہ دورِ خلافت کسی طرح کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔

اس وقت ہم جس بحث پر کلام کر رہے ہیں اس سے حضرت علیؓ کا مذکورہ اسلوبِ بیان اس لیے متعلق ہے کہ ان کے اقوال میں وحیِ اسلامی کے وہ امکانات ظہور کرنے لگے ہیں جو اسے ایک عقلی پیرایۂ اظہار میں پیش کرنے کے لیے ضروری تھے۔ علمِ کلام، عرفانِ نظری اور فلسفہ سبھی کے آثار ان کی تحریر میں اپنی نمود کرتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ عہدِ عتیق کے مشرقِ وسطی میں پائی جانے والی فکری فضا سے حضرت علیؓ کس حد تک آگاہ تھے تو اس پر بحث کی بہت گنجائش ہے۔ ایک بات یقینی ہے کہ ان کے بعد کی مسلمان نسل میں سے کچھ لوگ حضرت علیؓ کے اس پیرایۂ اظہار

کی طرف ایک فکری میلان رکھتے تھے اور انہی لوگوں نے فلسفیانہ اور کلامی مباحث اٹھانے کے جملہ مواقع سے استفادہ کیا۔

## علمِ کلام

ایمان کے اصولوں پر ایک مخصوص انداز سے نظر کرنے کے عمل کے لیے ''کلام'' کا لفظ کہیں چوتھی/دسویں صدی میں جا کر مروج ہوا۔اس سے پہلے اس کے لیے اور الفاظ برتے جاتے تھے۔حنفی مکتبِ فقہ کے بانی امام ابوحنیفہ خود بھی کلامی مباحث کے ضمن میں ایک اہم شخصیت شمار ہوتے ہیں۔ان کے ہاں اس کے لیے جو عنوان ملتا ہے وہ ہے ''الفقہ الاکبر''۔اس کا ترجمہ اردو میں کیجیے تو اسے ''اعلیٰ ترفہم'' یا ''بہتر سمجھ بوجھ'' کہا جائے گا The greater understanding۔امام ابوحنیفہ نے یہاں ''فقہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ہم نے یہ لفظ سابقہ مباحث میں ''قانون'' یا ''فقہی ضابطوں'' کے معنی میں برتا تھا۔امام ابوحنیفہ کہ ہاں یہ لفظ اپنے قرآنی معنی میں استعمال ہوا ہے۔قرآن میں ''فقہ'' کا مطلب ہے تعلیماتِ دین کا فہم، دین کی سمجھ۔امام ابوحنیفہ نے ''اکبر'' (بڑی) اور ''اصغر'' (چھوٹی) کے لفظ استعمال کر کے ''فقہِ اکبر'' یعنی اصولِ دین کے فہم اور ''فقہِ اصغر'' یعنی شرعی احکامات کے فہم کے مابین فرق قائم کر دیا ہے۔علمِ کلام کو ''اصول الدین'' بھی کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں دین کی جڑ بنیاد۔اس نام میں اشارہ یہ پنہاں ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد ایمان پر ہے یعنی ماہیتِ اشیاء کے فہم پر۔اس اعتبار سے دیکھیے تو فقہی احکامات کو ''فروع الدین'' (دین کی شاخیں یا ضمنیات) کہا جائے گا کیونکہ دین کی عملی تعلیمات کی حیثیت ایمان کے اصولوں کے اطلاق ہی کی ہوتی ہے۔

علمِ کلام کے ماہرین کا اولین ہدف یہ رہا ہے کہ قرآن مجید کی صداقت پر

ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا جائے، اس کی حقانیت کا دفاع کیا جائے۔ جو اس کے کلامِ خداوندی ہونے میں شک کرے اس کی دلیل کا رد کیا جائے۔ مگر اعتراض کرنے والے کے پاس کچھ کہنے کو ہونا ضروری تھا۔ یاد رہے کہ علمِ کلام ایک ایسا فکری عمل تھا جو منجھے ہوئے اہلِ فکر نے اپنے ایسے مخاطبین کا جواب دینے کے لیے اختیار کیا جو ان مباحث کی اہمیت اور معنویت کے قائل تھے۔

یہ درست ہے کہ فکرِ اسلامی کے لیے علمِ کلام کے مباحث اپنی ایک اہمیت رکھتے تھے لیکن یہ اہمیت ایسی بھی نہیں ہے جیسی عموماً فرض کر لی جاتی ہے۔ اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں زیادہ تر ان جدید اہلِ قلم کا ہاتھ ہے جو کسی نہ کسی سبب اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ متکلمین نے اپنے بارے میں، اپنی حیثیت اور ضرورت کے بارے میں جو دعوے کیے ہیں وہ سب درست ہیں۔ ایمان کی سطح پر اصل اہمیت جس شے کی رہی ہے وہ ہے شہادت اوّل اور شہادت دوم ''لا الہ الا اللہ'' اور ''محمد رسول اللہ''۔ ان کے بنا اسلام ہی وجود میں نہیں آتا۔ لیکن مسلمان مفکرین، بشمول ماہرینِ علمِ کلام، اسے مسلّمات میں سے جانتے تھے اور اس کو موجود مان کر آگے بڑھتے تھے۔ اہلِ کلام کے لیے جو مباحث زندگی اور موت کا مسئلہ بنے ہوئے تھے وہ کچھ یوں تھے۔ ''قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق اور ابدی''؟ ''اللہ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں یا ذات وصفات ایک ہی ہیں''؟ کیا انسان مجبور ہے یا آزادیِ اختیار رکھتا ہے''؟ علمِ کلام کے تناظر میں ان مباحث پر گفتگو کرنا ہو تو بات بہت دور نکل جائے گی اور ہماری کتاب اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی تاہم یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام میں ان مباحث کی اہمیت کیا ہے نیز یہ بھی کہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھنے پر یہی مباحث ویسے اہم کیوں نہیں رہتے جیسے کہ بظاہر

معلوم ہوتے ہیں۔

ان سوالات پر بحث اس لیے اہم ہے کہ بعض لوگ ان الجھے ہوئے دقیق مسائل کے صاف اور دوٹوک جواب تلاش کے لیے خود کو مجبور پاتے ہیں۔ کچھ لوگ پیدائشی طور سوچ بچار کے عادی یا علمی نکات پر غور کرنے کے شائق ہوتے ہیں۔ کوئی بھی دین ایسے لوگوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان کا فکری سفر سوالات اٹھانے سے عبارت ہوتا ہے اور اگر ان کو تسلی بخش جواب نہ مل سکیں تو وہ کسی اور جانب رخ کرنے لگتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہ رہے کہ علمِ کلام نے سبھی سوالات کے جواب فراہم کر دیے، ہرگز نہیں اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اسلام میں عرفانِ نظری اور فلسفے کی نشو و نما ہی نہ ہوتی۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ علمِ کلام نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے جوابات فراہم کر دیئے اور علمِ کلام کے ان جوابات سے جو ایک فکری اور عقلی سہارا ان کو میسر آیا اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور قرآن سے تعلق پر ان کا دل پوری طرح جم گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کا ایمان مستحکم ہو گیا۔

اس سارے معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ان کلامی اور الٰہیاتی مباحث سے کچھ سیدھے سیدھے سیاسی نتائج بھی فراہم ہوتے تھے۔ بالخصوص جب حکومت وقت ان سے اپنے اقتدار کا جواز فراہم کرنا چاہتی تھی۔ اس نکتے سے بعض جدید اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ تمام کلامی مباحث اور آراء کی وضاحت صرف سیاسی پس منظر کے حوالے سے کی جانا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ مباحث اٹھانے والا پہلا بڑا طبقہ یعنی معتزلہ کشمکشِ اقتدار کے معاملات سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ ان کے ہاں اچھے اور برے مسلمانوں کے درمیان امتیاز کا مسئلہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا تھا اور جب خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں ان کو تیسری رنویں صدی کے اوائل میں سیاسی

سرپرستی حاصل ہوئی تو انہوں نے ایسے علما کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی جو اچھے مسلمان کی تعریف کے مسئلے پر ان سے اختلاف رکھتے تھے۔

بعد کے ادوار میں بھی علمِ کلام کے مکاتبِ فکر سیاست سے متعلق رہے ہیں۔ کم ازکم بالواسطہ طور پر۔ ایسا ہونا لابدی تھا۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ آپ انسانوں کے کے ہست و بود کے بنیادی مسائل کے بارے میں ایک رائے دیں اور اس رائے کے عملی مضمرات اپنا ظہور نہ کریں۔ یہ بات آج بھی اتنی ہی درست ہے جتنی آج سے ہزار سال پہلے تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آج کے آدمی کو یہ پتا ہی نہیں کہ اس کے گردوپیش جو سوالات جنم لے رہے ہیں اور جو جوابات و دلائل دیئے جارہے ہیں وہ انہی پرانے الہیاتی مسائل و مباحث کا پرتو ہیں۔ مثال کے طور پر جبر وقدر یا تقدیر کے مسئلے کو لیجیے جس پر علمِ کلام کے مکاتبِ فکر کے مابین سب سے زیادہ اختلاف رائے ہوتا رہا ہے۔ یہ مسئلہ عیسوی تہذیب کے لیے بھی اہم رہا ہے اور آج کے لادینی سیکولر مغربی معاشرے میں بھی اسی طرح زندہ ہے۔ فرق یہ پڑا ہے کہ اب اس مسئلے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے سے دیکھا نہیں جاتا۔ مثال کے طور پر کتنے ہی معاصر اہلِ علم ایسے ہیں جو Nature versus Nurture (فطرت یا تربیت) کے مباحثے میں سرگرمی سے شامل ہیں۔ ان میں ماہرینِ نفسیات بھی ہیں، فلسفی بھی، سیاسی مفکر بھی اور ماہرینِ سماجیات و حیاتیات بھی۔ بنیادی سوال سیدھا سادہ ہے کہ انسانی نشوونما اس کی فطرت وسرشت سے متعین ہوتی ہے یا انسان تعلیم وتربیت کے ذریعے خود کو بڑی حد تک بدل سکتا ہے؟ اس سوال کا اطلاق بہت سی جگہ ہوتا ہے لہٰذا آجکل مغربی دنیا میں اس سوال سے جنم لینے والے نکات پر گرما گرم بحث چھڑی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ مرد اور عورت میں جو فرق ہے کیا

وہ محض حیاتیاتی ہے یعنی کیا ان میں فرق صرف یہ ہے کہ عورت اولاد پیدا کرتی ہے مرد نہیں کر سکتا یا ان دونوں اصناف کی ذہنی صلاحیتوں میں بھی فرق پایا جاتا ہے؟ یا ایک اور میدان کی مثال لیجیے۔ سوال کیا گیا ہے کہ جنسی رجحانات پیدائشی اور خلقی طور پر انسان میں موجود ہوتے ہیں یا معاشرے سے ان کی تعمیر ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ایک بات کے قائل ہوئے ہیں تو کچھ دوسرے مؤقف کے حق میں ہو گئے ہیں۔ جس سرگرمی اور زور شور سے ان مباحث پر دلائل کا انبار لگایا جا رہا ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جدید دانشوروں کے لیے بھی الٰہیاتی اور کلامی مباحث کا جوش و جذبہ کوئی اجنبی چیز نہیں۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل بجا ہے کہ ان مباحث پر مختلف مفکرین نے جو موقف قائم کیے ہیں اور جو دلائل دیئے ہیں وہ بہت سے عناصر سے مرکب اور بہت دقیق نوعیت کے ہیں لیکن یہی کیفیت علمِ کلام کے پرانے ماہرین کی بھی تھی۔ ان کے ہاں بھی علمی موشگافی، دلائل کی شستگی اور باریک بینی کا یہی عالم تھا۔ ''فطرت یا تربیت'' کی طرح ''جبر و قدر'' بھی ایک سہولت کا راستہ تھا جس کے ذریعے یہ مفکرین ہستیِ انسانی کے سب سے بنیادی معمے اور مسئلے تک رسائی حاصل کرتے تھے۔

اسلام کے اوائل میں علمِ کلام اس لیے ایک ضرورت بن گیا تھا کہ کچھ لوگوں کی افتادِ طبع اور فکری تقاضوں کی تکمیل اس کے سوا ممکن نہ تھی نیز اس عہد میں اسلامی معاشرے کے سماجی اور سیاسی حالات بھی اسی کا تقاضا کرتے تھے۔ تاہم علمِ کلام کو ہر کس و ناکس کے لیے موضوعِ مطالعہ بنانے کی کسی نہ بھی حمایت نہیں کی۔ یہ ایک نامناسب عمل سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے علماء نے تو اسے قرآن و سنت کے خلاف قرار دے دیا ہے۔ یا کم از کم اتنا ضرور کہا تھا کہ بنا کسی صحیح اور موزوں علمی تیاری کے اس

میں الجھنا خطرناک ہوسکتا ہے۔مثال کے طور پر امام غزالی نے اپنی بعض کتب میں علمِ کلام پر سخت تنقید کی ہے۔(اگرچہ علمِ کلام پر خود ان کی کتنی ہی تصانیف ہیں)۔ان کا کہنا یہ تھا کہ عوام کی اکثریت اگر ماہرین علمِ کلام کی نکتہ چینی اور ضرورت سے زیادہ عقلیت زدہ طرزِ فکر سے بچ کر رہے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔کلام سے ان کے ایمان کو تقویت تو کیا ملے گا،ضعفِ ایمان البتہ لاحق ہو جائے گا۔لیکن یہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے علمِ کلام کو سرے سے نابود کر دیا جاتا۔امام غزالی کا منشا یہ تھا بھی نہیں ہاں بے جا تجسس اور زیادہ مین میکھ نکالنے کے خلاف یہ دلیل دی جا سکتی تھی۔رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا کہ ''اِنَّ مِن حُسن اسلام المرءِ ان یترک مالایعنیہ'' ۸۶ (انسان کے لیے اسلام کا حسن یہ بھی ہے کہ ہر وہ چیز چھوڑ دے جو اس کے لیے لا یعنی ہے)۔آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''اَللّٰھُم اعوذُبک مِن عِلم لَا ینفَعُ'' ۸۷ (میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں اس علم سے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو)۔علمِ نافع وہ ہے جو انسان کو اپنے رب کے روبرو جانے کے لیے تیار کر دے۔علمِ کلام ایسی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔

ماہرینِ علمِ کلام کا دعویٰ یہ ہے کہ علمِ کلام ایک اہم چیز ہے کیونکہ اس سے اسلامی عقائد کے بارے میں صحیح تعلیمات کی حفاظت ہوتی ہے اور ان میں باطل نظریات کی آمیزش نہیں ہو پاتی۔لوگوں کو اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم اور درست فہم میسر نہیں ہوگا تو وہ ٹھیک سے اس کی عبادت نہیں کر سکیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بندۂ خدا ہونے کی حیثیت سے ان پر جو فرض عائد ہوتا ہے اسے ادا کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔اسلام میں ایمان کی بنیاد توحید پر اٹھائی گئی ہے اور ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر

بات پر درگذر کی گنجائش ہے سوائے شرک کے۔ لیکن ''توحید'' کے اصل معنی کیا ہیں اور شرک کیا ہے؟ اگر ہمیں قرآنی تعلیمات کا مضبوط فہم حاصل نہ ہو تو ہم توحید اور شرک کے مابین امتیاز نہیں کر پائیں گے اور نتیجے میں اگلے جہان میں تباہی سے دوچار ہو جائیں گے۔

علمِ کلام کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو علمِ کلام سب علوم میں سے اہم ترین ہے۔ کیونکہ یہی وہ یقینی اور مستند طریقہ ہے جس سے ایمانِ صحیح استوار ہوتا ہے۔ اگر ایمان نہ ہو تو ہر عمل بے نتیجہ رہ جاتا ہے۔ ایمان کے بغیر اسلام آدمی کے نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ تاہم علمِ کلام کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کی گنجائش صرف اس صورت میں تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اگر ہم یہ مان کر چلیں کہ اس کے سوا ایمان کے اخلاص اور بقا کا اور کوئی راستہ نہیں۔ ماہرینِ علمِ کلام کو یہی بات سچی لگتی ہے لیکن فلسفی، صوفیا اور بہت سے فقہاء اسے نہیں مانتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ متکلمین یعنی علمِ کلام والے مسلمانوں میں گنتی کے چند لوگ تھے۔ خلفا اور سلاطین پر کچھ ادوار میں وہ اثر انداز بھی ہوتے رہے اور ان کی آراء سے بسا اوقات بڑے بڑے سیاسی نتائج بھی مرتب ہوئے لیکن عوام کی اکثریت کے ایمان و عمل پر ان کی آراء کا کچھ ایسا اثر نہیں پڑا۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اگرچہ وہ مسائل اہم رہے تھے جن پر ماہرینِ علمِ کلام بحث کرتے تھے لیکن معتزلہ سے قبل مفکرین کا کوئی ایسا اہم اور دوسروں سے الگ طبقہ نامزد کرنا مشکل ہے جسے ہم متکلمین کا عنوان دے سکیں۔ معتزلہ کا آغاز دوسری / آٹھویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ معتزلہ کی شناخت یا امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قرآن کے دفاع اور اس کی تفسیر کے لیے اس بات پر غیر معمولی

زور دیتے تھے کہ ہر معاملے کا تجزیہ اور فیصلہ عقل کے ذریعے ہونا چاہیے۔ اگر قرآن کی کوئی آیت منطقی فکر کے خلاف پڑتی ہو تو اس کی تفسیر اس انداز میں کرنا چاہیے جس سے واضح ہو جائے کہ قرآن اور عقل کی منطق میں کوئی تضاد نہیں۔

بغداد کی خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں بہت سے اسباب کی بنا پر معتزلہ کو عروج حاصل ہوا۔ یہ اسباب سیاسی بھی تھے۔ لیکن ان کا زمانہ زیادہ دیر چلا نہیں۔ اور بالآخر ایک اور مکتبِ فکر غالب آ گیا جو اشاعرہ کے نام سے معروف ہوا۔ اس کے بانی ابوالحسن الاشعری تھے (م۔ ۳۲۴/۹۳۵ء)۔ اشاعرہ کا مکتبِ فکر گویا اسی پرانے موقف کی جانب واپسی سے عبارت تھا جو وحی کی حاکمیت اور عقل کی محدودیت کے اعتراف پر مبنی تھا۔ معتزلہ کو اس بات پر ناز تھا کہ عقل کے ہتھیار سے انہیں وہ قدرت حاصل ہوئی ہے جو ہر شے کا فہم حاصل کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں ان پر یونانی فلسفیانہ فکر کے گہرے اثرات تھے (گو انہیں اس امر کے تسلیم کرنے میں عار محسوس ہوتا تھا) اس کے برعکس اشاعرہ کے ہاں عقل کی حدود اور اس کی نارسائی کا کھل کر اعتراف کیا جاتا تھا۔

ان مباحث میں ابھرنے والے پیچیدہ دلائل کو قدرے سہل کر کے پیش کرنے کی غرض سے ہم مسئلہ خلقِ قرآن کی مثال لیتے ہیں۔ یہ مبحث ایک اور بنیادی الہیاتی مسئلے سے جڑا ہوا ہے۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ صفاتِ خداوندی اور ذاتِ خداوندی کے مابین اصل میں کیا تعلق ہے؟ معتزلہ کا انحصار عقلی اندازِ فہم اور قوانینِ منطق پر تھا سو ان کا اصرار تھا کہ جواب لازماً دو ٹوک ہونا چاہیے، نفی میں یا اثبات میں۔ یا تو ذات اور صفات ایک ہی ہیں یا صفاتِ خداوندی اللہ کی ذات سے الگ ہیں۔ منطق کے لیے یہ قبول کرنا محال ہے کہ ایک شے بیک وقت کسی دوسری شے کی عین بھی ہو

اور اس سے الگ بھی ہو۔ان کی رائے میں ذات اور صفات ایک ہی چیز تھیں۔ اگلا قدم یہ تھا کہ چونکہ قرآن اللہ کی ذات سے الگ ہے لہٰذا قرآن مخلوق ہے۔

ان کے برعکس اشاعرہ کا کہنا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو انسانی منطق کی تنگنائے کا اسیر نہیں کیا جا سکتا۔ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ جس طرح ہم اس دنیا کی چیزوں کا فہم حاصل کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔مخلوقات کے لیے تو نفی/اثبات کا کلیہ چل سکتا ہے لیکن غیر مخلوق کے لیے یہ قاعدہ لازماً کارآمد نہیں ہوتا کیونکہ اس کا تعلق حقیقت کے ایک سراسر مختلف درجے سے ہے۔مآلِ کار اشاعرہ نے ایک ایسا قاعدہ وضع کر لیا جو ارسطو کے قوانینِ منطق کو توڑ کر آگے بڑھتا ہے۔ ''صفاتِ خداوندی نہ تو ذاتِ خداوندی ہیں نہ اس سے الگ'' قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور کلامِ خداوندی جس حد تک اس کی ذات کا عین ہے اسی حد تک قرآن غیر مخلوق ہوگا۔اسی لیے اشاعرہ کا موقف خلقِ قرآن کے خلاف تھا تاہم انہیں اس بات سے انکار نہیں تھا کہ جس حد تک قرآن تحریر میں آتا ہے یا انسانوں کی زبان پر جاری ہوتا ہے اس حد تک اسے مخلوق کہا جائے گا۔

صفاتِ خداوندی کے بارے میں اشاعرہ کا پیش کردہ یہ قاعدہ اس تصور کا ایک ابتدائی اظہار ہے جو ہم اپنی کتاب میں شروع سے بیان کرتے آئے ہیں،خدا بیک وقت مخلوق سے مشابہ بھی ہے اور اس سے جداگانہ بھی،منزہ بھی ہے اور مشابہ بھی۔اشاعرہ کا بیان ان بہت سی عبارات اور طریقوں میں سے ایک ہے جن کے ذریعے تنزیہ اور تشبیہ کا ایک ایسا امتزاج وجود میں لایا جا سکتا ہے جو اپنے ظاہر میں تضاد کا شکار معلوم ہوتا ہے [۸۸]

## تصوفِ نظری Theoretical Sufism

تصوف کی فکری اور عقلی نوعیت پر گفتگو کرنے کے لیے اتنا یاد کر لینا کافی ہوگا کہ تصوف کا ہدف ہے اشیاء کے باطن پر نظر کرنا (صوفیاء کے نقطۂ نظر پر ہم اس کتاب کے حصہ سوم میں بحث کریں گے)۔اہلِ تصوف کو اس امر کا احساس تھا کہ صرف شرعی احکامات، یا ایمان مع شرعی احکامات اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ لوگ رسولِ خدا ؐ کی سنت کی کامل طور پر پیروی کر سکیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص شرعی احکام پر عمل تو کر رہا ہو مگر اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے بغیر اللہ پر ایمان رکھے ہوئے۔ اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے ایک شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے مگر نہ ایمان میں مخلص ہے نہ اس میں وہ اوصاف بیدار ہوئے ہیں جو اسے صاحبِ عجز و انکسار، بامروت، خیر اور رحمت و محبت کا نمونہ بنا سکتے تھے۔صوفیا کی کوشش یہ رہی کہ انسان کے داخل کی ان خصوصیات کی نشوونما کی جائے، ان اوصاف کو جلا دی جائے جن کی وجہ سے ایمان و عمل ہر دو کو درجۂ کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہ اوصاف عملِ صالح اور فکرِ صحیح کی تہ میں موجود تو ضرور ہوتے ہیں مگر ان کو فی الواقع بیدار کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے یہ داخلی رویے اور صفاتِ حمیدہ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ تھے۔مختصر یہ کہ صوفیاء کی آرزو یہ رہی ہے کہ وہ نہ صرف رسولِ خدا ؐ کی طرح عمل کریں (اسلام)، نہ صرف آپ ؐ کی طرح سوچیں (ایمان) بلکہ آپ ؐ کی طرح اپنے آپ میں اور ہر شے میں اللہ کے دستِ قدرت کی کارفرمائی کا شعور بھی حاصل کریں (احسان، ذکر) اور اس کے مطابق عمل کریں۔ابتدائی صوفیا نہ تحریروں میں اخلاقِ حسنہ کے حصول کو مرکز بنایا جاتا تھا۔صدق و اخلاص کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ انسان اپنے عمل کو ایسا کیونکر بنا سکتا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا

ہو؟ انکسار کیونکر پیدا ہو جب نفس سے مسلسل ایک پکار اٹھتی رہتی ہے کہ ''میں تو اس سے بہتر ہوں''۔ہم یہ کیونکر یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ساری جدوجہد اللہ کی بندگی کے لیے ہے اور ہم ہوا وہوس کے پھندے میں نہیں پھنسے؟ اللہ پر مکمل بھروسہ اور توکل کیونکر نصیب ہو جبکہ دو وقت کی روٹی بھی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہو؟

اہلِ تصوف کی طرف سے جو اوّلین کتب تصنیف کی گئیں ان میں عموماً دین کے تین اصولوں پر براہ راست کلام نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے ایک درست اور سچا تعلق استوار کرنے کے لیے ان تین اصولوں کی کیا حیثیت ہے۔امام غزالی (۱۱۱۱/۵۰۵ھ) کے زمانے تک آتے آتے البتہ کچھ صوفیاء نے توحید، نبوت اور معاد کے موضوعات پر ایک ایسے انداز میں لکھنا شروع کر دیا تھا جو ماہرینِ علمِ کلام اور فلاسفہ دونوں کے طرزِ تصنیف اور نقطۂ نظر سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا تھا۔امام غزالی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کا بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کو ان حلقوں اور ان طبقوں کے لیے بھی محترم اور قابلِ قبول بنا دیا جو اس کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔انہوں نے چند چھوٹے چھوٹے رسالے توحید اور دیگر مباحثِ ایمان کے بارے میں بھی لکھے ہیں لیکن ان کی توجہ بنیادی طور پر اس امر پر مرکوز تھی کہ انسان کے ان داخلی کمالات کو وضاحت سے بیان کیا جائے جن کی نشوونما ایک ضروری تقاضا ہے اور انہی سے انسان صحیح معنوں میں رسولِ خدا کی سنت کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے۔

امام غزالی کا نام محمد الغزالی تھا۔ان کے ایک چھوٹے بھائی تھے جن کا نام احمد تھا (م۔۱۱۲۶/۵۲۰)۔احمد غزالی نے عشقِ الٰہی پر جو کتاب (عربی میں نہیں بلکہ

فارسی میں ) لکھی وہ تصوف کی شاہکار کتب میں شمار ہوتی ہے۔اس کتاب سے صدیوں پر پھیلی ہوئی ایک طویل روایت کا آغاز ہوتا ہے جس کا خاصہ یہ تھا کہ یہاں توحید پر غور وفکر تقریباً ہمیشہ ہی عشق کے باطنی حال وواردات کے حوالے سے ہوتا تھا وہ عشق جو خود اللہ ہے۔

احمد غزالی کے ایک شاگرد اور مرید عین القضاۃ ہمدانی (م۔۱۱۳۱/۵۲۵) نے حقیقت کے تمام مدارج میں عشق کی بنیادی حیثیت کو بیان کرنے کے لیے مسلمان فلسفیوں کی زبان اور طرزِ اظہار کو استعمال کیا۔ایمان کے تین اصولوں کا جو تفصیلی بیان ان کے ہاں ملتا ہے اسے اصولِ ایمان کے موضوع پر اہلِ تصوف کا اوّلین اظہارِ خیال قرار دیا جا سکتا ہے۔اس سے پہلے یہ میدان زیادہ تر علمِ کلام کے ماہرین اور فلاسفہ کے ہاتھ میں رہا تھا۔

عرفانِ نظری یا تصوف کے نظریاتی،علمی پہلوؤں پر کلام کرنے والے لوگوں میں سب سے بڑی شخصیت ابنِ عربی کی ہے۔وہ ۱۱۶۵/۵۶۰ء میں اندلس،موجودہ سپین میں پیدا ہوئے۔۱۲۴۰/۶۳۸ میں دمشق میں انتقال ہوا۔ان کی تصانیف بہت ہیں جن میں انہوں نے ایمان کے تینوں اصولوں کے ہر ہر پہلو پر ایسی باریک بینی، ذہانت اور دوررس بصیرت سے بحث کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔اس ضمن میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گذشتہ ۶ سو سال کے عرصے میں،قرآن اور رسولِ خداؐ کو چھوڑ کر،کوئی اور شخص اللہ کے بارے میں مسلمانوں کے طرزِ فکر پر ان سے بڑھ کر اثر انداز نہیں ہوا۔ادھر کے سو سالوں میں بہت سے مسلمانوں نے ابنِ عربی کی میراثِ فکر کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا اور فکر کے دوسرے دھاروں پر زیادہ توجہ دینے لگے تھے۔تاہم ابنِ عربی کے اثرات آج بھی بہت مضبوط ہیں اور اب جبکہ مغربی

عقلیت پرستی، مابعد جدیدیت کے عہد میں آ کر، چرمرا کر ٹوٹ پھوٹ رہی ہے، بہت کم مسلمان اس قابل رہ گئے ہیں کہ علمِ کلام کے عقلیاتی طرزِ تفکر کو زیادہ سائینٹفک یا جدید تر کہ کر اس کا سہارا لیں اور اسے ابنِ عربی اور ان کے پیر کاروں کے طرزِ فکر پر ترجیح دیں۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بہت سی تحریکیں جن کو ''بنیاد پرستی'' کے عنوان سے جانا جاتا ہے اب صوفی اندازِ فکر کو اپنانے کا آغاز کر رہی ہیں۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بنیاد پرست حضرات جس حد تک بھی (علمِ فقہ کے مقابلے میں) اسلام کی فکری روایت کا سہارا لیتے ہیں ان میں ان کا مرکزِ نگاہ علمِ کلام ہی ہوتا ہے بلکہ علمِ کلام کے بھی وہ رجحانات انہیں اپنی طرف کھینچتے ہیں جن پر عقلیت پرستی غالب رہی ہے۔ بنیاد پرستی میں تو از خود کشف اور فلسفیانہ فکر کی تردید شامل ہے، یہی نہیں ان کے ہاں اسلامی روایت کے بڑے مفکرین اور اہلِ حکمت و دانش کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر بنیاد پرست تحریکوں کی مغرب کی سائنسی عقلیت پرستی سے خوب نبھتی ہے۔ انہیں یہ البتہ محسوس ہوتا ہے کہ مغرب نے اخلاقیات کو مرکزی حیثیت نہ دے کر عقلیت کی راہ سے غداری کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ بات ان کے تصور ہی سے باہر ہے کہ عقلیت پرستی اور اخلاقیات سے آزادی ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔۸۹

## فلسفہ

مسلم فلسفے کی نشو و نما بھی علمِ کلام کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ یہ دونوں طرزِ فکر اپنے ذخیرۂ اصطلاحات کے بڑے حصے کے لیے یونانی فکری ورثے کے مرہونِ منت ہیں۔ عقلی بحث و تمحیص ان کے طرزِ فکر میں جو اہم کردار ادا کرتا ہے اس کی

اصل بھی یونانی فلسفے کے اثرات میں تلاش کی جا سکتی ہے۔علمِ کلام کے ماہرین کے ہاں مرکزی حیثیت قرآن کو اور عقائدِ اسلامی کے اس فہم کو دی جاتی تھی جو علمِ کلام سے جلا حاصل کرتا ہو جبکہ فلسفیوں کے ہاں مرکزی حیثیت عقل اور یونان کی میراثِ فکر کو دی جاتی تھی۔

بحیثیتِ عمومی مسلم فلاسفہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عقل کے وسیلے سے کی گئی تلاش و جستجو حقیقت کی ماہیت کو جاننے کے لیے کافی ہے۔اہلِ کلام اپنی آراء کی تائید اور تقویت کے لیے مسلسل قرآن سے رجوع کرتے تھے جبکہ ابتدائی مسلم فلسفی یہ رجحان رکھتے تھے کہ قرآنی حوالے دیئے بغیر مشاہدہ، استدلال اور منطقی فکر کے سہارے زیرِ غور بحث کو واضح کیا جائے۔مزید براں فلاسفہ کو اس بات پر بھی فخر تھا کہ وہ یونان کی فکری راویت سے آگاہی رکھتے ہیں۔ان کے ہاں ارسطو کو ’’معلمِ اوّل‘‘ کہا جاتا تھا اور کئی ایسی باتیں تسلیم کی جاتی تھیں جن تک یونانی فلسفی اپنے فکری سفر میں پہنچے تھے۔ان کے برعکس علمِ کلام والے اس امر کے اعتراف سے کنی کتراتے تھے کہ ان کے ہاں بھی یونانی فلسفے کی چھوٹ پڑتی ہے۔ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خود قرآن مجید نے اپنے پیغام کو سمجھنے کے لیے عقل کو ایک بنیادی وسیلہ قرار دیا ہے اور یہ راستہ اسی کا مقرر کیا ہوا ہے۔

ماہرینِ علمِ کلام کے مباحث کا ہدف اگر ذات اور صفاتِ خداوندی تھا تو فلسفیوں نے حقیقت کو اپنی فکری سرگرمی کا مرکز بنایا تھا یعنی یہ تلاش کہ حقیقت کیا ہے۔تاہم اتنا کہنا لازم ہے کہ مسلم فلسفہ جس شکل میں بھی پروان چڑھا اس کی تہ میں ’’توحید‘‘ کارفرما رہی۔تمام مباحث کی بنیاد توحید پر تھی۔فلسفیوں کے ہاں سب سے زیادہ عام بحث ’’وجود‘‘ کی رہی ہے۔اس کا انگریزی میں ترجمہ being یا

existence کے الفاظ سے کیا جائے گا۔عملاً ان میں سے سب کے ہاں اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ ''وجود'' کو کئی اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔وجود اپنی خالص اور منزہ صورت میں ''ھویت محض'' ہے (pure is-ness) وہ جس کا نہ ہونا محال ہے۔یہ وہی وجود ہے جس کی طرف انبیاء نے ''خدا'' کہ کر اشارہ کیا ہے۔وجود کی اور بھی صورتیں ہیں جو آنی جانی ہے۔ظاہر ہوتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔وجودِ اصل کے مقابلے میں وجود کی یہ دوسری صورتیں جن میں وجود ظاہر ہوتا ہے اپنی کوئی الگ حقیقت نہیں رکھتیں ان کے ہونے کا تمام انحصار ''وجود'' پر ہے۔وجود کی یہی صورتیں ہمیں کائنات میں ہر طرف ملتی ہیں،موجودات مخلوقات۔

اسلامی فلسفے میں الفارابی (م۔۳۳۹/۹۵۰) کو ''معلمِ ثانی'' (دوسرا استاد) کا نام دیا گیا ہے اگر چہ اس سے قبل بھی کئی اہم فلسفی گزرے ہیں۔ان میں الکندی (م۲۵۲/۸۶۶) قابل ذکر ہے۔لیکن ابن سینا (م ۴۲۸/۱۰۳۷) کو ساری اسلامی تاریخ کا نہ ہی تو بھی ابتدائی عہد کا عظیم ترین فلسفی کہا جا سکتا ہے۔اس کے ہاتھوں یونان کی فکری روایت اسلام کے آغوش میں اپنے عروج کو پہنچی۔وہ صرف ایک بڑا فلسفی ہی نہیں تھا۔فلسفے کے علاوہ وہ تاریخ کے عظیم ترین ماہرِین طب میں بھی شمار ہوتا ہے۔علمِ طب کے عملی اور علمی دونوں پہلوؤں پر اس کا کام ایسا ہی شاندار تھا۔اس کی تصانیف میں کئی کتابیں جلد ہی لاطینی میں ترجمہ ہو گئیں اور ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اسے مغربی دنیا میں بھی ایک عظیم فلسفی اور طبیب کے طور پر جانا جاتا تھا۔

ابن سینا کے ہاں حکمتِ ایمانی اور حکمتِ یونانی کا ایک ماہرانہ اور شاہکار امتزاج ملتا ہے اور اس میں جو جامعیت ابن سینا نے پیدا کی وہ ان کا کارنامہ تھا۔تاہم بہت سے اہلِ کلام اور صوفیا کی رائے یہ رہی ہے کہ ابن سینا کے نظریات پر

یونانی افکار اور یونانی اصطلاحات کا بوجھ کچھ زیادہ لدا ہوا ہے۔ آج کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثر مسلمانوں کے ذوق کے لیے ابن سینا ذرا زیادہ ہی کتابی اور علمیت زدہ ہو گئے تھے۔ وہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ حکمتِ اسلامی کو اسلامی اصطلاحات میں بیان کیا جائے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن اور سنت کو ہر چیز سے بالاتر اور محترم رکھا جائے۔ اگر کہیں ایسی صورتحال پیدا ہو کہ قرآن مجید کا کہا ہوا ارسطو کے بتائے ہوئے سے ٹکرا جائے تو ہمیں اتنی جرأت ہونی چاہیے کہ صاف کہہ دیں کہ ارسطو نے غلط کہا تھا۔

امام غزالی نے ابن سینا کے فلسفے پر مؤثر اعتراضات کی ایک مہم چلائی۔ ایسا ہی ایک دوسرا مجموعۂ اعتراضات اس کے تقریباً سو سال بعد فخر الدین رازی (م ۱۲۰۹/۶۰۶) نے پیش کیا۔ امام رازی ان آخری ماہرین کلام میں سے تھے جن کے ہاں تمام فکری سرگرمی علمِ کلام کے تناظر تک محدود نظر آتی ہے۔ اسی دور میں کچھ اور فکری رجحانات اور سوچ کے کچھ اور دھارے بھی نمودار ہو رہے تھے۔ ہم گذشتہ سطور میں عرض کر چکے ہیں کہ غزالی برادران نے ایمان کے تین اصولوں کو تصوف کی زبان میں بیان کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کام میں اور لوگ بھی ان کی پیروی کر رہے تھے۔ صوفیاء کے سرخیل ابن عربی، امام رازی کے معاصر تھے بلکہ دونوں میں بعض مباحث پر خط و کتابت بھی رہی۔ ابن عربی کو البتہ امام رازی کے طرزِ فکر سے بالکل اتفاق نہیں تھا۔ ان کے خیال میں امام رازی عقل پر حد سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے تھے اور کشفِ حقائق ان کے بس سے باہر تھا۔

ادھر خود اقلیمِ فلسفہ کے اندر شہاب الدین سہروردی نے ایک نئے تناظر کا دروازہ کر دیا تھا۔ سہروردی ۳۸ سال کی عمر میں اسیری کے دوران ۱۱۹۱/۵۸۷ء میں

فوت ہوئے۔ یہ مردِ دانا اور مفکر ایک عجیب، غیر معمولی شخصیت کا حامل تھا۔ اس نے ابن سینا کا سارا نظامِ فکر لے کر اسے ایک نئی سمت اور تازہ اسلوب میں از سر نو مرتب کر دیا اور کشفِ حقائق کے عمل پر خاص زور دیا جسے ابن سینا نے اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ سہروردی نے اس ' فلسفۂ اشراق' میں یونانیوں کی فکرِ استدلالی اور قدیم حکمائے فارس کے طریقِ کشفِ حقائق کو یکجا کر کے ایک جامع کل کے طور پر پیش کیا۔ ان کے مطابق قدیم حکمائے ایران کے دل نورِ خداوندی کی قبولیت کا ملکہ رکھتے تھے اور اسکی ضیاء سے روشن ہو چکے تھے۔ سہروردی کا کہنا یہ تھا کہ ان کا پیش کردہ جامع امتزاج ہی وحیِ اسلام کی پوری معنویت کو آشکار کر سکتا ہے کیونکہ وحی کو سمجھنے کے لیے عقل و منطق اور کشفِ حقائق ہر دو کی ضرورت ہوتی ہے۔

سہروردی کے افکار کئی اعتبار سے ابن عربی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ تاہم سہروردی کی رائے میں فلسفیانہ روایت سے فکر و استدلال کی جو تربیت ملتی ہے وہ عقلی اور روحانی کمال کے حصول کے لیے ایک لازمی تقاضا ہے۔ اس کے برعکس ابن عربی کا کہنا یہ تھا کہ سچے اربابِ دانش ان صداقتوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کا ادراک عقل سے کیا جا سکتا ہے لیکن ذہنی جستجو اور فکری موشگافیاں فی نفسہ ایک رکاوٹ ہیں جن سے ہمیں کوئی مدد حاصل نہیں ہوتی۔ کشفِ حقائق ہی وہ راستہ ہے جو انبیاء کا راستہ تھا اور جو ان کے سچے پیروکاروں کا راستہ ہے۔

اسلامی فلسفے کو سہروردی نے جو کچھ دیا اس میں سب سے مشہور نظریہ وہ ہے جسے انکی ''مابعد الطبیعیاتِ نور'' کہا جاتا ہے۔ عام فلسفیوں کے برعکس سہروردی نے ایک فلسفیانہ موقف کے طور پر ''وجود'' کو تمام اشیاء کی حقیقتِ غائی اور بنیادِ پنہاں ہونے کے لحاظ سے موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ اس کے بجائے ان کے ہاں آخری اور

حتمی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ''نور'' کالفظ استعمال ہوا ہے۔نور کا عقلی تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ہے کہ صوفیاء کے ہاں بہت پہلے سے یہی لفظ اس حقیقت کے لیے استعمال ہوتا آیا تھا جس کا ادراک انہیں کشف کے ذریعے ہوا تھا۔نیز یہ کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام ''النور'' بھی آیا ہے۔دوسری طرف زرتشتی اساطیر میں نور کا ایک بڑا کردار رہا ہے اور سہروردی نے اسکی جانب اکثر اشارہ بھی کیا ہے۔

سہروردی کے بعد جو مسلمان فلسفی آئے ان کے فکری بنیاد وسیع تر تھی۔وہ ابن سینا،سہروردی اور اہلِ کلام میں سے متعدد لوگوں کا مطالعہ کرتے تھے۔اپنے فلسفیانہ مباحث میں ان فلسفیوں نے اکثر کشف کو بھی ایک وسیلے کے طور پر برتا اور ان کے ہاں ابن عربی کے افکار سے آگاہی حاصل کرنے کا رجحان نظر آتا ہے کیونکہ ابن عربی کی تصانیف کو اصولِ ایمان کے بارے میں نظری تعلیمات کا ایک عظیم الشان خزینہ اور سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔بعض اسلامی ممالک بالخصوص ایران میں فلسفے کی اس روایت کا تسلسل ہمیں عہدِ حاضر تک نظر آتا ہے۔

متاخرین فلاسفہ میں سب سے بڑا فلسفی شاید ملا صدرا شیرازی کو کہا جا سکتا ہے۔(م ۱۰۵۰/۱۶۴۱) ملا صدرا کی شہرت ان کی جامعیت کی وجہ سے ہے کہ ان کے ہاں فکرِ اسلامی کے تمام دھارے مل کر ایک قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔جن اصطلاحات میں ملا صدرا نے اپنے افکار پیش کیے ہیں ان پر البتہ ابن سینا کے فلسفے کا غلبہ ہے۔وحی کے بارے میں لکھتے ہوئے ملا صدرا نے نہ صرف قرآن وحدیث کو بہت غور سے دیکھا ہے بلکہ اہلِ تشیع کے ائمہ کے اقوال پر بھی توجہ دی ہے۔ابن عربی اور ان کے پیروکاروں نے کشفِ حقائق کی بنیاد پر جو نظری توضیحات پیش کی

تھیں ان کو بھی ملا صدرا نے نظر میں رکھا۔ان سب کے علاوہ ملاصدرا نے زندگی کا بڑا حصہ تصوف کے عملی مراحل طے کرنے میں صرف کیا اور اپنی نظری تعلیمات کو اپنی کشفی معلومات کی معنویت واضح کرنے کے لیے استعمال کیا۔

ملا صدرا کے ہاں تینوں اندازِ فکر، تینوں اسالیبِ فہم کو ملا کر علم حاصل کرنے کا عمل اپنے نقطۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اور یوں اصولِ ایمان (توحید، نبوت، آخرت) کو سمجھنے کا ایک جامع راستہ وجود میں آتا ہے۔ان کے ہاں اسلام کے ہر طرزِ فکر اور ہر راہِ تفہیم کا احترام اور استعمال پایا جاتا ہے اور وہ ان میں سے ہر ایک کو، توحید کو سمجھنے اور جاننے کا، ایک درست اور قابلِ عمل راستہ گردانتے تھے۔ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے پیشرو مفکرین کی ہر بات کو بے چون و چرا مانتے چلے جاتے تھے۔ہرگز نہیں۔اپنے اسلوبِ کلام اور اپنے افکار کے طرزِ اظہار میں اوّل و آخر وہ فلسفے کی روایت کے ایک نمائندے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔بنابریں ان کے ہاں سب سے پہلے ہر علمی معاملے کو، ہر نکتے کو میزانِ عقل میں تولا جاتا ہے۔اہلِ کلام کے، فلسفیوں کے اور صوفیاء کے کتنے ہی خیالات اور آراء پر ملا صدرا نے تنقید کی ہے بہت سے موقف قبول بھی کر لیے ہیں لیکن تب جب عقلی دلائل کے بنیاد پر ان کی صحت کو واضح کر لیا۔ان کا طرزِ تفکر اگرچہ پوری طرح عقلیاتی ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ فکر کو کشف کی روشنی اور وحیِ قرآنی کے نور سے جلا ملی ہے۔

# فہم و ادراک کے قطبین The Two Poles of Understanding

ہم نے عرض کیا تھا کہ کلام، عرفانِ نظری اور فلسفہ، بالترتیب، وحی، کشف اور عقل پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے اس امر کی جانب بھی اشارہ کیا تھا کہ ہر مکتبِ فکر میں بات کو سمجھنے کے دوسرے دونوں طریقے، دیگر اسالیبِ فہم بھی ایک کردار ادا کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ اہم ہے کہ حصولِ علم کے ان اسالیب کے مختلف ہونے کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیا جائے ورنہ امکان رہے گا کہ ہم ان اسالیب کو ایک دوسرے کی ضد تصور کرنے لگیں گے جبکہ دراصل یہ معاملہ ہے کسی بات کو سمجھنے، اس کی تہ تک پہنچنے کے تین انسانی اسالیب کا، تین طرز ہائے فہم کا جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی افتادِ طبع عقلیت کی طرف مائل ہوئی ہے وہ قدرتی طور پر ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ اسلوب کی طرف کھنچتے ہیں۔ یہ تین مکاتبِ فکر ارکانِ ایمان کو جاننے اور سمجھنے کی انسانی صلاحیت کے تین اظہار ہیں اور ان میں اس صلاحیت کی سماجی اور منظم تجسیم ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

اسلام میں علم حاصل کرنے یا فہم انسانی کے ان تین اسالیب یا تین مکاتب فکر کی مثال جدید دنیا میں علم کے بارے میں پائے جانے والے نقطہ ہائے نظر میں بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہاں بھی لوگ فطری طور پر فلسفے، یا مثال کے طور پر سائنس یا فنون کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اسلام کے حوالے سے دیکھیے تو اس کے تینوں اسالیبِ فہم، ایمان اور توحید میں اپنی بنیاد رکھتے ہیں جبکہ دنیائے جدید میں ان تینوں

اسالیب کو مشترکہ اصولوں کی کوئی ایسی بنیاد میسر نہیں ہے۔ (البتہ یہ کہا جا سکتا ہے اصولوں کا فقدان ہی ان کا مشترکہ اصول ہے)

چونکہ توحید اسلامی فکریات کی مشترک اساس اور موضوع ہے لہٰذا اس کے حوالے سے فہمِ انسانی کے مختلف اسالیب کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ بہ الفاظِ دگر اگر ہمارے سامنے توحید کے فہم کے تین انداز، تین طریقے ہوں تو ہم یہ امتیاز کر سکتے ہیں کہ بہ اعتبار توحید ان میں فرق کیا ہے، انہیں ایک دوسرے سے کیسے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔

ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ تقاضائے توحید یہ ہے کہ حقیقت کے بارے میں دو ایسے تناظر سامنے آئیں گے جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوں۔ ان کو ''تنزیہ'' اور ''تشبیہ'' کہا جاتا ہے۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں کے مابین پورا توازن رکھا جائے۔ تاہم، ہم یہ بھی جانتے ہیں انسانی نشوونما کے ابتدائی مراحل میں ''تنزیہ'' کو کسی حد تک ایک حقِ ترجیح حاصل ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ تنزیہ سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی اور انسانوں کا چھوٹا پن پوری طرح کھل جاتا ہے یا یوں کہیے کہ الحق کا حقیقی ہونا اور بے حقیقت کا بے حقیقی ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کا اپنے رب سے صحیح رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اسی سے ان کو سمجھ آتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور انہیں بندوں ہی کی طرح عمل کرنا چاہیے۔ اسی سے انہیں اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اسلام ان کے لیے لازم ہے۔ انہیں کھل کر اپنی ناقص سرشت ونہاد کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس کی تہذیب واصلاح کے لیے اس ہدایت ربانی کی پیروی کرنا چاہیے جو انبیاء کے ذریعے ان تک پہنچی ہے۔

انسانی نشوونما کے ابتدائی مراحل میں تشبیہ کا سرے سے انکار ہونا چاہیے یا کم

ازکم اسے پس منظر میں رہنا چاہیے۔تنزیہ سے اگر انسانی اور ربانی کے مابین فرق کا احساس اجاگر ہوتا ہے تو تشبیہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان میں کچھ خدائی چیزیں بھی ہیں۔تاہم اللہ تعالیٰ سے یہ مشابہت، یہ خدا آسا ہونا ابتداء میں ہمارے لیے کوئی مدد فراہم نہیں کرتا۔یہ دعویٰ تو کیچڑ، مچھر اور زہریلے پودے بھی کرسکتے ہیں۔

اگر الحق سے مشابہت کا کوئی فائدہ ہے تو اس کو اسی انداز میں قائم ہونا چاہیے جو الحق کی منشاء ہے۔بالفاظِ دگر انسان کو اس کے فہم میں لازماً انبیاء کی پیروی کرنا چاہیے اور اس مشابہت کو اسی انداز میں سمجھنا چاہیے جس انداز میں الحق کے پیغامبروں نے اسے سمجھا تھا۔اس فہم تک رسائی کے لیے انسان کو اللہ کی ہدایت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ انسان کو یوں یک لخت اپنی بارگاہ میں، اپنے حضور نہیں بلا لیتے۔اس کے لیے انسان کو پہلے اپنے ارادہ و اختیار سے اس کا بندہ بن کے دکھانا ہوتا ہے۔اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان اس کے قرب میں داخل ہو اور اس کائنات میں اس کی نمائندگی کرے۔خلافت کا دارومدار عبودیت اور بندگی پر ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تشبیہ کے درست ادراک کا انحصار تنزیہ کے صحیح فہم پر ہے۔

اگر انسان ہونے کے دو مختلف لیکن ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے اسالیب یعنی بندگی اور خلافت کو تنزیہ و تشبیہ کے حوالے سے بیان کیا جاسکتا ہے تو فہمِ انسانی کے دو مختلف مگر تکمیلی اطوار کو، انسانی سمجھ کے دو مختلف مگر ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے طریقوں کو بھی انہی کے حوالے سے واضح کیا جاسکتا ہے۔تنزیہ کو سمجھنے کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے دور ہونے، انسان سے الگ اور جدا ہونے، منزہ و برتر ہونے اور انسان کے رسائی سے باہر، ماوراء ہونے کو سمجھنا۔تشبیہ کو سمجھنے کا مطلب

ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے، مشابہ ہونے، ہر جا اور ہر آن حاضر ہونے اور ہر چیز کے اندر ہونے کو سمجھنا۔ پہلے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو زور ہوگا غیریت پر، دوسرے اعتبار سے دیکھیے تو مشابہت پر زیادہ زور دیا جائے گا۔

وہ مسلمان مفکرین جنھوں نے ان دو اسالیبِ فہم کا تجزیہ کیا ہے، تنزیہ کو عقل سے منسوب کرتے ہیں جبکہ ان کی رائے کے مطابق کشف اور خیال کا تشبیہ سے ایک قریبی تعلق ہے۔ اس نکتے کی قدرے وضاحت درکار ہے لیکن ایک مرتبہ اسے سمجھ لیا جائے تو یہ دیکھنا آسان ہو جائے گا کہ اسلامی تہذیب کے اندر ہر اسلوبِ فکر نے کیونکر دوسرے اسالیبِ فہم پر تنقید کرنے یا اس کی آراء اور نتائجِ فکر کا رد کرنے کے باوجود توحید پر توجہ مرکوز کیے رکھی۔ مزید براں معاملے کو اس رخ سے دیکھنے سے شاید ہم یہ بھی سمجھ سکیں کہ مغربی تہذیب میں اس طرح کے متوازی نقطۂ نظر کیوں پائے جاتے ہیں اور آرٹ اور سائنس، اساطیر اور عقلیت، باطنیت اور منطق یا وجدان اور فکرِ استدلالی کی راہیں الگ الگ کیوں ہو جاتی ہیں۔

تنزیہ کا مطلب ہے کہ الحق کو بطور "غیر" کے بطور ایک ماوراء وجدا گانہ ہستی کے سمجھا جائے۔ اس سے انسان اس امر کا اثبات کرتا ہے کہ وہ ایک چیز ہے اور خدا کچھ اور ہستی ہے جو انسان سے بالا و ماوراء اور الگ ہے۔ عقلِ جزوی فہم کا وہ طریقِ کار ہے جو حقیقت کو تجزیے کے ذریعے توڑ توڑ کر اور الگ الگ کرکے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عقلِ جزوی سے سمجھنے کے لیے ہم اصولِ استثناء قائم کرتے ہیں یعنی یہ کہ ایک چیز یا تو یہ ہوگی یا وہ۔ بیک وقت دونوں نہیں ہو سکتی۔ یہ سیدھا سا منطقی قاعدہ ہے اور منطق ہی میں عقلِ جزوی کی خلقی خاصیت ظاہر ہوتی ہے۔

جب انسان الحق کو عقلِ جزوی کی مدد سے سمجھنے کی سعی کرتے ہیں تو اختلاف

اور جدا گانہ حیثیت یعنی تجزیہ کا اصول کارفرما ہوتا ہے کیونکہ عقلِ جزوی صرف اسی ایک انداز سے حقیقت کو دیکھ سکتی ہے۔عقل اپنے گردوپیش کے مظاہر پر نظر کرتی ہے اور اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مظاہر سے مختلف ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات کی جھلک عقل جزوی کو بھی کسی حد تک ہر شے میں نظر آتی ہے لیکن یہ ان صفات کو اشیاء سے جدا کر کے دیکھتی ہے۔مثال کے طور پر عقلِ جزوی کے تناظر میں یہ تو دیکھا جاتا ہے کہ رحمت ایک صفتِ خداوندی ہے۔یہ بھی معلوم ہے کہ ایک ماں اپنے بچے سے جو تعلق رکھتی ہے اس میں یہی صفتِ رحمت ظاہر ہو رہی ہے لیکن یہاں آ کر وہ رحمت کو ماں سے الگ کر کے اسے ''مجرد'' بنا دیتی ہے۔مجرد کرنے یا ''تجرید'' کا مطلب ہوتا ''دور کر دینا، الگ نکال لینا''۔عقل کے تمام کاموں، اس کے طریقِ کار کا خاصہ یہی تجرید ہے۔عقل تمام صفات کو ان اشیاء سے الگ کر لیتی ہے جن میں یہ صفات ظہور پذیر ہوئی ہوتی ہیں اور علمِ کلام کے نقطۂ نظر کے مطابق، ان کو دور، ماوراء بنا کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود بتاتی ہے۔اس کا حاصل کیا ہوتا ہے، مختلف ہونا جداگانہ ہونا، دوری اور فاصلہ......یعنی تجزیہ۔

عملی اعتبار سے دیکھیے تو یہ نظر آئے گا کہ عقلِ جزوی کی کارفرمائی کا نتیجہ فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ اختلاف اور تجزیہ کاری پر زیادہ زور دیا جانے لگتا ہے۔چیزوں کو ایک دوسرے سے اور اللہ تعالیٰ سے الگ کر کے، جدا کر کے دیکھنے کے عمل میں عقل کثرت اور تعدد پر مرکوز رہتی ہے۔ریاضی انسان کو الگ اور جدا جدا چیزوں سے معاملہ کرنے کا وسیلہ فراہم کرتی ہے۔اس لحاظ سے ریاضی عقلِ جزوی کا بہترین آلہ ہے۔تاہم، ہوتا یہ ہے کہ انسان مختلف ہونے پر جتنی زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے اسی قدر انسانی کاوشیں اور معاملات ایک دوسرے سے جدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

انسان اگر صرف اللہ کی تنزیہ، اس کے ماوراء اور مختلف ہونے اور اس کائنات کا غیر ہونے پر ہی سوچتا رہے تو انجامِ کار یہ کائنات اس کے لیے وحدت اور یکتائی سے دور کی چیز معلوم ہونے لگے گی کہ وحدت اور یکتائی اللہ کی صفات ہیں۔ اگر آپ اللہ کے بعید ہونے، ماوراء ہونے پر ہی زور دیتے چلے جائیں گے تو آپ کے پاس ایک ایسی کائنات رہ جائے گی جس کا اللہ سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس کا صرف ایک مطلب ہے کہ انسان کے پاس اللہ کا تصور تک باقی نہ رہے اور وہ دہریہ یا لاادری ہو جانے کو ایک منطقی چیز جاننے لگے۔

خدا کے دور ہونے پر ایک سرے سے متواتر زور دیتے جایئے تو ایک نقطہ وہ آ جاتا ہے جب اللہ کو مرکز بنا کر سوچنا ایک کارِ بے مصرف بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن خدا کے تصور کے بغیر، ایک حتمی مرکز، الحق، الواحد، الاحد کے تصور کے بغیر انسان کے پاس کوئی راستہ نہیں جو اسے یہ دکھا سکے کہ یہ کائنات کس طرح مربوط ہے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ انسانی علم اور انسان کا عمل زیادہ سے زیادہ منتشر اور ہم آہنگی سے محروم تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جدید مغربی دنیا کی مثال ہمارے سامنے ہے جو گذشتہ کئی صدیوں سے عقلِ جزوی کی اندھا دھند پیروی میں لگی ہوئی ہے۔ سنجیدہ علمی مباحث کی دنیا سے خدا کو کب کا **ملک** بدر کیا جا چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں وحدت پیدا کرنے کا کوئی اصول نہیں ہے گو کتنے ہی سائنسدان اور فلسفی ایسے کسی اصول کی تلاش میں اپنی کوششیں صرف کر رہے ہیں۔ سائنس اور علم کے مختلف شعبے میں اپنے اپنے طور پر محدود تر ہوتے جا رہے ہیں، ان کی باہمی بے تعلقی میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہر شعبہ زیادہ سے زیادہ اختصاص کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

علم کی یہ بڑھتی ہوئی ژولیدگی اگر دیکھنا ہو تو اس کا سب سے صاف نمونہ بے

حدو حساب پھیلتے ہوئے طغیانِ معلومات اور اطلاعات میں عیاں نظر آتا ہے جس کا نہ کوئی اختتام ہے نہ انجام۔ انسانوں کے درمیان ابلاغ کا رشتہ دشوار تر ہوتا جا رہا ہے کیونکہ ہر شخص کی سمجھ بوجھ، اس کی فہم اپنی بساط بھر معلومات ہی کو گرفت میں لا سکتی ہے اور معلومات کی تفصیلات کا انبار اتنا ہے کہ انسان اس کے چھوٹے سے حصے کو بھی بمشکل جذب کر پاتے ہیں۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ ساری سائنسی معلومات جو اکٹھی کی جا چکی ہیں اور مسلسل کی جا رہی ہیں ان کا باہمی ربط کیا ہے۔ علم کے وہ شعبے جنہیں کبھی چھوٹا سمجھا جاتا تھا ان کے بھی مزید ذیلی شعبے بنتے جا رہے ہیں اور ان کی معنوی یک رنگی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ سائنسی تعلیم اور یونیورسٹی کی تدریس کی سطح پر اس کا نتیجہ ہے بڑھتی ہوئی اختصاصیت، کسی محدود سے شعبے میں کوئی خاص مہارت۔ ہر شعبے کا اپنا میدان ہے اور اس میں مہارت رکھنے والے لوگ ہیں لیکن مختلف میدانوں کے ماہرین ایک دوسرے سے قطعاً الگ زبان بولتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔

سائنسدان کے معنی اب ماہرِ طبیعیات کے نہیں رہے بلکہ ماہر ''ذراتی طبیعیات'' یا ''کائناتی طبیعیات'' کے ماہر یا کسی اور نوع کی طبیعیات کے ماہر۔ طبیعیات کے ہر ذیلی شعبے میں معلومات کا روز بروز بڑھتا ہوا ایک ڈھیر ہے اور ہر شعبے کے ماہر کو اس سے باخبر رہنے کے لیے اپنے شعبے کی تنگنائے علم کے بیسیوں مجلّات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے شعبوں کے ماہرینِ طبیعیات سے تبادلۂ خیال کرنا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے گو ایک عام آدمی کی نظر میں یہ سب لوگ ایک ہی میدان میں کام کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ بات ابھی طبیعیات سے آگے نہیں بڑھی۔ حیاتیات، ارضیات، یا دیگر ٹھیٹھ سائنسی علوم کا ابھی ذکر نہیں آیا۔ پھر عصب

شناسی (نیورو سائنس) کا کیا ہو گا؟ جس میں ماہرین ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ ''ریسرچ کی وہ کثرت ہے کہ یہ شعبہ علم چاہِ بابل بن گیا ہے'' ۔۹۰

سماجی علم کے بارے میں کیا کہا جائے گا اور علومِ انسانی کے مختلف شعبوں کا معاملہ کیا ہوگا؟ اور تو اور فلسفے کے میدان میں بھی کیفیت یہی ہے جس کے بارے میں ہر انجان شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ کم از کم یہاں تو ذی عقل حیوانِ ناطق ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے قابل ہوں گی، ان میں بامعنی مکالمہ ہوتا ہوگا لیکن حالت یہ ہے کہ یہاں بھی شدید ترین اختلافِ رائے اور بے تحاشا لڑائی جھگڑے پائے جاتے ہیں لہٰذا حیرت نہیں ہوتی جب ہم اپنے معاصرین کی طرف سے یہ تبصرہ سنتے ہیں کہ جدید فکری زندگی کی شناخت اگر کسی چیز سے ہوتی ہے تو وہ ہے جزویت، انتشار اور ٹوٹ پھوٹ۔

انسانی عملی کی سطح پر دیکھیے تو ایسے کرچی کرچی علم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ باگ معاشرے میں جو کچھ کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ٹکراتا رہتا ہے۔ سماج کا تانا بانا بکھرنے لگتا ہے، گروہ در گروہ چھوٹے چھوٹے ذیلی معاشرے بنتے چلے جاتے ہیں اور ہر گروہ اپنے آپ کو جوڑنے کے لیے محدود مطمعِ نظر اور تنگ سے تنگ فکری آدرش اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جدید لوگوں کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ کشف کی نوعیت کو سمجھ سکیں کیونکہ ہمارے تمدن میں عقلِ جزوی اور عقلیت پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ہر دوسری چیز اس کے مقابلے میں ماند پڑ گئی ہے۔ کشف کے لیے جو لفظ انگریزی میں استعمال ہوتا ہے (unveiling) اس کا تجزیہ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے معاون ہو گا۔ Veil حجاب یا پردہ وہ چیز ہے جو الگ کرے، جدا کر دے، وہ چیز جو دیکھنے اور سمجھنے

میں روک بن جائے۔ پردہ یا حجاب ایک کپڑے کا لٹکا ہوا ٹکڑا بھی ہو سکتا ہے اور دیوار، جھاڑی، بادل کا ٹکڑا، چہرے کا تاثر یا شبِ تاریک بھی۔ حجاب انسانی بدن کا بھی ہو سکتا ہے جو نفسِ انسانی کو دیکھنے میں آڑ بن جاتا ہے۔ تاریکی بھی ایک پردہ ہے کیونکہ تاریکی فقدانِ نور ہے۔ حجاب جہالت کا بھی ہوتا ہے کیونکہ جہالت ذہن کی تاریکی ہے۔ رعونت، تکبر، رشک وحسد، لالچ اور سو دوسری برائیاں ایسی ہیں جو نفس کو سکیڑ کر اتنا تنگ بنا دیتی ہیں کہ اپنی حدود سے آگے دیکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

نور خود ایک حجاب بن سکتا ہے۔ افراطِ نور کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو فقدانِ نور کا، آنکھ چکاچوند ہو جاتی ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وضاحتِ بیاں ہر اس شخص کے اوپر سے گزر جائے گی جس کی فہم اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہی اس نکتے کی توضیح ہے کہ قرآن مجید بیّن ترین اور کھلی ہوئی روشنی ہونے کے باوجود انسان کی گرفت میں نہیں آتا۔ انجیلِ یوحنا کے الفاظ میں ''تاریکی میں نور فروزاں ہوتا ہے مگر تاریکی کو نور کا ادراک نہیں ہوتا'' خلاصہ یہ ہے کہ حجاب یا پردہ وہ ہے جو ہمیں اپنے علاوہ ہر دوسری شے سے الگ کر دے، وہ جو ہر دوسری شے کے فہم میں مانع ہو جائے۔

unveiling یا کشف (کھولنے، پردہ ہٹانے) کا مطلب ہے اس دوری، علیحدگی کو ختم کر دیا جائے جو نظر کے لیے روک اور فہم کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی ہے یعنی دو چیزوں کے درمیان، میرے اور میرے غیر کے درمیان جو فرق اور اختلاف ہے اس پر کسی حد تک اور کسی طور غالب آیا جائے۔ وسیلۂ علم کے طور پر، علم حاصل کرنے کے لیے ایک ڈھب کے طور پر کشف جب کارفرما ہوتا ہے تو یہ اشیا کو توڑ کر، جدا کر کے نہیں دیکھتا، انہیں ایک دوسرے سے جوڑ کر ملا کر دیکھتا ہے۔ اس کی

خاصیت ہے اشیاء کی وحدت، کلیت، یکسانیت، مشابہت اور عینیت کو دیکھنا۔ کشف اس امر کا ادراک کرتا ہے کہ ہر شے اللہ کی ایک نشانی ہے اور اسی کی حقیقت کے ظہور کی علامت ہے۔ اس چیز کا ادراک اسے استدلالی فکری اور مجرد انداز میں نہیں ہوتا بلکہ بلاواسطہ اور براہ راست۔ عالمِ خارجی کی ہوں یا عالمِ باطنی کی، کشف جب اشیاء پر نظر کرتا ہے تو اس بات کا ادراک کر لیتا ہے کہ ہر شے کی بقاء اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔

کشف unveiling کا لفظ ایک خاص نوعیت کے ادراک اور فہم کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کا دارومدار سراسر اس بات پر ہے کہ انسان نے کس حد تک خود کو انبیاء کے راستے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ قاعدہ یہی ہے کہ کشف صرف پختہ ایمان رکھنے والے ان لوگوں کو میسر ہوتا ہے جو شریعت کی پوری احتیاط سے پابندی کرتے ہیں اور اپنے صدق و اخلاص کی نشوونما ایک خاص نہج پر کرتے ہیں (اس خاص طریقے یا نہج پر گفتگو کتاب کے تیسرے حصے میں ہوگی)

اس سلسلے میں ایک اور لفظ بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس کا مفہوم ''کشف'' سے وسیع تر ہے اور اس سے فہم وادراک کی ہر اس نوع کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے جس سے عینیت یا دوسری شے سے یکسانیت وہم آہنگی پیدا ہوتی ہو۔ ادراک کا یہ انداز انبیاء کے ماننے والوں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوتا ہے نیز اس کے لیے ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ حضورِ الٰہی Presence of God کا ادراک بھی نصیب ہو جائے۔ یہ لفظ ہے ''خیال'' imagination۔ اس کے بارے میں کافی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس وقت ہم جس نکتے پر بات کر رہے ہیں اس کے حوالے سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ خیال کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ

عقلِ جزوی اور کشف دونوں اسالیبِ فہم میں فرق اور امتیاز قائم کرنے میں ہماری مدد کر رہا ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ خیال کا تعلق ابہام کی دنیا سے ہے، نیمے دروں نیمے بروں، ہر دو اطراف کے زیر اثر۔ کسی چیز کی شبیہ نہ تو خود وہ چیز ہوتی ہے نہ اس چیز سے یکسر الگ ایک شے دگر۔ علمِ کائنات کے حوالے سے بات کیجیے تو یہ کہا جائے گا کہ خیال ہر اس چیز کو کہا جا سکتا ہے جو نہ تو پوری طرح مرئی ہو نہ سرے سے اوجھل، نہ خالص نور نہ محض مٹی، نہ صرف روح نہ فقط بدن۔ اسلامی نفسیات کے تناظر میں ''خیال'' کی اصطلاح کا اطلاق نفس پر ہوتا ہے جو نہ صرف بدن ہے نہ فقط روح بلکہ ان دونوں کے درمیان کی ایک چیز۔ جس سیاق وسباق میں ہم گفتگو کر رہے ہیں اس میں ''خیال'' کا لفظ فہم کے ایک ایسے ڈھب، جاننے کے ایک ایسے اسلوب کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یکسانیت اور مشابہت کا ادراک ہوتا ہے۔ یکسانیت اور عینیت کا مطلب ہے دونوں اطراف کو ملا دینا۔ خیال کا کام ہے شبیہ وعکس کو دیکھنا اور آئینہ خیال میں جو شبیہ نمودار ہوتی ہے اس میں دو چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں، شبیہ کو دیکھنے والی ہستی اور جو چیز اپنا عکس یا شبیہ پیدا کر رہی ہے۔ شبیہ میں ہر دو یکجا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ آئینے میں ابھرنے والی شبیہ، آئینے اور منعکس ہونے والی شے دونوں سے مل کر بنتی ہے، اسی طرح خواب میں آنے والی شبیہ بھی نفسِ انسانی اور اس شے کا مرکب ہوتی ہے جو خواب میں نظر آ رہی ہوتی ہے۔

دینی اصطلاح یا الہیاتی اسلوب میں کہیے تو ادراکِ خیالی کا تعلق بنتا ہے تشبیہ سے۔ کشف unveiling کا خاصہ ہے کہ وہ اشیاء کو ان سے مناسب رکھنے والی شبیہوں ہی میں دیکھتا ہے لہذا کشف سے اللہ تعالی کے کائنات اور نفسِ انسانی میں

ہر جا اور ہر آن ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عقل یہ واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب میں ہے۔ نگاہِ خیال جانتی ہے کہ یہ نشانیاں، آیاتِ خداوندی اسی ''سے'' ہیں جبکہ عقل ہمیں بتایا کرے کہ یہ آیات اس ''کی'' نشانیاں ہیں۔ جب عقل قرآن کی آیت ''فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ'' (۲:۱۱۵) (جدھر بھی رخ کروں وہیں روئے خداوندی ہے) سنتی ہے تو بہت سی ایسی تاویلیں گھڑ کے ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قرآن کا مطلب وہ نہیں جو کہا جا رہا ہے۔ خدا کا چہرہ نہیں ہے، خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا اور خدا تو دراصل ہم سے بہت دور ہے۔ لیکن کشف جدھر رخ کرتا ہے ادھر چہرۂ خداوندی دیکھتا ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ کشف جانتا ہے اللہ تعالیٰ فی الواقع یہاں بھی ہے اور وہاں بھی، ہر جا، ہر آن، حاضر و ناظر۔

انسان کی عملی زندگی کے وسیع میدان کو لیجیے تو ''خیال'' وہ اسلوبِ فہم ہے جو شگاف پُر کرتا ہے اور یکسانیت اور عینیت کا ادراک کرتا ہے جبکہ عقلِ جزوی مختلف ہونے کا ادراک کرتی ہے۔ ''خیال'' کے وسیلے سے سمجھنے کی سب سے واضح مثال شاعری، موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں نظر آتی ہے۔ شعراء اور فنکار ان چیزوں میں بھی ربط و تعلق دیکھ لیتے ہیں جہاں ہمیں آپ کو صرف اختلاف نظر آتا ہے۔ شعری تماثیل کا انحصار بالعموم ایک لطیف نوعیت کی عینیت اور یکسانیت کے ادراک پر ہوتا ہے جو عقلِ جزوی خود سے کبھی دریافت نہیں کر سکتی۔ جس حد تک ہماری قوتِ متخیلہ زندہ ہو گی، صحیح و سالم ہو گی اسی حد تک اس میں اشیاء کے درمیان اس یکسانی اور اندرونی ہم آہنگی کا احساس قوی ہو گا خواہ عقلِ جزوی اسے یہ بتایا کرے کہ اس دنیا کی چیزیں حقیقت میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

عقل کا کام ہے تنزیہ کو سمجھنا اور تنزیہ کے بغیر نہ کوئی اسلام ہے نہ عبد و معبود اور یہ اگر نہ ہو تو پھر ''تشبیہ'' رہے گی نہ خلیفۃ اللہ۔ جبکہ خیال سے تشبیہ کے متحقق ہونے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ خیال کے اسلوبِ فہم ہی کا کرشمہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کے رگ و ریشے اور جسم و جان میں سرایت کر جاتا ہے۔ عقل کو اللہ تعالیٰ اور قرآن مجید دور اور ماوراء دکھائی دیتا ہے، خیال انہیں انسان کے قریب پاتا ہے۔ عقل کا اصرار ہے کہ خدا سے ایک فاصلہ رکھا جائے جبکہ خیال اسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ عقل ناظر اور منظور، موضوع اور معروض کو الگ الگ کر کے دیکھتی ہے۔ جبکہ خیال یہ سمجھتا ہے کہ شاہد ہی مشہود ہے۔

یہاں پر ہم اس نکتے پر زور دینا چاہتے ہیں کہ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک نقطۂ نظر کو بھی فراموش کر دیا جائے تو ہم توحید کو بگاڑ دیں گے، اس کو جھٹلانے لگیں گے۔ توحید کی تردید کرنے کا مطلب ہے شرک کو ہوا دینا یعنی اللہ کے سوا دوسری کسی حقیقت کو اس کا شریک ٹھہرانا۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ صرف اتنا کہ کر فارغ ہو جائیں کہ ''اللہ تعالیٰ بہت دور اور ماوراء ہے'' نہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ''اللہ قریب ہے'' کا اعلان کر کے بات کو ختم کر دیں۔ دونوں نقطہ ہائے نظر کا اختلاف واضح رکھنے کے لیے ہمیں ان دونوں کے درمیان الٹ پھیر کرنا لازم ہے۔ انسان کی حقیقت کا تقاضا عبودیت بھی ہے اور خلافت بھی، تنزیہ بھی ہے اور تشبیہ بھی۔ کسی ایک کو بھلا دینے کا مطلب ہے ایمان اور علم کی سالمیت کو تباہ کر دینا۔

اگر ہم صرف تنزیہ پر ہی زور دیتے چلے جائیں اور تشبیہ کو نظر انداز کر دیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مخلوق سے خالق کے دور ہونے کا ادراک مستقل ہو جائے گا۔ اگر خدا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوگا تو عملاً وہ اپنی مخلوق سے کٹ کر رہ جائے گا۔ یہ بھی ایک

طرح سے وہی چیز ہے مغربی دنیا میں ڈی ازم Deism کہا جاتا ہے اور اسلام نے اسے ''تعطیل'' کا نام دیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے منصب سے الگ کر دینا، اس کائنات میں اس کی کارفرمائی کو معطل کر دینا۔ جب اللہ تعالیٰ کو مستقل طور پر دور دور رکھا جائے گا تو یہ دنیا اور خاص طور پر اس میں انسانی ماحول ایک خودمختار اور آزاد حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ معاملات اگر ہمارے اختیار میں ہیں، نگرانِ اعلیٰ انسان ہے تو پھر گویا ہم اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو شریک ٹھہرا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تنزیہ پر حد سے بڑھا ہوا زور بالآخر چھوٹے چھوٹے خداؤں کی کثرت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو ہماری اس دنیا کی ترجیحات کا فیصلہ کرنے لگتے ہیں۔ عقل کا فطری میلان سامنے رکھیے تو ان خداوندانِ جدید کے نام مجرد ہی ہوں گے۔ مثلاً ''تقدم و پیش رفت''، ''اشتراکیت''، ''کمیونزم''، ''سائنس'' اور ''ترقی''، لیکن ان کے پجاریوں کے لیے یہی پوری طرح حقیقی ہیں۔ بلکہ دراصل یہ اتنے حقیقی ہیں کہ ان کی تقدیس کے خلاف آواز اٹھانا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں چند خداوندانِ نو کے نام پر اس تباہی کی وجہ سے حرف آ چلا ہے جو ان کی پرستش نے جدید دنیا میں پھیلا رکھی ہے لیکن ایک دیوتا رخصت ہوتا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لیے ایک اور جھوٹا خدا آن موجود ہوتا ہے۔

تشبیہ کو فراموش کرنے سے اگر شرک ابھرتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ شرک اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تنزیہ کو بھول کر صرف تشبیہ کا اثبات کیا جاتا ہے۔ تشبیہ کے تناظر میں، اس کے زاویۂ نگاہ سے ہر شے میں خدا کا پرتو ہے۔ تنزیہ سے انسان یہ سیکھتا ہے کہ اشیائے کائنات ایک دوسرے سے الگ، ممتاز، جدا ہیں، ہم آہنگی نہیں رکھتیں جبکہ تشبیہ یہ بتاتی ہے کہ یہی اشیاء ہم آہنگ ہیں، جڑی ہوئی ہیں اور ایک

وحدت میں منسلک ہیں۔ دونوں تناظر ایک دوسرے کی اصلاح کرتے ہیں افراط و تفریط کا امکان پیدا نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ صوفیاء تشبیہ پر زور دیتے ہیں۔ ان کے ہاں اشیاء کے مابین پائے جانے والے فرق کو بے اہمیت قرار دینے کا رجحان اکثر نظر آتا ہے اور وہ تمام کثرت کو اللہ تعالیٰ ہی کی جلوہ فرمائی سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں علوم و فنون کے مختلف شعبے یکساں حقائق تک لے جانے کے متعدد راستے ہیں۔ فرق و امتیاز کچھ ایسا اہم نہیں، یکسانیت اور عینیت ہی اشیاء کا اصل وصف ہے اور غلبہ اسی صفتِ تشبیہ کو حاصل ہے۔

اس طرح کا صوفیانہ نقطۂ نظر اگر حد سے باہر ہو جائے تو انسان یہ بھول جاتا ہے کہ الحق اس دنیا سے مختلف اور الگ ہے۔ پھر وہ اس دنیا کو حقیقی، قابلِ قدر، اچھی اور مقصود و مطلوب سمجھنے لگتا ہے۔ دنیا کی ہر شے الوہی اور ربانی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ تاہم ہر شے میں یکساں حقیقتِ خداوندی کا یہ مشاہدہ تا دیر برقرار نہیں رہتا اور کچھ چیزوں کو جلد ہی چھوٹے خداؤں کی حیثیت مل جاتی ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو حقیقی جاننے لگتا ہے۔ ''میں ربانی ہو، پرتوِ خداوندی میرے اندر ہے، میں حقیقی ہوں، اور دوسروں کو وہ حقوق حاصل نہیں ہیں جو مجھے حاصل ہیں کیونکہ ان کی حقیقت اتنی ہی ہے جتنی میری حقیقت سے انہیں ملی ہے''۔ یہ موقف اختیار کرنا اور پھر اس کے منطقی نتائج کی راہ پر گامزن ہونا پاگل پن کی طرف لے جاتا ہے اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ روایتی طور پر دیوانگی کو عقل سے پیدا ہونے والے شعور امتیاز سے محرومی سمجھا جاتا تھا یعنی عقل کی گرفت کمزور ہو جائے اور خیال و تخیل بے قابو ہو کر پھیلتا چلا جائے تو اسے دیوانہ پن کہا جائے گا۔

اللہ قریب ہے کہ نقطۂ نظر پر اگر مسلسل زور دیا جاتا رہے تو اس سے ایک اور طرح کی منہ زور جذباتیت بھی جنم لیتی ہے جو آجکل خاص عام ہو گئی ہے۔اس کے دعویدار ہمیں یہ بتانے چلے ہیں کہ ہر شے ایک ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہر شے اور ہر انسان سے برابر محبت کریں۔ بہ الفاظِ دگر، اللہ نے ہمیں خیر و شر میں تمیز کی جو صلاحیت دی ہے، صحیح اور غلط میں جو فرق ہے اور جنت جہنم میں جو امتیاز ہے ان سب کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا جائے۔

عملاً یہی ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ تشبیہ کو اس کی منطقی انتہا تک لے جاتے ہیں کیونکہ صرف اپنے ''خیال'' میں زندہ رہنا اور عمل کرنا ایک کارِ دشوار ہے۔تاہم خیال پر ضرورت سے زیادہ انحصار کرنا انسانوں کی عام خاصیت ہے اور قرآن نے اس کے لیے ''اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرنا'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔اس پر ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں ''اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ'' (دیکھا اسے جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے) خلاصہ یہ کہ تشبیہ کے معاملے میں افراط ہو جائے تو انسان بہت سے خداؤں کا بندہ بن جاتا ہے۔عقیدت اور تعلق کے کئی محور ہو جاتے ہیں یا پھر اللہ کے بجائے اپنی انا کی پرستش ہونے لگتی ہے، ہر دو صورتوں میں یہ شرک ہے اور توحید سے محرومی۔تشبیہ پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کا نتیجہ بھی عملاً وہی ہوتا ہے جو صرف تنزیہ پر زور دیتے چلے جانے سے پیدا ہوتا ہے۔

ہم نے عقل اور کشف (اور خیال) پر خاصی تفصیل سے گفتگو کی ہے لیکن ہمیں وحی کو بھی فراموش نہیں کرنا ہے۔ہم نے عرض کیا تھا کہ انبیاء کا بنیادی منصب ہے انسانوں کو توحید کی یاد دہانی کروانا۔جب انبیاء انسان کو توحید کا سبق یاد دلاتے ہیں تو عقل کا رابطہ الحق سے استوار ہوتا ہے۔پھر وہ یہ جان لیتی ہے کہ حقیقت فقط اللہ ہی

کی ہے اور اللہ کے سوا ہر شے ایک جھوٹا خدا ہے، بے حقیقت ہے، نابود و نا موجود ہے۔ دوسری طرف خیال کو جب توحید کی یاد آوری کی جاتی ہے تو اس کا ربط بھی حتمی اور آخری حقیقت سے قائم ہوتا ہے۔ لیکن یہ اشیاء کا باہمی فرق نہیں دیکھتا صرف ان کی یکسانیت پر نظر رکھتا ہے۔ خیال اس امر کا اثبات کرتا ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی سے ہے۔ ہر شے حقیقی ہے، ہر شے کچھ نہ کچھ ہے لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک اس میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ Presence موجود ہے۔ پس کلمۂ شہادت کی بنیاد پر عقل تنزیہ کی طرف جاتی ہے اور خیال تشبیہ کی جانب دیکھتا ہے۔

توحید کا آموختہ اگر میسر نہ ہو، وحی کے ذریعے اگر انسان کو یاددہانی نہ کروائی جائے تو عقل اور خیال کی قوتیں اپنی اپنی الگ راہیں اپنا لیتی ہیں، کبھی ان کا عمل ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہوتا ہے کبھی ایک دوسرے کے خلاف پڑتا ہے۔ جاننے اور سمجھنے کے ان دو طریقوں، ان دو اسالیبِ فہم سے انسان کے لیے کوئی مفر نہیں کہ یہ انسان کی ہستی میں پیوست ہیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دونوں قوتیں اسی وقت اپنا صحیح کردار انجام دیتی ہیں، مناسب اور ہم آہنگ طور پر تبھی کام کرتی ہیں جب انہیں وحی کی رہنمائی میسر ہوتی ہے۔

سلسلۂ کلام کو مذکورہ تین مکاتبِ فکر کی جانب واپس لاتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ ان کی مشابہت اور اختلاف، ان کے مابین فرق اور ان کے مشترک عناصر سب اس بات پر منحصر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک توحید کے مختلف پہلوؤں پر زور دیتا ہے یا یوں کہیے کہ ان مکاتبِ فکر میں وحی، عقل اور خیال کو جو حیثیت دی جاتی ہے اسی سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔

# علمِ کلام کی عقلیت

نظری طور پر علمِ کلام میں وحی کو مرکزی اور نمایاں ترین جگہ دی جاتی ہے تاہم وہ لوگ جنہیں ہم ماہرینِ علمِ کلام یا متکلمین کہتے ہیں ان کے ہاں وحی کی تفسیر و تعبیر عقل کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ چونکہ عقل فرق و امتیاز قائم کرتی ہے لہٰذا علمِ کلام تنزیہ پر زور دیتا ہے۔ خدا ہر شے سے مختلف ہے لہٰذا خدا کے بارے میں جو کچھ کہا جائے گا اس کی شرح و تفسیر اس طرح ہونا چاہیے کہ وہ دوسری ہر شے کے بارے میں کہی ہوئی ہر بات سے الگ نظر آئے۔ خدا کو مجرد اصطلاحات میں بیان کیا جائے گا۔ وہ مظاہر کی اس دنیا سے ہمیشہ الگ اور جدا کر کے دیکھا جائے گا اور اس سے دور رکھا جائے گا۔ علمِ کلام کی زبان اور سوچ کا انداز عموماً مجرد طرح کا ہوتا ہے اور اس لیے اکثر لوگوں کو علمِ کلام خشک اور ریزا رکن محسوس ہوتا ہے۔

کسی ایسی چیز کی بات کرنا ہو جو بنیادی طور پر فہم سے بالاتر ہو تو اس کے لیے ایسی زبان کا استعمال لازم ہوتا ہے جو خود بھی سمجھنے میں آسان نہ ہو۔ اکثر لوگ کسی چیز کو بھی مجرد انداز میں نہیں دیکھتے، ٹھوس محسوس اور سامنے کے انداز میں دیکھتے ہیں یعنی تشبیہی انداز میں۔ علمِ کلام کے نقطۂ نظر سے تشبیہ ایک خطرناک چیز ہے کیونکہ تشبیہ یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یکسر مختلف نہیں ہے۔ ماہرینِ علمِ کلام کی نگاہ میں تشبیہ ایک عامیانہ چیز ہے، عوام میں پائی جانے والی ایک غلطی جو ان لوگوں سے سرزد ہوتی ہے جو فکری تربیت سے محروم ہیں، جن کو خدا شناسی کا ملکہ حاصل نہیں یا جن کی فکری قویٰ/عقلی صلاحیتیں کمزور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو حاضر و شاہد جاننا خلافِ عقل ہے، غلط ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسے انداز میں کیا گیا ہے جس سے اس کے قریب و حاضر ہونے کا پتہ چلتا ہے ان مقامات کے بارے میں علمِ کلام کا

اصرار یہ ہے کہ ان آیات کو اس طرح پڑھا اور سمجھا جائے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کا غیب میں ہونا اور اس کی دوری مستحکم ہو سکے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ علمِ کلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلامی عقائد کا دفاع کیا جائے۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی تعلیمات کے لیے علمِ کلام کی ایک حفاظتی حیثیت ہے لیکن چونکہ اس کا اندازِ فکر تنزیہی ہے لہٰذا اس کی نظر میں انسان کا کردار بنیادی طور پر بندگی، اطاعت اور عبودیت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک و آقا ہے، دور فاصلے پر رہنے والا بادشاہِ کائنات اور انسان اس کا بندہ، سزائے دردناک کے خوف سے لرزاں، اس کے احکامات بجالاتا ہے۔ علمِ کلام کا خدا ایسا نہیں ہے جس سے ہر کوئی محبت کر سکے۔ اس کا خوف سب کو ہے اور اس کی عزت و احترام تو سب کرتے ہیں مگر اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ بعض ماہرینِ علمِ کلام نے تو یہ بھی کہا ہے کہ خالق سے محبت محال ہے۔ اس کے لیے ان کو قرآن کی اس آیت کی تاویل گھڑنا پڑی جس میں کہا گیا تھا کہ "یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" (۵:۵۴) (وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے) اپنی فکری مہارت سے انہوں نے اس آیت کو تو راستے سے ہٹا دیا لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ اس کی جانب ابن عربی نے بہت خوبی سے اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کے عقلی رویے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ صرف تنزیہ میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، ایک ایسا تصورِ خدا جو اپنے بندوں سے بے انتہا دور ہے۔ اس لیے خوب ہوا کہ مذہبی تعلیمات صرف عقل پرست مفکرین کے ہاتھ میں نہیں رہیں۔ اگر کہیں ایسا ہو گیا ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی شخص اللہ سے محبت نہ کرتا۔

علمِ کلام کے بارے میں ایک بات اور آخر میں عرض کر دیں۔ علمِ کلام کا خاصہ

ہے بحث ونزاع۔ ''کلام'' کے لفظ کا مطلب ہے ''بات، گفتگو'' اور اسے اکثر ''مباحثے'' یا ''مناظرے'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔علمِ کلام کی کتب میں پائے جانے والے مباحث کاہدف زیادہ تر یہ رہا ہے کہ علمِ کلام کے دوسرے مکاتب فکر کی آراء، فلاسفہ اور دیگر فرقوں کے عقائد کا رد کیا جائے۔علمِ کلام کے مباحث کی ایک جھلک فراہم کرنے کے لیے ہم سطور ذیل میں اشعری مکتب فکر کے بانی ابوالحسن اشعری کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرر ہے ہیں۔۹۱ اس تحریر میں وہ قدریہ پر تنقید کرر ہے ہیں جو یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ انسان پوری آزادیٔ اختیار رکھتا ہے۔

وزعمت القدرية ان اللّٰه عزوجل يخلق الخير و الشيطان يخلق الشر وزعموا ان اللّٰه عزو جل يشاء مالا يكون ويكون مالا يشاء خلافا لما اجمع عليه المسلمون من ان ماشاء اللّٰه كان ومالم يشاء لم يكن وردا لقول اللّٰه عزو جل (وما تشاؤن الا ان يشاء اللّٰه) فاخبر انا لا نشاء شيا الاوقد شاء اللّٰه ان نشاء ه ولقوله تعالیٰ (ولوشاء اللّٰه مااقتتلوا) ولقوله تعالیٰ (ولو شئنا لآتينا كل نفس هداها) ولقوله تعالیٰ (فعال لمايريد) ولقوله تعالیٰ مخبرا عن شعيب انه قال (وما يكون لنا ان نعود فيها الا ان يشاء اللّٰه ربنا وسع ربنا كل شئ علما)۔

ولهذا سما هم رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم

مجوس هذه الامةلانهم دانوا بديانة المجوس وضا هوا
اقاويلهم و زعموا ان للخير والشر خالقين كمازعمت
المجوس ذلك وانه يكون من الشرور مالا يشاء الله
كما قالت المجوس وانهم يملكون الضر و النفع لا
نفسهم دون الله ردا لقول الله عزو جل لنبيه عليه
السلام (قل لا املك لنفسى نفعاو لا ضرا الا ماشاء
الله) واعراضا عن القرآن وعما اجمع عليه اهل
الاسلام وزعموا انهم ينفردون بالقدرة على اعمالهم
دون بالقدرة على اعمالهم دون ربهم فاثبتوا لا نفسهم
الغنى عن الله عزوجل ووصفوا انفسهم بالقدرة على
ما يصفون الله عزوجل بالقدرة عليه كما اثبت
المجوس للشيطان من القدرة على الشر مالم يثبتوه
الله عزوجل فكانوا مجوس هذه الامة اذ دانوا بد يانة
المجوس و تمسكوا با قاويلهم وما لوا الى اضا ليلهم
وقنطوا الناس من رحمة الله و أيسو هم من روحه و
حكموا على العصاة بالنار والخلود فيها خلافا لقول
اللهتعالىٰ (ويغفر مادون ذلك لمن يشاء)

قدریہ کا کہنا یہ ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ نے خلق کیا جبکہ شر کو شیطان نے پیدا کیا۔
انہوں نے یہ بھی فرض کر رکھا ہے کہ اللہ نے جو چاہا وہ ہو نہ سکا اور جو ہوا وہ

اس کی منشاء نہ تھی۔ یہ اہلِ اسلام کے اجماع کے خلاف ہے کیونکہ (رسول خداؐ نے فرمایا کہ) ''ماشاء اللّٰہ کان وما لم یشاء لم یکن'' (جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور جو اس کی منشاء نہ ہو وہ نہیں ہوتا) قدریہ کے اس زعمِ باطل کا ٹکراؤ اللہ کے کلام سے بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''وما تشاؤن الا یشاء اللّٰہ'' (تم نہیں چاہو گے جب تک اللہ نہ چاہے) (۷۶:۳۰)

رسول خداؐ نے قدریہ کو اس امت کے مجوسی کہا تھا۔ کیونکہ یہ دینِ مجوس کی پیروی کرتے ہیں اور انہی کے اقوال کی نقل کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں خیر و شر کے خالق الگ الگ ہیں۔ مجوس کا کہنا بھی یہی تھا۔ قدریہ یہ کہتے ہیں کہ شر میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اللہ کی منشاء نہیں ہیں۔ مجوسی بھی یہی کہتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اپنے نفع و ضرر پر اللہ کے علاوہ خود بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال قول خداوندی کے بالکل خلاف ہے کہ ''قل لا املك لنفسی ضراً ولا نفعاً الا ماشا ء اللّٰہ'' (کہو! میں اپنے نفع اور ضرور کا مالک نہیں ہوں اگر اللہ نہ چاہے) (۷:۱۸۸)...... انہیں یہ زعم بھی ہے کہ وہ اپنے رب سے ہٹ کر اپنے اعمال پر خود قدرت رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ اس دعویٰ کا اثبات کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہیں۔ وہ خود کو ایک ایسی چیز پر قادر جانتے ہیں جس پر قدرت کا وصف ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ میں بھی نہیں۔ مجوسیوں کے ہاں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے کہ شیطان کو شر پر وہ قدرت حاصل ہے جو خدا کو بھی میسر نہیں۔

## فلسفے کے تجریدی افکار

اسلامی تعلیمات کے بارے میں فلسفیانہ نقطۂ نظر کی لحاظ سے علمِ کلام سے

مشابہ ہے اور کئی اعتبار سے اس میں اور علمِ کلام میں گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ وحی کے مسئلے پر دونوں میں بنیادی اختلاف ہے۔ فلاسفہ قرآنی وحی کی ضرورت کو بلا چون وچرا ماننے پر تیار نہیں تھے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے یا نہیں، اس مسئلے پر بحث کی جانا چاہیے۔ فلسفیوں کی اکثریت مسلمان تھی اور شریعت کی پابندی کرتی تھی۔ ان میں سے اکثر نے اپنے عقلی اطمینان کی حد تک اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا تھا کہ رسالت حقائقِ ہستی میں سے ہے۔ تاہم رسالت کے جواز اور اس کے ضروری ہونے کا سوال اٹھانا ہی اپنی جگہ ایک ایسی جسارت تھی جس نے مسلمانوں کی اکثریت بالخصوص ماہرینِ علمِ کلام کو مشتعل کر دیا۔ مزید براں یہ کہ کچھ فلسفیوں کے ہاں نبوت و رسالت کی بحث کے نتیجے میں یہ کہا گیا کہ انبیاء اپنی کوشش سے اس دانشِ ربانی تک پہنچے تھے لہٰذا دوسرے لوگ بھی اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے ناقدین نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ فلسفیوں کی نظر میں نبیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ فلسفی خود کو نبوت کے درجے پر فائز سمجھتے تھے۔

ماہرینِ علمِ کلام نے اپنے تناظر کی بنیاد وحیِ قرآنی کے بارے میں اپنے فہم پر رکھی تھی۔ اس کے برعکس فلسفی حضرات اپنے آپ کو افلاطون، ارسطو اور فلاطیوس کی یونانی فکری روایت کے امین سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں اسلام اور دانشِ یونانی کے مابین کوئی ٹکراؤ نہیں تھا جبکہ ماہرینِ علمِ کلام کی نظر اپنے دفاعی مؤقف پر تھی اور وہ اس رائے کو عملاً ایک گمراہی اور انحراف سمجھتے تھے۔

فلسفیوں اور ماہرینِ علمِ کلام کے درمیان قدرِ مشترک یہ تھی کہ وہ عقل اور اس کی کارفرمائی پر زور دیتے تھے۔ نظریاتی طور پر تو اکثر ماہرینِ علمِ کلام وحی کو عقل پر فوقیت دیتے تھے لیکن عملاً ان میں سے بہت سے حضرات کا اصرار یہی تھا کہ قرآن کو

پیمانۂ عقل پر پورا اترنا چاہیے۔ دوسری طرف فلسفی عملی اور نظری ہر دو اعتبار سے عقل کو سب سے بلند حیثیت دیتے تھے۔

فلسفے اور علمِ کلام کے اندازِ نظر اور اسلوبِ فہم میں یوں تو کئی فرق ہیں لیکن ان اختلافات کا اندازہ ان ثانوی علوم یا علومِ آلیہ کا جائزہ لے کر بھی کیا جا سکتا ہے جن کو یہ دونوں مکاتب اہم سمجھتے ہیں۔ ماہرینِ علمِ کلام کے ہاں بالعموم تفسیرِ قرآن، حدیث، عربی صرف و نحو اور قواعد اور فقہ پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ دوسری طرف فلاسفہ بھی اگرچہ عام طور پر یہی علوم پڑھتے تھے لیکن ان کے ہاں خالص فلسفے سے زیادہ شغف پایا جاتا تھا جس کے تحت ماوراء الطبیعیات اور منطق کے علاوہ دیگر کئی علوم شامل کر لیے جاتے تھے مثلاً فلسفۂ طبعی یعنی طبیعیات، بصریات اور میکانکی علوم یا مثلاً ریاضی مع فلکیات اور علمِ موسیقی یا نفسیات (وہ علم جو روح، نفس اور بدن کے تعلق سے بحث کرتا ہے) اور طب۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ابن سینا کو اکثر سب سے بڑا مسلمان فلسفی کہا جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کا عظیم ترین طبیب بھی تھا۔ الفارابی مسلمانوں کا معلمِ ثانی، فنِ موسیقی پر ایک مفصل اور ضخیم کتاب کا مصنف بھی تھا۔ نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲/۱۲۷۴) سارے علومِ عقلیہ کا ماہر تھا، کلام اور عرفانِ نظری پر عبور رکھتا تھا۔ اس نے ابن سینا کے فلسفے کو ایک مرتبہ پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ ان علوم کے ساتھ اسے تاریخِ انسانی کے عظیم ترین ماہرینِ فلکیات اور ریاضی دانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

فلسفے میں غور و فکر، سوچ بچار کا جو پہلو ہے یعنی اس کا نظری حصہ، اس کی ہمیشہ بہت اہمیت رہی ہے لیکن آجکل کے بہت سے جدید فلسفیوں کے بالکل برعکس مسلمان فلسفی اپنی ماوراء الطبیعیات اور علمِ کائنات کو روزمرہ کی زندگی پر بھی لاگو کر

تے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ان میں ہر ایک اخلاقیات سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ ان میں اکثر فلسفی اس بات کے قائل تھے کہ اخلاقیات کا مقصد ہے تربیتِ نفس، نفس کی تہذیب کرنا تا کہ وہ الحق سے ہم آہنگ ہو سکے اور اللہ کی جانب لوٹ جانے کے لیے، آخرت کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن ان کے ہاں اخلاقیات کی بحث جن اصطلاحات میں کی گئی ہے وہ یونانی فلسفے سے ان کو ورثے میں ملی تھی۔ یہ اصطلاحات بنیادی طور پر قرآنی اسلوبِ بیان سے مختلف تھیں۔

فلسفیانہ طرزِ فکر میں سوچنے کا جو ایک تجریدی انداز عام تھا اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ذرا مندرجہ ذیل اقتباس پر نظر ڈالیے۔ ابن سینا کی اس عبارت میں خیر و شر کے مسئلے پر وجود کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ فلسفیوں کی فکر کا ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ''الوجود کے سوا کسی شے کو حقیقی وجود حاصل نہیں''۔ اس قول کا مطلب یہی ہے کہ ''الحق کے سوا اور کوئی بھی ذی حقیقت نہیں ہے''۔ اسی طرح خیرِ مطلق صرف اللہ ہی ہے۔ کیونکہ مذہبی زبان میں ''لا خیر الا اللہ''۔ (اللہ کے سوا خیر اور کچھ نہیں)۔ فلسفیوں کی زبان میں اسی ''وجود'' کو ''جو ''الحق'' اور ''الرحمٰن'' کا ہم معنیٰ اور مصداق ہے ''واجب الوجود'' کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وجودِ واجب وہ ہے جسے ہونا ہی ہے، جس کا نہ ہونا محال ہے۔ اقتباسِ ذیل میں ابن سینا یہ واضح کر رہے ہیں کہ شر تو محض خیر کے فقدان یا ''وجود'' کے غیاب کا نام ہے۔

ہر وہ شے جو اپنے آپ سے ہے، جو وجودِ واجب ہے، وہ خیرِ محض بھی ہے اور کمالِ محض بھی۔ خلاصہ یہ کہ ''خیر'' وہ ہے جو ہر شے کی طلب ہے اور جس کے وسیلے ہر شے کا ''وجود'' اپنی تکمیل تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ لیکن شر کی کوئی اصل نہیں کیونکہ شر یا تو کسی جوہر کے نہ ہونے، اس کی نابودگی کا نام ہوگا یا کسی کیفیت کی عدمِ صحت یا عدمِ

سالمیت کو شر کہا جائے گا۔ پس ''وجود'' ہی خیر ہے اور کمالِ وجود ہی خیرِ وجود ہے۔ وہ وجود جس کے ساتھ عدم و نابودگی لگی ہوئی نہ ہو، خواہ یہ عدم کسی جوہر کا عدم ہو یا اس جوہر سے متعلق کسی عَرَض کا عدم، اور وہ وجود جو ہمیشہ اور دائمی طور پر حقیقی و واقعی ہو وہی خیرِ محض اور خالص خیر ہے۔

ہر وہ شے جو اپنی اصلی ماہیت میں وجودِ ممکن ہو وہ خیرِ محض نہیں ہو گی کیونکہ اس کی ماہیت اپنے آپ میں ایسی کوئی چیز نہیں رکھتی جس سے اسے لازماً وجود حاصل ہو۔ بنابریں اس کی ماہیت، اس کی اصل میں عدم کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ ہر وہ شے جس میں کسی طرح بھی عدم کی گنجائش ہو شر سے اور نقص سے ہر لحاظ سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ پس صرف وجودِ واجب ہی خیرِ محض ہے۔ وہ وجود جو اپنے آپ سے ہے۔

''خیر'' اس کو بھی کہا جائے گا جو اشیاء کے کمال کے لیے سودمند اور مفید ہو۔ ہم یہ واضح کریں گے کہ یہ لازم ہے کے وجودِ واجب اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہر وجود اور ہر کمالِ وجود کی اصل ہے۔ اس لحاظ سے بھی وجودِ واجب ایک خیر ہے جس میں کوئی نقص اور کوئی شر راہ نہیں پا سکتا''۹۲

یہ درست ہے کہ فلسفیوں کا احساس یہی تھا کہ عقل ہی فہم کی کلید ہے لیکن ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو یہ جانتے تھے کہ خیال کے وسیلے سے ذہن کو چند ایسے تناظر مل جاتے ہیں جو عقل کی رسائی سے باہر ہوتے ہیں۔ مسلمان فلسفی چونکہ ماہرِ نفسیات بھی ہوتے تھے لہٰذا نفس کی ایک قوت کے طور پر خیال کا جو کردار ہو سکتا ہے اس سے تو انہیں ہمیشہ دلچسپی رہی لیکن اپنے نظریات کا زندگی پر اطلاق کرنے والے مفکرین کی حیثیت سے وہ خیال کو بھی فطرت الٰہی اور اللہ کے بارے میں بصیرت حاصل کرنے کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تمام فلسفیوں کے

بارے میں تو یہ کہنا درست نہیں ہو گا لیکن ان کی ایک بڑی تعداد، جن میں ابن سینا اور سہروردی بھی شامل تھے، یہ بات جان گئی تھی کہ فہمِ حقیقت اور اظہارِ حقیقت کا ایک مختلف انداز وہ بھی ہے جو خیال کے وسیلے سے میسر آتا ہے۔ فلسفیوں کی اکثر تحریریں خشک، مجرد اور نمائشِ علم سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ماہرینِ علمِ کلام کی کتب بھی ایسی ہیں تاہم ابن سینا اور سہروری دونوں نے ایسی تحریریں بھی یادگار چھوڑی ہیں جن کو "اشراقی رسائل" (visionary treatises) کا نام دیا گیا ہے۔ ان کتب میں عقل کا کردار ثانوی ہے اور قاری کے فہم و ادراک کا درواکرنے کے لیے تمثیلی انداز استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تحریریں نثر کم اور شاعری زیادہ لگتی ہیں۔ ان تحریروں کی کشش ان کے منطقی استدلال میں نہیں بلکہ ان کے حسنِ بیان اور ایک تحیر کی فضا قائم کرنے کے عمل میں چھپی ہوئی ہے۔۹۳

ماہیتِ اشیاء کی وضاحت کرتے ہوئے سہروردی کو اس بات کا خاص طور پر دھیان رہتا ہے کہ عقل اور خیال میں توازن بگڑنے نہ پائے۔ فلسفیانہ تلاش اور تحقیق میں اس نے وجود کی جگہ یہ جو "نور" کو ہدفِ توجہ بنایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ہاں اس توازن کو برقرار قائم رکھنے کی کتنی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اگرچہ وجود کا لفظ استعمال نہیں ہوا تاہم سہروردی کے دور تک آتے آتے یہ لفظ ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر پوری طرح متعارف ہو چکا تھا۔ فلسفیوں نے یہ لفظ جس طرح برتا ہے اس سے تجریدی اندازِ فکر کو فروغ ملتا ہے۔ اس میں تنزیہ کا اظہار زیادہ تھا اور تشبیہ کا کم تر۔ لیکن سہروردی اس بات سے آگاہ تھے کہ کشفِ حقائق سے حاصل ہونے والی دانشِ حضوری کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ اس کائنات میں حضورِ حق کا ادراک اور اس کے حضورِ حق میں رہنے کا براہِ راست تجربہ نہ ہو تو انسان تنزیہ میں

پھنس کر رہ جاتا ہے۔

نور کی اصطلاح قرآن میں آنے والے اسمائے خداوندی میں سے ایک ہے۔اس بات کا ہم ذکر پہلے بھی کر چکے ہیں۔فلسفیوں کے ہاں وجود کا لفظ جس طرح استعمال ہوا ہے اس کے برعکس ''نور'' حقیقتِ مطلقہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ شے جو عالم بھی ہے اور معلوم بھی ۔نور یا روشنی پردے اٹھا دیتی ہے، کھول دیتی ہے، منکشف کر دیتی ہے، نور سے آگہی ملتی ہے۔منور ہونے کا مطلب ہے آگاہ ہونا۔نور الحق ہے، نہ صرف بطور مشہود منظور بلکہ الحق بطور ناظر و شاہد بھی۔ ہمارے لیے نور کا تجربہ آگہی کا تجربہ ہے، نور آگہی ہے۔صوفیا نے عام طور پر کشف کو نور ہی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ جب نورِ ربانی ضوفشاں ہوتا ہے تو جہالت کی تاریکی چھٹ جاتی ہے۔

سہروردی نے ابن سینا کے اسلوب میں کئی فلسفیانہ کتب تصنیف کی ہیں۔ان میں عقل کی اہمیت پر اکثر زور دیا گیا ہے۔ ان کے اشراقی و تمثیلی رسائل visionary recitals پر نظر ڈالیے تو ان سے سراغ ملتا ہے کہ سہروردی میں نور کے وسیلے سے دیکھنے کی کتنی صلاحیت تھی، وہ خود کس حد تک نور میں ڈھل چکے تھے۔ عقل سے انسان اور خدا کے درمیان فاصلہ قائم ہوتا ہے لیکن ایک مرتبہ تلاشِ حق کرنے والے کو ذوقِ نور حاصل ہو جائے، نور اس کا تجربہ بن جائے تو بندے اور رب کے درمیان فاصلے مٹ جاتے ہیں۔تاہم ''نور'' اور شعاعِ نور (یعنی ہستی انسانی) کی یہ عینیت عقلی طور پر اس وقت تک بیان نہیں ہو سکتی جب تک فاصلے کی اور مجرد اندازِ فکر کی رکاوٹ درمیان میں نہ لائی جائے۔اس کے برعکس تمثیلی اور تشبیہی تحریروں کا خطاب براہ راست خیال و تخیل سے ہوتا ہے۔ان تماثیل کے وسیلے سے

نفس کو اپنے جوہرِ تمثیلی کی شناخت حاصل ہوتی ہے اور یہ شناخت اس کے لیے یہ امکان پیدا کرتی ہے کہ وہ یہ تجربہ حاصل کرے کہ وہ الحق کے پرتوِ خیال سے الگ کچھ اور نہیں ہے۔

سہروردی کی اشراقی تصانیف کے نمونے کے طور پر ''لغتِ موراں'' (چیونٹی نامہ) سے ایک واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا عنوان قرآن مجید کی اس آیت سے لیا گیا ہے جس میں سیدنا سلیمانؑ کے چیونٹیوں کی گفتگو سننے کے واقعے کا ذکر آیا ہے۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِىٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِىٓ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِىْ بِرَحْمَتِكَ فِىْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ

(۲۷:۱۹)

پس وہ اس کی بات سے خوش ہو کر مسکرایا اور دعا کی: اے میرے رب! مجھے سنبھالے رکھ کہ میں اس فضل کا شکر گزار ہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور تو اپنے فضل سے مجھے اپنے صالح بندوں کے زمرے میں داخل کر!

اس کہانی میں یوں لگتا ہے کہ سہروردی کے ہاں حضرت سلیمانؑ ذاتِ خداوندی کا استعارہ و علامت ہیں اور بلبل انسان کی علامت ہے۔ بلبل کو فارسی میں ''بلبلِ ہزار داستان'' بھی کہا جاتا ہے۔ بلبل کو انسان کی علامت اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کو تمام اسماء کا علم دیا گیا اور پھر وہ غفلت میں پڑ گیا۔

همهٔ مرغان در حضرت سلیمان علیه السّلام حاضر

بودند الاّ عندلیب، سلیمان مرغی را برسالت نام زد
کرد که عندلیب را بگوید که ضروریست رسیدن ما
و شما بیکدیگر۔ چون پیغام سلیمان علیه السلام
بعندلیب رسید هرگز از آشیان بدر نیامده بود، با
یاران خود مراجعت کرد که فرمان سلیمان علیه
السلام برین نسق است واو دروغ نگوید۔ باجتماع
ایعاد کرده است۔ اگر او بیرون باشد وما درون،
ملاقات میسر نشود واو در آشیانهٔ مانگنجد وهیچ
طریق دیگر نیست۔ یکی سالخورده در میان ایشان
بود، آواز داد که اگر وعدهٔ 'یوم یلقونه' راست باشد
وقضیهٔ 'کل لدینا محضرون'، 'وانّ الینا ایابهم' و 'فی
مقعد صدق عند ملیكٍ مقتدرٍ، درست آید، طریق
آنست که چون ملك سلیمان در آشیانهٔ ما نگنجد ما
نیز بترك آشیانه بگوئیم و بنزدیك او شویم، و اگر نه
ملاقات میسّر نگردد۔

تمام پرندے حضرت سلیمانؑ کے سامنے حاضر تھے۔بس ایک بلبل غیر حاضر تھی۔
حضرت سلیمانؑ نے ایک پرندے کو نامہ بر کے طور پر چن لیا۔اسے بلبل کو یہ پیغام
دینا تھا کہ ''تمہارا ہم سے ملنا ضروری ہے''حضرت سلیمانؑ کا پیغام بلبل کو ملا۔بلبل
کبھی اپنے گھونسلے سے نکلا ہی نہ تھا۔اس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کرتے

ہوئے کہا، ''حضرت سلیمانؑ کا حکم یوں ملا ہے اور ان کا کہنا غلط نہیں ہوتا''۔ اگر وہ باہر ہوئے اور ہم اندر تو ان سے ملنا ناممکن ہو جائے گا لیکن ہمارے گھونسلے میں تو ان کی سمائی ہو نہیں سکتی پھر یہ ملاقات کیونکر ہو؟

ان میں ایک عمر رسیدہ بھی تھا۔ اس نے پکار کر کہا کہ اگر ''یَوْمِ یَلْقَوْنَہٗ'' (جس دن وہ اس سے ملیں گے (۹:۷۷) کا وعدہ سچا ہے اور اگر ''وَاِنْ کُلٌّ لَّمَّا جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ'' (اور بے شک وہ سب ہمارے ہی حضور میں پیش کیے جائیں گے) (۳۶:۳۲) اور ''اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ'' (بے شک ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے) (۸۸:۲۵) اور ''فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ'' (ایک پائیدار مقام عزت میں۔ ایک مقتدر بادشاہ کے پاس) (۵۴:۵۵) کو ہو کر رہنا ہے تو پھر ایک ہی راستہ ہے: چونکہ شاہ سلیمانؑ ہمارے گھونسلے میں نہیں سما سکتے لہٰذا ہمیں اپنے گھونسلے سے نکل کر ان کے پاس جانا ہوگا۔ ایسا نہ کیا تو ان سے ملاقات ممکن نہ ہو سکے گی۔۹۴

خلاصہ یہ ہوا کہ بیانِ حقیقت کا جو ایک خاص فلسفیانہ انداز ہے اس کا محور تنزیہ ہے اور فکرِ مجرد۔ تاہم کئی فلسفی عقل کی کوتاہی اور نارسائی سے بخوبی آگاہ تھے اور الحق کے قریب ہونے، اللہ کے ''القریب'' ہونے کے اظہار کے لیے، تشبیہ کے بیان کے لیے تماثیل یا رموز و علائم کا استعمال کرتے تھے۔

## تصوف: مشاہدۂ حق

ہم نے عرض کیا تھا کہ عرفانِ نظری کا زور کشفِ حقائق پر رہتا ہے یا یوں کہیے کہ نورِ خداوندی کی دید پر، اس دنیا اور نفسِ انسانی میں اللہ تعالیٰ کے سچ مچ موجود ہونے کا مشاہدہ۔ لیکن تصوف کی جڑ بنیاد بھی وحیِ اسلام پر استوار ہوئی ہے۔ تصوف

کے نظری مباحث پر کلام کرنے والے حضرات نے ماہرینِ علمِ کلام سے کہیں بڑھ کر اپنے تجربے کو قرآن اور سنت سے وابستہ رکھا تھا۔ رسولِ خداؐ نے اپنا علم اپنی عقلی، استدلالی اور خیال کی قوتوں کے سہارے حاصل نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اللہ نے ان کو ایک موزوں ظرفِ قبولیت کے طور پر چن لیا تھا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی تھی۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا (۴:۱۱۳)

اور تم پر کتاب وحکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔ اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کے بعد اب کوئی صحیفۂ خداوندی نہیں آئے گا۔ ان امور پر صوفیاء کے ہاں کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا۔ تاہم انہوں نے یہ کبھی تسلیم نہیں کیا کہ آنحضرتؐ کے اتباع کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسان آپؐ کی سنت کی پیروی کرے اور قرآن وحدیث یاد کر لے۔ اس کے برعکس مسلمان کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ رسولِ خدا کے اتباع میں ایسا سچا اور مخلص ہو، آپؐ کی پیروی کی ایسی لگن رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے اکتساب عقلی کے وسیلے کے بغیر ہی براہِ راست علم عطا کر دے۔ صوفیاء کے ہاں اس کی دلیل کے طور پر قرآن کی درجِ ذیل آیت کا اکثر حوالہ ملتا ہے:

اتقوا اللّٰہ یعلمکم اللّٰہ (۲:۲۸۲)

اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں علم دیتا رہے گا۔

کشفِ حقائق کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان میں تقویٰ ہو اور تقویٰ (جیسا کہ ہم

حصہ سوم میں دیکھیں گے ) ایمان وعمل کو صدق و اخلاص کے ذریعے درجہء کمال تک لے جانے کا نام ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انسان کی فکری اور عقلی قوت کو فلسفیوں اور اہلِ کلام کے سے منظم انداز میں بروئے کار لایا جائے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر صوفیاء کی رائے کے مطابق اس طرح کی عقلی کاوشیں فہم میں معاون ہونے کے بجائے ادراکِ حقیقت کے لیے سدِ راہ بن جاتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ صوفیاء نے عقل کے ایک جائز اسلوبِ فہم ہونے سے انکار کیا ہے۔ قرآن بار بار انسانوں کو عقل استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ صوفیاء کی رائے یہ تھی کہ عقل ایک انسانی ملکہ یا قوت ہے اور اس کو کمال تک پہنچانے کے لیے اس کی تربیت اور نشو ونما درکار ہے۔ انہیں البتہ اس بات کے تسلیم کرنے میں دریغ تھا کہ علمِ کلام یا فلسفہ انسان کی سوچ بچار کی قوت یا عقل و استدلال کی تربیت کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں پھر ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ رسولِ خدا ؐ کی سنت کا اتباع اور تقویٰ پر عمل کرنا عقلی قوت کے کمال تک لے جانے والا راستہ ہے۔

تصوف کی تحریریں کسی طرح خلافِ عقل نہیں کہی جا سکتیں خواہ اس کے لیے فلسفہ و کلام کا پیمانہ ہی کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ بہت سے صوفیاء ایسے بھی رہے ہیں جنہوں نے فلسفے یا کلام یا دونوں ہی کی باقاعدہ تحصیل کی تھی اور اپنی تحریروں میں کلامی اور فلسفیانہ دلائل استعمال کیا کرتے تھے۔ اس لیے اکثر یہ بتانا دشوار ہو جاتا ہے کہ کسی ایک خاص مصنف کو کس مکتبِ فکر کے تحت شمار کیا جائے، صوفی کہا جائے یا متکلم قرار دیا جائے یا فلسفی سمجھا جائے؟ یا پھر تینوں مکاتبِ فکر کا نمائندہ مانا جائے۔

الغزالی اس دشواری کی ایک نمایاں مثال ہیں کہ ان کو کس طبقے میں شمار کیا

جائے۔ اپنی بہت سی تحریروں میں وہ اشعری مکتبِ فکر کے علمِ کلام کے سرخیل نظر آتے ہیں جبکہ بعض کتابوں میں انہوں نے علمِ کلام پر سخت تنقید کی ہے اور کچھ تصانیف میں ان کا اندازِ نظر خالص صوفیانہ رہا ہے۔ غزالی فلسفے سے بھی بخوبی واقف تھے اور مغرب میں ان کا تعارف ایک فلسفی ہی کی حیثیت سے زیادہ عام رہا ہے۔ ساتویں/تیرھویں صدی کے فلسفی افضل الدین کاشانی نے منطق پر کتابیں لکھیں اور اشیاء کے بارے میں ان کا ادراکِ عقلی غیر معمولی حد تک تیز تھا لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ سہولت بھی تھی کہ وہ کشف کے مرتبہ بلند سے ان معاملات پر نگاہ کر سکتے تھے۔ ایسے اور بھی کئی لوگ ہو گزرے ہیں جن کو کسی ایک طبقے تک محدود کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا کیونکہ یہ تینوں مکاتب ہی حصولِ علم کے تین مختلف مگر ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے انداز اور اسالیب ہیں اور ان میں سے کوئی بھی دوسروں کو نہ تو رد کرتا ہے اور نہ ان کو دائرہ اعتبار سے خارج کرتا ہے۔

تصوف نے اگرچہ تینوں طرح کے علم کا استعمال کیا ہے لیکن کشفِ حقائق پر اس کا زور دینا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ صوفیاء تنزیہ کے مقابلے میں تشبیہ کے علمبردار تھے۔ کشف سے حاصل ہونے والے ''خیال'' پر مبنی علم کی وجہ سے وہ یہ دیکھنے کے قابل ہوتے تھے کہ یہ دنیا اور نفسِ انسانی سب حضورِ خداوندی میں ہیں۔ اشیائے کائنات اور خالقِ کائنات کے مابین قربت، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یہ براہ راست اور بلاواسطہ تجربہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور و غیاب میں کوئی تضاد کی بات نہیں تھی۔ ''خیال'' کی بنیاد پر، کشفی طور پر اگر وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انسان اور کائنات کے قریب ہے تو عقلی طور پر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ بعید و ماوراء ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کوئی شے نہیں ہے، ہر شے

سے الگ اور اشیاء سے منزہ و بلند و برتر ہے۔

تصوف کا علمِ کلام سے اس نکتے پر کوئی جھگڑا نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ دور ہیں۔ تاہم چونکہ علمِ کلام والے حضرات تنزیہ پر ایک سرے سے زور دیتے چلے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے صفاتِ قہر و جلال ہی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہتے تھے لہٰذا صوفیاء نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھانا چاہیے۔ ان کی تحریروں میں تشبیہ پر اور اللہ کی صفاتِ رحمت و جمال پر جو زور دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔

علمِ کلام پر لکھی گئی تحریریں اگر مجرد انداز کی ہوتی ہیں تو عجب کیا ہے کہ عقلی اور استدلالی طرزِ فکر کو یہی طریقہ راس آتا ہے۔ اس کے برعکس صوفیانہ تحریروں کا جھکاؤ ٹھوس پن اور واقعیت کی طرف ہے کہ کشف کا فراہم کردہ ادراکِ خیال و تمثیل اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسی سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب میں فلسفہ و کلام کی نسبت تصوف کہیں زیادہ مقبول کیوں رہا ہے اور اس کی اشاعت اتنی زیادہ کیوں ہوئی ہے۔ عرفانِ نظری پر لکھنے والے بہت سے صوفی مصنفین نے تمثیل، علامت اور قصہ و داستان کے جملہ امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی اور اس طرح وہ ہر شخص سے اس کے ذوق کے مطابق کلام کرنے میں کامیاب رہے۔ قصہ کہانی تو ہر ایک کی سمجھ میں آجاتی ہے خواہ اس کہانی کے پردے میں ماوراء الطبیعیات اور الٰہیات کا کوئی لطیف نکتہ ہی کیوں نہ بیان ہو رہا ہو لیکن یہی بات اگر اہلِ کلام اور فلسفیوں کے سے مجرد طرزِ استدلال اور مخصوص عقلی دلائل کے رنگ میں کہی جائے تو معدودے چند لوگ ہی اسے سمجھنے کے قابل رہ جائیں گے۔ علاوہ ازیں صوفی مصنفین نے شاعری کا بھی خوب خوب استعمال کیا ہے۔ عربی، فارسی، ترکی اور دیگر

اسلامی زبانوں کے عظیم ترین شعراء میں سے بہت سے حضرات صوفی تھے۔ ان کا شعر جلوہ گاہِ عالم میں تجلیاتِ خداوندی کا بیان تھا۔ ان کا شعر اشیائے کائنات میں خالقِ کائنات کا پرتو دیکھتا اور دکھاتا تھا۔ اس کے برعکس کوئی بڑا فقیہ، متکلم یا فلسفی کبھی درجہ اوّل کا شاعر نہیں بن پایا۔ یہی وہ نکتہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے تصورِ حقیقت، اپنے مشاہدۂ کائنات کو بیان کرنے میں اہلِ تصوف اتنے کامیاب کیونکر رہے اور یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے اگر یہ پہلو بھی سامنے رہے کہ شاعری ادب کی وہ صنف ہے جسے ساری اسلامی دنیا میں ہمیشہ سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل رہا ہے۔

اس امر سے کوئی انکار نہیں کہ بعض صوفی مصنفین نے بھی ایسی مشکل اور ادق کتابیں لکھیں ہیں جو عوام کی اکثریت کے لیے نا قابلِ فہم رہی ہیں۔ ان کتب میں بھی قوتِ ''خیال'' کا استعمال کیا گیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ فلسفیوں اور ماہرینِ علمِ کلام کے طرزِ تصنیف اور تکنیک کو بھی بروئے کار لایا گیا تھا کیونکہ فلسفی اور اہلِ کلام بھی ان کتب کے مخاطَب تھے۔ بہرکیف تصوف نے اپنی تعلیمات کے اظہار و بیان کے لیے ہمیشہ خیال، تخیل اور تمثیل کو برتا ہے جبکہ کلامی تحریروں کا انحصار تقریباً سارے کا سارا فکرِ مجرد پر رہا ہے۔ کتاب کے اگلے حصے میں ہم صوفیانہ تحریروں کی مثالیں پیش کریں گے۔

-----------اختتام حصہ دوم-------------